اُس پر چھاویں۔
تب گل گامش نے شمس کو پکارا
اور اُس کے آنسو بہہ رہے تھے :
"شمسِ تاباں! میں نے وہی راستہ اختیار کیا
جس کا تُو نے حکم دیا تھا،
مگر تُو نے آڑے وقت میں اگر میری مدد نہ کی
تو میں کیسے بچوں گا ؟"
شمسِ تاباں نے اُس کی التجا سُن لی
اور اُس نے بادِ عظیم کو طلب کیا،
بادِ شمال کو، بادِ طوفاں کو، بادِ زمہریر کو، بادِ تُند کو اور بادِ سموم کو۔
وہ اژدہوں کی مانند آئیں
جھلس دینے والی آگ کی مانند،
مارِ سیاہ کی مانند جو دلوں کو منجمد کر دیتا ہے،
تباہ کُن سیلاب اور زبانِ برق کی مانند۔
آٹھوں ہوائیں حمبابا کے خلاف اُٹھیں۔
اُنھوں نے اُس کی آنکھوں پر تھپیڑے مارے،
اور وہ اُن کی گرفت میں آ گیا۔
بس وہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔
اور حمبابا نے مبارزت ترک کر دی۔
وہ چلایا :
"یہ کون لوگ ہیں جو صورت سے انسان نظر آتے ہیں
مگر دیوتاؤں سے لڑتے ہیں ؟"
گل گامش نے نعرہ لگایا :
"ماں ننسن اور مقدس باپ لوگل باندا کی جان کی قسم،
ملکِ بقا میں، اس سرزمین میں،
میں نے تیرے مسکن کا سراغ لگا لیا ہے،
میرا سے کمزور بازو اور مختصر ہتھیار

اس ملک میں تیرے خلاف لایا ہوں
اور اب میں تیرے دیوتا کے مکان میں داخل ہوں گا"
پس اس نے دیوتا کے سات درخت کاٹے
اور پہاڑ کے قدموں میں ڈال دیئے۔
اس کے رفیق نے اُن کے بڑے چھانٹے
اور شاخوں کی ڈھیریاں بنائیں
اور وہ حمبابا کے گھر پہنچ گیا۔
اس کے وارد ہوتے ہی مارِ ہیبت اپنے سوراخ سے نکل بھاگا۔
حمبابا نے اپنا سانس کھینچا،
اور یوں آواز آئی گویا بوسے کا طمانچہ لگا ہے
اور اس کے دانت رک رہے تھے۔
وہ گل گامش کے رُو برو جھک گیا اور چیخا:
"شمش! میری سن! میں نے نہ ماں کو جانا ہے
اور نہ باپ کو جس نے میری پرورش کی ہوتی،
تجھ نے مجھے اس دیس میں پیدا کیا،
تجھی نے میری پرورش کی
اور اِن لِیل نے مجھے اس جنگل کا پاسبان مقرر کیا"
اس نے گل گامش کو حیاتِ آسمانی کا واسطہ دیا،
حیاتِ ارضی کا واسطہ دیا،
حیاتِ سفلی کا واسطہ دیا:
"میری جان بخشی کر دے،
میں تیرا غلام ہوں گا اور تو میرا آقا۔
جنگل کے سب درخت،
جن کی پرورش میں نے پہاڑ پر کی ہے،
تیری ملکیت ہوں گے۔
میں انہیں کاٹ کر تیرے لیے ایک محل تعمیر کروں گا"
اس نے گل گامش کا ہاتھ پکڑا

اور اپنے گھر میں سے گیا۔
یہاں تک کہ گل گامش کے دل میں رحم آ گیا
اور اُس نے اپنے رفیق سے کہا :
" اِن کدو ! کیا طائرِ دام کو اپنے آشیانے میں
اور مردِ اسیر کو اپنی ماں کی آغوش میں
نہیں جانا چاہیے ؟"

اِن کدو نے جواب دیا :
" اگر قوتِ فیصلہ نہ ہو
تو قوی ترین انسان بھی قسمت سے مار کھاتا ہے ۔
نمتر، جو انسانوں میں امتیاز نہیں کرتا
اُسے نگل جائے گا ۔
اگر طائرِ دام اپنے آشیانے میں
اور مردِ اسیر اپنی ماں کی آغوش میں واپس جائے
تو پھر، میرے دوست ! تو اُس شہر میں کبھی واپس نہ جا سکے گا
جہاں وہ ماں تیری منتظر ہے
جس نے تجھے جنا تھا "

حمبابا نے کہا :
" اِن کدو، تو شر انگیز باتیں کرتا ہے ۔
بھاڑے کا ٹٹو ! اپنی روٹی کے لیے دوسروں کا محتاج !
تو نے حریف کے خوف اور رشک سے
یہ کلماتِ بد زبان سے نکالے ہیں "

اِن کدو نے کہا :
" گل گامش ! اِس کی نہ سن
حمبابا کو مرنا ہی ہوگا "

لیکن گل گامش بولا :
" اگر ہم نے حمبابا کو ضرر پہنچایا
تو نور کی تجلی اور رنگا رنگی ماند پڑ جائے گی

اور شاعروں کی زبان بند ہو جائے گی
اور روشنی کا سارا حسن زائل ہو جائے گا "
اِن کیدو نے گل گامش کو جواب دیا :
" میرے دوست ، ایسا نہیں ہوگا ۔
طائر کو اگر پہلے ہی اسیر کر لیا جائے گا
تو اُس کے بچے بھاگ کر کہاں جائیں گے ؟
جب یہ بچے گھبرا کر گھاس میں چھپنے لگیں گے
تو ہم حسن و تجلّی کو تلاش کر لیں گے "
گل گامش نے اپنے ساتھی کا مشورہ قبول کر لیا ۔
اُس نے تیشہ سنبھالا اور شمشیر کو بے نیام کیا
اور حمبابا کی گردن پر ضرب لگائی
اور اُس کے رفیق اِن کیدو نے دوسری ضرب لگائی ،
تیسری ضرب پر حمبابا گر پڑا
اور ہلاک ہو گیا ۔
تب ہنگامہ برپا ہوا
کیونکہ انھوں نے جنگل کے پاسباں کو قتل کیا تھا ۔
وہ جس کی آواز سے ہرمان اور لبنان لرزتے تھے ۔
پہاڑیاں اپنی جگہ سے ہٹ گئیں
اور پہاڑ حرکت میں آ گئے
کیونکہ دیودار کا پاسباں بے جان پڑا تھا ۔
حمبابا کو اِن کیدو نے ہلاک کیا تھا
اور دیودار کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے ۔
یہ کام اِن کیدو کا تھا ۔
اُس نے عظیم دیوتاؤں کے پوشیدہ مسکن کو عریاں کیا تھا ۔
گل گامش نے جنگل کے درخت کاٹے
اور اِن کیدو نے دریائے فرات کے ساحل تک کے علاقے کو جڑوں سے صاف کیا ۔
اُنھوں نے حمبابا کو دیوتاؤں کے رُوبرو پیش کیا ،

ان لیل اور ننلیل کے رُوبرو۔
اور انو ناکی نے اُسے اپنے قبضے میں لے لیا۔

تیسرا باب

عشتار کا اظہارِ عشق

گل گامش نے اپنے میلے بال دھوئے
اور ہتھیاروں کو صاف کیا،
اپنی زلفیں شانے پر بکھیریں،
اپنے گندے کپڑوں کو پھینک دیا اور نئی پوشاک پہنی،
پھر شاہی لبادہ اوڑھا اور پٹکا باندھا۔
اور جب گل گامش نے اپنا تاج پہنا
تو حسین عشتار نے بھی اُس کے حسن کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا:
"گل گامش! آ اور میرا دولہا بن جا
اور اپنا تخم مجھے دے۔
مجھے اپنی دلہن بنا اور تو میرا شوہر ہو،
میں تیرے لیے لاجورد اور سونے کی رتھ سجاؤں گی
جس کے پہیے طلائی ہوں گے اور سینگیں تانبے کی۔
تیری رتھ میں مضبوط خچروں کے بجائے طوفانی عفریت جتے ہوں گے۔
جب تو دیودار کی خوشبو سے مہکتا ہوا میرے محل میں داخل ہوگا
تو میری چوکھٹ اور میرا تخت تیرے قدم چومیں گے،
بادشاہ، شہزادے اور رؤسا تجھے تعظیم دیں گے،
وہ کوہساروں اور میدانوں سے آکر تجھے خراج پیش کریں گے،
تیری بکریاں تین تین بچے جنیں گی اور تیری بھیڑیں جڑواں بچے،
تیرے گدھے باربرداری میں خچروں پر سبقت لے جائیں گے،
تیرے بیلوں کا کہیں جواب نہ ہوگا،
اور تیری رتھ کے گھوڑے تیز رفتاری کے لیے دُور دُور مشہور ہوں گے۔

گل گامش نے بولنے کے لیے منہ کھولا :

" اگر میں تجھ سے شادی کروں تو بدلے میں کیا تحفہ دوں ؟
تیرے جسم کے لیے کون کون سے روغن اور کون کون سی پوشاکیں ؟
تیری غذا کے لیے کیسی روٹی ؟
میں ایسی غذا کہاں سے لاؤں جو دیوتاؤں کے شایانِ شان ہو
اور ایسی شراب کہاں سے مہیا کروں جسے شہزادی فلک پی سکے ؟
اس کے علاوہ، اگر میں تجھے شادی میں قبول کر لوں
تو میرا انجام کیا ہوگا ؟
تو وہ انگیٹھی ہے جو سردیوں میں ٹھنڈی رہتی ہے ،
وہ پائیں دروازہ ہے
جو ہوا کے جھونکوں اور گرد کے طوفانوں کو
اندر آنے سے نہیں روکتا ۔
ایک محل جو اپنی پاسبان فوج پر آفت ڈھاتا ہے
تارکول سے بھرا ہوا مٹکا جسے اٹھاؤ
تو کپڑے اور جسم سب کالے ہو جاتے ہیں ۔
ٹپکتی ہوئی ایک مشک جو مشک بردار کو بھگو دیتی ہے ۔
پتھر، جو دیوار پر سے لڑھک آتا ہے ۔
جوتا جو پہننے والے کے پاؤں لہولہان کر دیتا ہے ۔
تو نے اپنے کس عاشق سے وفا کی ؟
تیرے کس گڈریے نے تجھے ہمیشہ آسودہ رکھا ؟
سن ! میں تجھے تیرے عاشقوں کا انجام سناتا ہوں :
تموز کا حال سن ،

جو تیرے عہدِ جوانی میں تیرا عاشق تھا
تو اسے سالہا سال رلاتی، تڑپاتی رہی ۔
تو نے طائرِ ہفت رنگ سے عشق کیا
اور پھر اس کے بازو توڑ دیے
اور اب وہ باغ میں بیٹھا " میرے بازو، میرے بازو " پکارتا رہتا ہے ۔

تب تو نے ایک قوی ہیکل شیر سے عشق کیا
پھر اُسی کے لیے سات اور سات گڑھے کھودے۔
تب تو نے ایک اسپ نر سے عشق کیا
جو جنگ میں شہرت پا چکا تھا
مگر انجام کار اُس کی تقدیر میں مہمیز، چابک اور چمڑے کا ہنٹر لکھا گیا
اور حکم ہوا کہ وہ دس کوس تک سرپٹ دوڑتا رہے
اور گندا پانی پیئے
اور اُس کی ماں سی لی لی کی قسمت میں گریہ وزاری آئی۔
تب تو نے گلہ بان سے عشق کیا
جس نے تیرے لیے اُوپلوں کے ڈھیر لگائے
اور اپنے نوخیز جانوروں کا گوشت تجھے پیش کرتا رہا،
پھر بھی تو اُسے دکھ دینے سے باز نہ آئی۔
تو نے اُسے بھیڑیا بنا دیا
اور اب اُسی کے گلّے کے لڑکے اُس کا تعاقب کرتے رہتے ہیں
اور اُس کے اپنے کتّے اُس کی رانوں میں کاٹتے ہیں۔
اور کیا تو نے اِشو لّا نو سے عشق نہیں کیا،
اپنے باپ کے باغبان سے ؟
وہ تیرے لیے کھجوروں کی اَن گنت ٹوکریاں لاتا
اور تیرے دسترخوان کو روز پھلوں سے سجاتا
تو نے اُسے تاکا اور اُس کے پاس گئی۔
" اے میرے پیارے اشو لّا نو!
میں تیری قوتِ مردمی کا مزہ چکھنا چاہتی ہوں
اپنا ہاتھ آگے بڑھا، میرے اندام کو چھو اور مجھے اپنا بنا،
میں تیری ہوں "
اشو لّا نو نے جواب دیا :
" تو مجھ سے کیا چاہتی ہے ؟
میری ماں روٹی پکاتی ہے اور میں کھانا ہوں

پھر تجھ جیسی کے پاس گلی سڑی غذا کھانے کیوں آتی؟
جھاڑ کی دیوار نے کب کسی کو پالے سے بچایا ہے؟"
تو نے یہ جواب سنا
تو اُسے پیٹا اور چھچھوندر بنا دیا۔
اب وہ زمین میں پھنسا ہوا ہے
نہ اُوپر آ سکتا ہے نہ نیچے جا سکتا ہے۔
اُس بیچارے کی آرزو ہمیشہ اُس کے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔
اب اگر میں تیرا عاشق بنوں،
تو کیا میرا انجام یہی نہ ہوگا؟"
عشتار نے یہ سنا تو اُسے بڑا طیش آیا
اور وہ آسمان پہ گئی۔
اور اپنے باپ اَنُو اور اپنی ماں اَن تُوم سے کہنے لگی:
"میرے باپ! گل گامش نے میری بڑی توہین کی ہے۔
اُس نے میری بدکاریوں کے قصے میرے منہ پر کہہ دیئے
اور میرے اعمالِ سیاہ ایک ایک کر کے گنوائے۔
اَنُو نے بولنے کے لیے منہ کھولا
اور درخشاں عشتار سے کہا:
"بلاشبہ، اِس جھڑکی اور ذلت کو خود تُو نے مدعو کیا تھا۔
پس گل گامش نے تیری سیہ کاریاں اور بد اعمالیاں تجھے گنوا دیں"
عشتار نے بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا،
اور اپنے باپ اَنُو سے کہا:
میرے باپ! مجھے ثورِ فلک بنا دے
تاکہ میں گل گامش کو ہلاک کر سکوں
اور اُس میں غرہ بھر دے تاکہ وہ برباد ہو جائے۔
اور اگر تُو نے مجھے ثورِ فلک نہ بنایا
تو میں ظلمات کے دروازے توڑ ڈالوں گی
اور اُس کے بیلنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔

مَیں پاتال کے پھاٹک کو چوپٹ کھول دوں گی
اور مُردوں کو اُوپر لے آؤں گی تاکہ وہ زندوں کے ساتھ کھانا کھائیں۔
اور مُردوں کی تعداد زندوں سے بڑھ جائے گی "
اَنُو نے بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا
اور ورخشاں عشتار سے کہا :
" اگر میں نے تیری خواہش پوری کر دی
تو سات سال تک دُنیا میں قحط رہے گا
اور اناج کے دانے کھوکھلے ہو جائیں گے۔
کیا تُو نے لوگوں کے لیے کافی اناج فراہم کر لیا ہے
اور جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست ہو گیا ہے "
عشتار نے بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا
اور اپنے باپ اَنُو سے کہا :
" میں نے لوگوں کے لیے اناج کوٹھیوں میں بھر دیا ہے
اور جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست بھی کر لیا ہے،
اگر سات سال تک اناج کے دانوں میں چھلکے کے سوا کچھ نہ ہُوا
تو بھی آبادی کے لیے اناج موجود ہے
اور گھاس بھی کافی ہے "
پس اَنُو نے اپنی بیٹی کے لیے ثورِ فلک کو پیدا کیا۔
ثورِ فلک زمین پر آیا۔
اُس نے پہلے حملے میں ایک سو آدمی ہلاک کیے،
پھر دو سو آدمی اور پھر تین سو آدمی۔
اُس کے دوسرے حملے میں کئی سو آدمی اور مارے گئے۔
اپنے تیسرے حملے میں وہ اِن کِدُو پر جھپٹا۔
مگر اِن کِدُو نے اُس کا وار خالی دیا
اور اُچھل کر سانڈ کی دونوں سینگیں پکڑ لیں،
ثورِ فلک نے اپنا جھاگ اُس کے منہ پر پھینکا
اور اپنی موٹی دُم سے اُسے کوڑے مارے۔

اِن کِدُو نے گل گامش کو آواز دی اور کہا :

"میرے دوست! ہمیں گھمنڈ تھا کہ ہم اپنے پیچھے نام چھوڑ جائیں گے ،
اب اپنی تلوار اِس کی گردن اور سینگ کے درمیان پیوست کر دے "
گل گامش نے سانڈ کا پیچھا کیا
اور اُس کی دُم پکڑ لی
اور اپنی تلوار سانڈ کی گردن اور سینگوں کے درمیان پیوست کر دی
اور اُسے ہلاک کر دیا۔
اور اُس کا دل نکال کر شمس کو چڑھاوا پیش کیا۔
تب دونوں بھائیوں نے آرام کیا ۔

تب عشتار عروق کی بڑی دیوار پہ چڑھ گئی
اور فصیل پہ سے بد دعا دینے لگی :
" گل گامش کا بُرا ہو
جس نے ثورِ فلک کو قتل کر کے میری توہین کی ہے "

اِن کِدُو نے عشتار کے یہ الفاظ سُنے
تو اُس نے سانڈ کی دائیں ران چیر کر
عشتار کے مُنہ پہ پھینک ماری اور پکارا :
" اگر میں تجھے پکڑ پاؤں تو تیرا بھی یہی حال کروں
اور تیری انتڑیاں نکال کر تیرے پہلو میں رکھ دوں "

تب عشتار نے اپنے موبدوں کو طلب کیا
اور ناچنے گانے والی لڑکیوں کو ،
اور مندر کی داسیوں کو
اور درباریوں کو
اور سب لوگ سانڈ کی دائیں ران پہ بین کرنے بیٹھ گئے ،

لیکن گل گامش نے ہنرمندوں اور کاریگروں کو
ایک ساتھ طلب کیا
وہ سینگوں کی موٹائی دیکھ کر عش عش کر گئے ۔
اُن پہ لاجورد کا دو دو اُنگل موٹا جڑاؤ کام بنا تھا ۔

اُن کا وزن پندرہ پندرہ سیر تھا
اور اُن کے اندر تیل کے چھ پیمانوں کی گنجائش تھی۔
تیل اُس نے اپنے محافظ دیوتا لُگل باندا کی خدمت میں پیش کیا
اور سینگوں کو محل میں لا کر شاہی خواب گاہ میں لٹکا دیا۔
تب انھوں نے اپنے ہاتھ دریائے فرات میں دھوئے
اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔
وہ عروُن کے بازار سے سواری پر گذرے
اور شہریوں کا ہجوم اُنھیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا
اور گِل گامش نے گانے والی لڑکیوں سے پکار کر کہا:
"سورماؤں میں سب سے شان والا کون ہے؟
شہریوں میں سب سے عزت والا کون ہے؟"
گِل گامش سورماؤں میں سب سے شان والا ہے
گِل گامش شہریوں میں سب سے عزت والا ہے۔!
تب شاہی محل میں جشنِ فتح منایا گیا
اور خوشی کے شادیانے بجے،
یہاں تک کہ سورماؤں کے سونے کا وقت آگیا۔
اِن کِدو بھی سونے کے لیے بستر پر لیٹا
اور اُس نے ایک خواب دیکھا
اور خواب کو اپنے بھائی سے بیان کرنے اُٹھ بیٹھا:
"میرے دوست! عظیم دیوتا مجلسِ شوریٰ میں کیوں بیٹھے ہیں؟"
اور جب صبح ہوئی تو اِن کِدو نے گِل گامش سے کہا:
"رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا:
اَنُو، اِن لیل، اَیا اور شمس مجلسِ شوریٰ میں بیٹھے تھے
اور اَنُو نے اِن لیل سے کہا:
'اُنھوں نے ثورِ فلک اور حمبابا کو ہلاک کیا ہے
لہٰذا دونوں میں سے ایک کو مرنا ہوگا،
پھر وہ کیوں نہ مرے جس نے دیودار کے درخت کو کاٹ کر پہاڑ کو ننگا کیا تھا؟'

لیکن اِن لیل نے کہا: اِن کِدو کو مرنا ہوگا

گل گامش نہیں مرے گا ،

" تب شمس تاباں نے بہادر اِن لِل کو جواب دیا :

" کیا اُنھوں نے ثورِ فلک اور حمبابا کو

میرے حکم سے نہیں ہلاک کیا تھا ؟

پھر اِن کِدو بے قصور کیوں مارا جائے ؟

لیکن اِن لیل شمس سے خفا ہو کر بولا :

" تم روز اُن کے پاس دوستی کرنے جاتے تھے

اسی لیے تم اُن کی حمایت کر رہے ہو ۔ "

پس اِن کِدو بیمار پڑا اور گل گامش کے رُوبرو لیٹ گیا ۔

گل گامش کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ رہی تھی

اور اُس نے کہا :

" اے میرے بھائی ، میرے پیارے بھائی !

کاش وہ میرے بھائی کے بدلے مجھے لے جاتے

کیا مجھ کو مُردوں کے پہلو میں ،

روح کے دروازے پر بیٹھنا ہوگا ؟

جہاں میں اپنے پیارے بھائی کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا ۔

بیماری میں اکیلے پڑے پڑے اِن کِدو نے جنگل کے پھاٹک کو سراپ دیا

اور اُس سے یوں مخاطب ہُوا گویا وہ بھی کوئی جاندار شے تھا :

" اے لکڑی کے دروازے ! جسے نہ فہم ہے نہ ادراک !

میں نے تجھے کسی معمولی لکڑی کا بنا ہُوا سمجھا تھا ۔

اس سے پیشتر کہ مجھے دیودار کے اُونچے اُونچے درخت نظر آتے ،

تیری لکڑی تیس کوس کے فاصلے سے مجھے بہت پسند آئی تھی ۔

تیری اونچائی ۳۶ گز تھی اور تیری چوڑائی ۱۲ گز تھی

تیری چول ، چول میں جڑی ہوئی شیام اور مٹھیا سب درست تھیں

بڑھیوں نے تجھے نِپّر میں تیار کیا تھا ،

اِن لِل کے مقدس شہر میں ۔

اے دروازے! اگر میں جانتا کہ میرا انجام یہ ہوگا،
اگر میں جانتا کہ تیری شان و شوکت
میرے لیے جان لیوا ہوگی،
تو میں نے تیشہ لے کر تجھے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہوتا
گویا تو جھاؤ کا چوکھٹا تھا۔
میں تجھے اپنے ہاتھ سے ہرگز نہ چھوتا۔"

تب اُس نے بھلٹے اور دیو داسی کو کوسا

بھلٹے کا بُرا ہو جس نے مجھے دام فریب میں پھنسایا،
جنگلی جانور اُس کی آنکھوں کے سامنے جال میں سے بھاگ جائیں
اُس کی دلی آرزو کبھی پوری نہ ہو۔"
تب اُس نے دیو داسی کو کوسنا شروع کیا:
"سن او لڑکی۔ اب میں تیری تقدیر کو بد دعا دوں گا
اور ابد تک تو اس تقدیر سے چھٹکارا نہ پاسکے گی۔
میں تجھے سراپ دوں گا، اور یہ سراپ بہت بُرا ہوگا،
وہ تجھے جلد ہی دبوچ لے گا:
دیوتا تیرے حسن کی دلکشی سے بیزار ہوجائیں،
راستے تیرا مسکن ہوں
اور تیرا بستر دیوار کے سائے میں بنے
بدمست اور ہوشیار دونوں تیرے گال پر تھپڑ ماریں۔

شمس نے اِن کِدو کے منہ سے یہ الفاظ سُنے

تو اِن کِدو کو آسمان سے آواز دی:
" اِن کِدو! تو اُس عورت کو کیوں سراپتا ہے
جس نے تجھے ایسی غذا کھانی سکھائی جو دیوتاؤں کے لیے موزوں تھی
اور تجھے ایسی شراب پینی سکھائی جو بادشاہوں کو مرغوب تھی،
جس نے تجھے امیروں کا لباس پہنایا،
اور کیا اُس نے حسین گل گامش کو تیرا رفیق نہیں بنایا،
اور کیا تیرے جگری دوست گل گامش نے تجھے شاہی بستر پر نہیں سلایا

اور اپنے تخت کے بائیں جانب آرام سے نہیں بٹھایا
اُس نے روئے زمین کے شہزادوں کو تیرے قدم چومنے پر مجبور کیا،
اور یوروک کے سب شہری تیرے غم میں مبتلا ہیں
اور جب تو مر جائے گا،
تو یہ لوگ تجھے روئیں گے
گل گامش مسرور انسانوں کو تیرے لیے مغموم بنائے گا
اور جب تو چلا جائے گا
تو گل گامش اپنے بال بڑھائے گا
اور شیر کی کھال اوڑھ کر صحرا میں مارا مارا پھرے گا۔"
اِن کِدو نے شمس تابان کے یہ الفاظ سُنے
تو اُس کے برہم دل کو قرار آ گیا۔
اُس نے اپنی بد دُعائیں واپس بُلا لیں
اور دیوداسی کے حق میں دعا کی:
"کوئی تجھے حقیر نہ کرے
اور نہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر تیری ہنسی اُڑائے۔
بادشاہ، شہزادے اور رؤسا تجھ سے محبت کریں
بوڑھا آدمی اپنی داڑھی ہلا کر تجھے دعا دے
نوجوان تیرے جسم پر اپنا کمربند کھولے
تیرا خزانہ عقیق، لاجوردا اور سونے سے بھرا رہے
تیری آبرو ریزی کرنے والا کتے کی سزا پائے۔
اُس کا گھر ویران
اور اُس کے اناج کا ذخیرہ خالی ہو جائے۔
موبد تجھے دیوتاؤں کے رُوبرو آتے دیکھ کر
احتراماً ایک طرف ہٹ جائیں،
لوگ تیری خاطر اپنی بیویوں کو چھوڑ دیں،
سات بچوں کی ماں کو۔
اِن کِدو بستر پر بیمار پڑا تھا۔

اور جب رات ہوئی۔
تو اُس نے اپنے دل کی بات گل گامش سے کہی :
" میرے دوست! کل رات میں نے پھر ایک خواب دیکھا
آسمان دہاڑ رہا تھا اور زمین اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔
میں ایک بھیانک ہستی کے روبرو اکیلا کھڑا تھا،
اُس کا چہرہ کالا تھا، طوفان کے طائرِ سیاہ کی مانند
اور اُس کے ناخن شاہین کے پنجوں کی طرح تھے۔
وہ جھپٹا اور مجھے اپنے پنجوں میں دبوچ لیا
یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگا۔
اُس نے میری شکل بدل دی
اور میرے بازو پرند کے مانند پروں سے ڈھک گئے۔
اُس نے مجھے گھور کر دیکھا
اور ملکۂ ظلمات، ارکالا کے محل میں لے گیا،
اُس راستے پر جس سے کوئی نہیں لوٹتا،
اُس مکان میں جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا
" یہ وہ مکان ہے جس کے مکین اندھیرے میں رہتے ہیں
دھول اُن کا توشہ ہے اور چکنی مٹی اُن کی خوراک۔
وہ پرندوں کا سا لباس پہنتے ہیں
اور اُن کے پر لگے ہوتے ہیں۔
وہ روشنی نہیں دیکھتے بلکہ اندھیرے میں رہتے ہیں۔
میں اس خانۂ غبار میں داخل ہوا
اور میں نے اس زمین کے تاجداروں کو دیکھا
کہ تاج سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیئے گئے تھے
شاہوں اور شاہزادوں کو دیکھا،
غرض اُن سبھوں کو جو کسی زمانے میں زمین پر راج کرتے تھے۔
اور وہ، جو کسی زمانے میں انو اور انلیل کی مانند
خدائی کیا کرتے تھے،

اِس خانۂ غبار میں خادموں کی طرح
تلا ہوا گوشت اُٹھائے کھڑے تھے،
وہ بریاں گوشت پیش کر رہے تھے
اور مشکوں سے ٹھنڈا پانی انڈیل رہے تھے۔
اِسی خانۂ غبار میں
موبدِ اعظم اور اُس کے خدام بھی موجود تھے
اور منتر پڑھنے والے اور ملنگ بھی،
وہیں معبد کے ملازمین بھی تھے،
اور دیوتاؤں کے برتن مانجھنے والے بھی۔
کیش کا فرماں روا ایتانا بھی تھا
جس کو عہدِ قدیم میں
شاہین اپنے پنجے میں اُٹھا کر آسمان پر لے گیا تھا۔
مَیں نے مویشیوں کے دیوتا سموقان کو بھی دیکھا
اور ملکۂ ظلمات اریش کی گل بھی وہیں تھی
اور بیلت سیری ملکۂ ظلمات کے رُو برو آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھی تھی،
وہ جو دبیرۂ خداوندا اور لوحِ فنا کی محافظ ہے۔
اُس کے ہاتھ میں ایک تختی تھی،
اور وہ اُس میں سے کچھ پڑھ رہی تھی۔
اُس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا:
"اِس کو یہاں کون لایا ہے؟"
— تب میری آنکھ کھل گئی
اور مجھے یوں محسوس ہُوا
گویا کسی نے میرے بدن کا سارا خون چوس لیا ہے،
جیسے کوئی اجاڑ کے بن میں اکیلا پھر رہا ہو۔
جیسے اہلکارِ ضبطی نے کسی کو پکڑ لیا ہو
اور دہشت سے اُس کا دل بلیوں اُچھل رہا ہو۔
میرے بھائی! کسی نامور شہزادے یا دیوتا کو

میری موت کے وقت لپنے پھاٹک پر کھڑا کر دینا
تاکہ وہ میرا نام مٹا کر اپنا نام لکھ دے "
اِن کِدُو نے اپنے کپڑے نوچ کر پھینک دیئے
اور اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا۔
اور اُس کی باتیں سن کر گِل گامش کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے،
اُس نے اپنا منہ کھولا اور اِن کِدُو سے کہا :
" مضبوط پشتوں والے عروق میں،
تجھ سا دانا کہاں ہے ؟
تُو نے عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں
مگر تیرا دل ایسی باتیں کیوں کرتا ہے ؟
تیرا خواب حیرت انگیز تھا مگر اُس سے زیادہ دہشت خیز۔
ہمیں اس خواب کا احترام کرنا ہوگا،
خواہ وہ کتنا ہی دہشت خیز کیوں نہ ہو،
کیونکہ اس خواب سے ظاہر ہو گیا ہے
کہ تندرست آدمی پر بھی آخر بُرا وقت آ ہی جاتا ہے۔
زندگی کا انجام غم ہے "
اور گِل گامش نے ماتم کیا۔
" اب میں عظیم دیوتاؤں سے التجا کروں گا
کیونکہ میرے دوست نے ایک بُرا خواب دیکھا ہے "
اِن کِدُو نے جس دن خواب دیکھا تھا
وہ دن تمام ہوا۔
اور وہ بیماری سے بدحال پڑا رہا
وہ پورا دن بستر میں لیٹا رہا اور اُس کی تکلیف بڑھتی رہی،
دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی۔
وہ دس دن تک یونہی بستر میں پڑا تڑپتا رہا
اور اُس کی تکلیف برابر بڑھتی رہی۔
گیارھویں اور بارھویں دن وہ اور شدید ہو گیا۔

آخر کار اُس نے گِل گامش کو بلایا اور اُس سے کہا :
میرے دوست ! عظیم دیوی نے مجھے سراپ دیا ہے
لہٰذا مجھے مرنا ہوگا ،
مگر میں اس طرح نہیں مروں گا جیسے سپاہی میدانِ جنگ میں مرتے ہیں
کیونکہ میں جنگ سے ڈر گیا تھا ۔
مبارک ہے وہ جو جنگ میں لڑتا ہوا مارا جائے
لیکن میری موت تو شرمناک ہوگی "
اور گِل گامش اِن کیدُو کے لیے روتا رہا ۔
طلوعِ سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ گِل گامش کی آواز بلند ہوئی ۔
اُس نے مشیرانِ عورتوں کو مخاطب کرکے کہا :
" عروق کی معزز ہستیو ! میری سنو !
" میں اپنے دوست اِن کیدُو کے لیے روتا ہوں
میں عورتوں کی طرح نوحہ کناں ہوں ۔
اے اِن کیدُو ! غزال ! جو صحرائی جو تیرے ماں باپ تھے
اور چوپائے جنہوں نے تجھے اپنے دودھ سے پالا تھا ،
تیرے لیے روتے ہیں ۔
صحرا اور کوہستان کے سب جنگلی جانور تیرے غم میں روتے ہیں ،
دیودار کے بن میں تیرے محبوب راستے شب و روز شیون کرتے ہیں ،
فصیلوں سے محفوظ عروق کی بزرگ ہستیاں تجھے روتی ہیں ،
انگشتِ رحمت تیرے غم میں اونچی ہو ،
اِن کیدو ! میرے بھائی ، تو میرے پہلو میں تیشہ تھا ،
میرے بازو کی قوت ، میرے کمر کی تلوار ، میرے سامنے کی سپر ،
ایک زرق برق لباس جشن امیرانہ میں اور سب سے حسین زیور !
سنو ! چہار جانب کہرام مچ رہا ہے
جیسے کوئی ماں بین کر رہی ہو ۔
راستو ! جن پر ہم ساتھ چلے ہیں ، آنسو بہاؤ ،
اور وہ جگہیں

جہاں ہم نے تیندوے، شیر، چیتے، بیل، ہرن، ریچھ اور لکڑ بگھے کا شکار کیا ہے
اور وہ پہاڑ جسے عبور کر کے
ہم نے دیودار کے پاسبان کو ہلاک کیا تھا
تجھے روتے ہیں
ایلم کی آوارہ ندی اور پاک فرات
جس کے ساحل پر ہم چہل قدمی کرتے اور اپنی مشکیں بھرتے تھے،
تجھے روتی ہے۔
پشتوں سے محفوظ عروق، جہاں ہم نے ثورِ فلک کو مارا تھا
اُس کے سورما تجھے روتے ہیں۔
اِن کیدو تیرے لیے اریدو کے سب لوگ روتے ہیں،
کاشتکار اور فصل بونے والے جو تیرے لیے اناج لاتے تھے،
اب تجھے روتے ہیں۔
خدام جو تیرے بدن پہ تیل کی مالش کرتے تھے
تجھے روتے ہیں۔
وہ دیوداسی جس نے تیرے منہ میں شراب چوائی
اور تجھے خوشبودار تیل ملا،
اب تیرے لیے ماتم کرتی ہے۔
محل سرا کی عورتیں
جو تیری پسند کی انگوٹھی اور دلہن لائی تھیں
اب پچھاڑیں کھاتی ہیں۔
تیرے نوجوان بھائی عورتوں کی مانند گریہ کناں ہیں
اور انھوں نے اپنے بال کھول دیے ہیں۔
بُری قسمت نے تجھے لوٹ لیا ہے
اے میرے نوجوان بھائی اِن کیدو، اے میرے عزیز ترین دوست!
تجھ پہ یہ کیسی نیند غالب آئی ہے
تو اندھیرے میں کھو گیا ہے اور میری آواز نہیں سن سکتا۔
گل گامش نے اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھا
مگر اُس کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی

اور اُس کی آنکھیں مُندھ گئی تھیں۔
تب گل گامش نے اپنے دوست کا چہرہ ڈھانپ دیا
جیسے دلہن کو نقاب اُڑھائی جاتی ہے
اور وہ شیر کی مانند گرجا
اُس شیرنی کی مانند جس کے بچے چوری ہو گئے ہوں۔
وہ کبھی پلنگ کے سرہانے جاتا تھا کبھی پائنتی،
اُس نے اپنے بال بکھیر دیئے اور نوچ ڈالے
اور اپنی زرق برق پوشاک کو تار تار کر کے دُور پھینک دیا
گویا وہ غلاظت سے آلودہ ہو گئی تھی۔
طلوعِ سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ گل گامش چیخا:
"میں نے تجھے سونے کے لیے شاہی بستر دیا،
اپنے بائیں جانب کی نشست پر آرام سے بٹھایا
اور ملک کے شہزادوں نے تیرے قدم چُومے۔
البانِ عروق تیری لاش پر ماتم کریں گے
اور تیرا مرثیہ پڑھیں گے
مسرور لوگوں کے سر فرطِ غم سے جھک جائیں گے
اور جب تُو زمین میں چلا جائے گا
تو میں تیری یاد میں اپنے بال بڑھاؤں گا
اور شیر کی کھال اوڑھ کر بیابان میں پھروں گا"
دوسرے دن اُس نے صبح کی روشنی میں پھر ان کِدُو کا ماتم کیا۔
سات دن اور سات راتیں وہ اِن کِدُو کے غم میں روتا رہا
یہاں تک کہ اِن کِدُو کی لاش پر کیڑے رینگنے لگے،
تب اُس نے اِن کِدُو کو سپردِ خاک کیا
کیونکہ اَنُوناکی اُس پر قابض ہو گیا تھا۔
تب گل گامش نے ملک میں فرمان جاری کیا
اور سُناروں، نگینہ سازوں، سنگ تراشوں اور تانبے کا کام کرنے والوں کو طلب کیا
اور اُنھیں حکم دیا کہ میرے دوست کا ایک بُت بناؤ۔

اُس بُت کا سینہ لاجورد کا تھا اور جسم سونے کا۔
اور چوبِ ایلما کی ایک بڑی سی میز سجائی گئی
اور اُس پر شہد سے بھرا ہوا عقیق کا ایک پیالہ
اور مکھن سے بھرا ہوا لاجورد کا ایک پیالہ
رکھ دیا گیا۔
اور گل گامش نے شمس کے کھلے آسمان کے نیچے ان چیزوں کا چڑھاوا پیش کیا
اور روتا ہوا واپس چلا گیا۔

چوتھا باب

حیاتِ ابدی کی تلاش

گل گامش اپنے دوست اِن کدُو کے لیے زار و قطار روتا
اور بیابان میں گشت لگاتا رہا۔
تلخیٔ غم میں اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے:
"مجھے قرار کیسے آئے، مجھے سکون کیسے نصیب ہو؟
میرا سینہ رنج سے لبریز ہے۔
میں مروں گا تو میرا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کِدو کا ہوا۔
موت کے خوف سے میں مارا مارا پھرتا ہوں۔
مگر موت سے بچنے کے لیے میں
اُبارہ توتو کے بیٹے اُتناپشتیم سے ملنے کی راہ،
جس طرح بن پڑے، ضرور نکالوں گا۔
لوگ اُسے ساکنِ ماورا کہتے ہیں
کیونکہ وہ دیوتاؤں کی مجلس میں شریک ہوگیا ہے۔"
پس گل گامش ویرانوں میں پھرتا رہا
اور گیاہستانوں میں گھومتا رہا۔
اُس نے اُتناپشتیم کی تلاش میں،
جسے دیوتاؤں نے سیلاب کے بعد اپنی پناہ میں لے لیا تھا،

دیوتاؤں نے اُتناپشتیم کی اقامت ارضِ زِلمون میں رکھی تھی،
گلشنِ شمس میں،
اور انسانوں میں سے
بس اُسی کو حیاتِ جاوداں بخشی تھی۔
اور جب گلگامش رات کے وقت کوہستانی دروں کے نزدیک پہنچا
تو اُس نے دعا کی:
مدت گزری میں نے انھیں دروں میں شیر دیکھے تھے
اور میں ڈر گیا تھا
اور میں نے اپنا سر چاند کے دیوتا سین کی طرف بلند کیا تھا
اور دعا کی تھی،
اور میری دعائیں دیوتاؤں تک پہنچی تھیں۔
پس چاند کے دیوتا سین آج بھی میری حفاظت کر۔
دعا کرنے کے بعد جب وہ سونے کے لیے لیٹا
تو اس نے خواب دیکھا اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔
اُس نے دیکھا کہ شیر اُس کے گرد خوشیاں منا رہے ہیں۔
پس اُس نے اپنا تیشہ اٹھایا
اور تلوار نیام سے نکالی
اور تیر کی مانند اُن پہ جھپٹا
اور انھیں ہلاک کر کے اُن کے ٹکڑے ہوا میں بکھیر دیئے۔
آخر گلگامش ایک کوہِ عظیم کے قریب پہنچا
جس کا نام مشو ہے۔
وہ پہاڑ جو آفتاب کے طلوع و غروب کا محافظ ہے۔
اُس کی جوڑواں چوٹیاں دیوارِ فلک کے برابر اونچی ہیں
اور اُس کی جڑیں ظلمات تک جاتی ہیں۔
اُس کے پھاٹک کا پہرہ عقرب دیتے ہیں
جو نصف انسان اور نصف اژدہا ہیں
اُن کی جھلک ہی دہشت طاری کر دیتی ہے

اور اُن کی غضب آلود نگاہ انسانوں کے لیے پیغامِ موت لاتی ہے
اور اُن کا ہالۂ نور پہاڑوں کو،
جو طلوعِ آفتاب کے پاسباں ہیں،
اپنی آغوش میں لیے رہتا ہے۔
گل گامش نے اُن کو دیکھا
تو ایک لمحہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
تب اُس نے دل کو مضبوط کیا اور آگے بڑھا۔
بچھوؤں نے گل گامش کو بےخطر بڑھتے دیکھا تو
نر نے مادہ کو آواز دی:
"یہ جو ہماری طرف آ رہا ہے دیوتاؤں کی اولاد ہے"
مادہ نے جواب دیا:
"وہ دو تہائی دیوتا ہے اور ایک تہائی انسان"
تب نر نے گل گامش کو پکارا:
"تم نے اتنا بڑا سفر کیوں کیا ہے؟
خطرناک سمندروں کو عبور کر کے اتنی دور کس غرض سے آئے ہو؟
مجھے اپنے آنے کا سبب بتاؤ"
گل گامش نے جواب دیا:
"انکِدو کے لیے،
میں اُسے بہت چاہتا تھا۔
ہم نے ایک ساتھ طرح طرح کی سختیاں جھیلی ہیں،
اُسی کے باعث میں یہاں آیا ہوں
کیونکہ انسان کی مشترکہ تقدیر اُسے بھی لے گئی ہے
میں اُس کے لیے رات دن رو رہا ہوں،
میں اُس کی لاش کو دفن کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔
مجھے گمان تھا کہ
میرا دوست میری گریہ و زاری سے واپس آ جائے گا۔
جب سے وہ گیا ہے میری زندگی میں کچھ باقی نہیں رہا۔

پس میں اپنے باپ اُتناپشتیم کی تلاش میں یہاں تک آیا ہوں،
لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوتاؤں کے حلقے میں شامل ہو گیا ہے۔
اور اُسے حیاتِ ابدی مل گئی ہے۔
میں اُس سے حیات و ممات کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"
نر نے اپنا منہ کھولا اور گل گامش سے کہا :
"عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے والے کسی انسان نے
آج تک وہ نہیں کیا جو تو چاہتا ہے۔
کوئی انسان اس پہاڑ کو عبور نہیں کر سکتا۔
اس کا اندھیارہ اٹھارہ کوس لمبا ہے۔
اس تاریکی میں اُجالے کا گذر نہیں،
اس تاریکی سے دل بیٹھنے لگتا ہے۔
طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک وہاں کوئی روشنی نہیں ہوتی۔"
گل گامش نے کہا :
"مجھے خواہ رنج پہنچے یا تکلیف،
میں خواہ کراہتا ہوا جاؤں یا روتا ہوا،
پھر بھی مجھے وہاں پہنچنا ضرور ہے۔
لہٰذا پہاڑ کا پھاٹک کھول دے۔"
اور بچھو کے نر نے کہا :
"گل گامش، جا،
میں تجھے کوہِ مشو سے گذرنے کی اجازت دیتا ہوں
اور اُس کی بلند چوٹیوں سے بھی،
تیرے پاؤں تجھے صحیح سلامت گھر واپس لے جائیں،
پہاڑ کا پھاٹک کھلا ہوا ہے۔"
گل گامش نے یہ سنا
تو وہی کیا جو بچھو کے نر نے کہا تھا۔
وہ طلوعِ آفتاب کی راہ پر چل پڑا۔
... ایم بوڈرڈ کرسہ ۹۰۱

کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی تین کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی،
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی ساڑھے چار کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی،
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی چھ کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں روشنی نہ تھی،
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی ساڑھے سات کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی،
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی نو کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی ساڑھے بارہ کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔

بارہ کوس چلنے کے بعد وہ بڑے زور سے چیخ
کیونکہ اندھیرا بہت گہرا تھا
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
ساڑھے تیرہ کوس چلنے کے بعد اُس نے اپنے چہرے پر اُتری ہوا محسوس کی
لیکن اندھیرا بہت گہرا تھا
اور کوئی روشنی نہ تھی،
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
پندرہ کوس کے بعد منزل قریب تھی،
ساڑھے سولہ کوس کے بعد نورِ سحر نمودار ہوا
اور اٹھارہ کوس کے بعد سورج چمکنے لگا۔
وہاں دیوتاؤں کا باغ تھا۔
اور ہر چہار جانب جھاڑیوں میں جواہرات لگے تھے۔
اور رو رحت عنبتق کے پھلوں سے لدے تھے،
رانگور کی بیلیں آنکھوں کو فرحت بخشتی تھیں
اور اُن کے پتّے لاجورد کے تھے
اور خوشے نہایت شیریں تھے۔
اور کانٹوں اور گوکھروؤں کی جگہ یاقوت، زمرّد اور موتی اُگ رہے تھے۔
گل گامش سمندر کے کنارے باغ میں ٹہل رہا تھا
کہ شمس کی نگاہ اُس پر پڑی
اور اُس نے دیکھا کہ گل گامش جانوروں کی کھال اوڑھے ہوئے ہے
اور اُن کا گوشت کھا رہا ہے۔
شمس آزردہ ہوا اور اُس نے کہا:
اِس سے پیشتر کوئی فانی انسان اس راہ سے نہیں گذرا
اور نہ آئندہ جب تک ہوائیں سمندر میں چلتی رہیں گی
کوئی اِدھر سے گذر سکے گا۔
اور وہ گل گامش سے مخاطب ہوا:
"تجھے جس زندگی کی تلاش ہے وہ کبھی نصیب نہ ہوگی"

گل گامش نے شمس تاباں سے کہا :

"بیابانوں میں دور دور تک بھٹکتے پھرنے
اور طرح طرح کی سختیاں جھیلنے کے بعد
کیا میں اپنا سر ہمیشہ کے لیے مٹی سے ڈھانپ لوں
اور سو جاؤں ؟
میری آنکھوں کو سورج کا نظارہ کرنے دے
یہاں تک کہ وہ چندھیا جائیں ۔
میری حالت مردے سے بہتر نہیں ہے
پھر بھی مجھے سورج کی روشنی دیکھنے دے ۔
جب روشنی کافی ہو تو اندھیرا چھٹ جاتا ہے ۔
وہ جو مر گیا ہے کاش سورج کی تابانی کو دیکھ سکتا"

وہ جو انگور کی زوجہ اور ربۃِ عنب ہے ،
سمندر کے کنارے رہتی ہے
سدوری ساحل پر باغ میں بیٹھی ہے
طلائی پیالہ اور شراب بنانے کی ناند ،
جو دیوتاؤں کا عطیہ ہیں ،
اُس کے پاس دھرے ہیں ۔
اُس کے چہرے پر نقاب پڑی ہے ۔
اُس کو گل گامش آتا دکھائی دے رہا ہے ۔
گل گامش کے جسم پر دیوتاؤں کا گوشت ہے ،
وہ کھال اوڑھے ہوئے ہے
اُس کا دل افسردہ ہے ،
اور اُس کا حلیہ کہتا ہے کہ اُس نے بہت لمبا سفر کیا ہے ۔

سدوری نے غور سے دیکھا ، فاصلے کا اندازہ کیا
اور اپنے دل میں کہا ، بیشک یہ کوئی شہدا ہے ،
مگر یہ کہاں جا رہا ہے ؟
اور اُس نے اپنا پھاٹک بند کر لیا

اور آڑی سلاخیں اور بیلن لگا دیے
لیکن گِل گامش نے بیلن کی آواز سنتے ہی
اپنا سر اونچا کیا اور اپنے پاؤں پھاٹک میں جما دیے
اُس نے سِدُوری کو پکارا :
"شراب بنانے والی نوجوان عورت !
تُو نے اپنا دروازہ کیوں بند کر لیا ،
تُو نے کیا دیکھا جو پھاٹک میں سلاخیں لگا دیں
میں تیرا دروازہ توڑ دوں گا اور تیرے پھاٹک میں گھس آؤں گا ،
کیونکہ میں گِل گامش ہوں
جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر مار ڈالا ،
میں نے دیودار کے بن کے محافظ کو ہلاک کیا ہے ،
میں نے حمبابا کو پچھاڑا ہے
جو جنگل میں رہتا تھا ،
اور میں نے کوہستانی دروں میں شیر بھی مارے ہیں۔"
تب سِدُوری نے اس سے کہا :
اگر تُو وہ گِل گامش ہے
جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر مار ڈالا
جس نے دیودار کے محافظ کو ہلاک کیا ،
جس نے حمبابا کو پچھاڑ دیا جو جنگل میں رہتا تھا ،
اور کوہستانی دروں میں شیر مارے ،
تو پھر تیرے گال پچکے ہوئے کیوں ہیں ؟
اور تیرا چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے ؟
تیرا دل اُداس کیوں ہے
اور تیرا حلیہ دُور سے آنے والے مسافر کا سا کیوں ہے ؟
ہاں ، تیرا چہرہ گرمی اور سردی سے جُھلسا ہوا کیوں ہے ؟
اور تو ہوا کی تلاش میں چراگاہوں میں بھٹکتا ہوا
یہاں کیوں آیا ہے ؟

گل گامش نے اسے جواب دیا :

میرے گال پچکے ہوئے کیوں نہ ہوں
اور میرا چہرہ کیوں نہ اُترے ؟
میرا دل اُداس کیوں نہ ہو
اور میرا حلیہ دُور سے آنے والے مسافر کی مانند کیوں نہ ہو ؛
گرمی اور سردی سے جھلسا ہوا ،
اور میں ہوا کی تلاش میں چراگاہوں میں کیوں نہ بھٹکتا پھروں ؟
میرے دوست اور چھوٹے بھائی کو
وہ جو بیابان کے جنگلی گدھے اور میدان کے تیندوے کو
شکار کرتا تھا ،
میرا چھوٹا بھائی جس نے ثورِ فلک کو ہلاک کیا
اور دیودار کے بَن میں حمبابا کو پچھاڑا
میرا دوست جو مجھے بہت عزیز تھا
اور جس نے میرے ہمراہ کتنے ہی خطروں کا مقابلہ کیا ،
اِن کِدُو میرا بھائی جس کو میں بہت چاہتا تھا ،
انجام کار موت اُس پر غالب آگئی ۔
میں اس کے لیے سات دن اور سات رات روتا رہا
یہاں تک کہ اُس کی لاش پر کیڑے رینگنے لگے
اپنے بھائی کے انجام کے سبب مجھے موت سے ڈر لگتا ہے
اسی باعث میں ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں
اور مجھے کہیں سکون نہیں ملتا ،
لیکن شراب بنانے والی جوان عورت !
اب کہ میں نے تیرا چہرہ دیکھ لیا ہے
مجھے موت کا چہرہ نہ دیکھنے دے
کیونکہ میں اس سے خوف زدہ ہوں

اُس نے جواب دیا :

تجھے جانے کی جلدی کیوں ہے ؟

تو جس زندگی کی تلاش میں ہے وہ تجھے کبھی نہ ملے گی
دیوتاؤں نے انسان کو پیدا کیا
تو اُس کی قسمت میں موت بھی لکھ دی
اور حیاتِ ابدی کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔
پس اے گل گامش! اپنے شکم کو اچھی چیزوں سے بھر،
دن اور رات، رات اور دن رقص کر اور خوشی منا،
دعوتیں کھا اور عیش کر
نئے نئے اور زرق برق لباس پہن،
اپنے سر کے بال دھو اور پانی میں غسل کر،
ننھے کو جو تیری اُنگلی پکڑ کر چلتا ہے، پیار کر،
اور اپنی بیوی کو ہم آغوشی سے لذت یاب کر
کیونکہ یہ بھی نوشتۂ تقدیر ہے

لیکن گل گامش نے نوجوان عورت سِدُوری کو جواب دیا:
میں خاموش کیسے رہ سکتا ہوں
میں آرام کیسے کر سکتا ہوں
جب کہ اِن کدُو میرا پیارا خاک میں مل چکا ہے
اور مجھے بھی مرنا اور ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو جانا ہے
اور تب اُس نے کہا، نوجوان عورت!
اب مجھے اُتنا پشتیم تک پہنچنے کا راستہ بتا دے
اور راہ کے لیے ضروری ہدایتیں بھی دے،
اگر ممکن ہوا تو میں بحرِ عظیم کو بھی عبور کروں گا،
اگر نہ کر سکا تو پھر میں بیابان میں اور دُور تک چلا جاؤں گا۔"

شراب بنانے والی نے اُس سے کہا:
"بحرِ عظیم کو کوئی عبور نہیں کر سکتا،
عہدِ قدیم سے آج تک کوئی شخص بھی سمندر کو پار نہیں کر سکا ہے،
فقط شمسِ تاباں بحرِ عظیم کو عبور کرتا ہے
مگر اُس کے سوا اور کون یہ جرأت کر سکتا ہے؟

وہ مقام اور اُس کی راہ دونوں بے حد دشوار ہیں
اُن کے درمیان موت کا گہرا پانی بہتا ہے
گِل گامش! تو بحرِ عظیم کو کیسے پار کرے گا؟
آبِ فنا کے ساحل پر پہنچنے کے بعد تو کیا کرے گا؟
البتہ جنگل میں تجھے اُتنا پشتیم کا ملاح اُرشابی ملے گا،
اُس کے پاس اشیاء مقدس ہیں۔ اشیاء سنگ۔
اُس کی کشتی کا پیش مارتا ہے
اُرشابی کو غور سے دیکھنا،
شاید وہ تجھے سمندر پار کروا دے
اور اگر یہ ممکن نہ ہوا تو تجھے لوٹ جانا چاہیئے۔"
گِل گامش یہ سُن کر بہت برہم ہوا۔
اس نے اپنا تیشہ اٹھایا اور تلوار کو بے نیام کیا
اور تیر کی مانند سمندر کے ساحل کی طرف لپکا۔
غصے میں اس نے پتھروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے
اور جنگل میں گھس کر اُرشابی کے سامنے کھڑا ہو گیا
اور ملاح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
اُرشابی نے اُس سے کہا:
"بتا تیرا نام کیا ہے؟
میرا نام اُرشابی ہے اور میں اُتنا پشتیم کا ملاح ہوں۔"
گِل گامش نے جواب دیا:
"میرا نام گِل گامش ہے
اور میں عروق کا رہنے والا ہوں، بیتِ اُنو کا۔"
تب اُرشابی نے اُس سے کہا:
"تیرے گال پٹے ہوئے کیوں ہیں؟
اور تیرا منہ اُترا ہوا کیوں ہے؟
تیرا دل مایوس کیوں ہے؟
اور تیرا حلیہ لمبے سفر سے آنے والے مسافر کی مانند کیوں ہے؟

ہاں، تیرا چہرہ گرمی اور سردی سے جھلسا ہوا کیوں ہے ؟
اور تُو ہوا کی تلاش میں گیا بستانوں سے گذرتا ہوا
یہاں کیوں آیا ہے ؟

گل گامش نے جواب دیا :

"میرے گال بیٹھے ہوئے کیوں نہ ہوں !
اور میرا منہ اُترا ہوا کیوں نہ ہو ؟
میرا دل مایوس کیوں نہ ہو ؟
اور میرا حلیہ لمبے سفر سے آنے والے درماندہ مسافر کی مانند کیوں نہ ہو ؟
سردی اور گرمی نے مجھے جھلس دیا ہے
میں گیا بستانوں میں مارا مارا کیوں نہ پھرتا
جب کہ میرے دوست، میرے چھوٹے بھائی پر،
جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر ہلاک کیا
اور دیودار کے بن میں حمبابا کو پچھاڑا،
میرے دوست پر جو مجھے بہت عزیز تھا،
اور جس نے میرے ہمراہ کتنے ہی خطروں کا مقابلہ کیا،
میرے بھائی اِن کِدُو پر جسے میں بہت چاہتا تھا،
موت نے قبضہ کر لیا ہے
میں اُس کے لیے سات دن اور سات رات روتا رہا
یہاں تک کہ اُس کے جسم پر کیڑے رینگنے لگے۔
اپنے بھائی کے باعث مجھے موت سے ڈر لگتا ہے،
اپنے بھائی کے سبب سے میں بیابان میں مارا مارا پھرتا ہوں،
اُس کے انجام سے میرا دل بوجھل ہے
میں خاموش کیسے رہ سکتا ہوں، میں آرام کیسے کر سکتا ہوں،
وہ مٹی میں مل گیا ہے،
اور مجھے بھی موت آئے گی اور ہمیشہ کے لیے مٹی میں ملا دے گی
میں موت سے ڈرتا ہوں
پس مجھے اُتناپشتیم تک پہنچنے کا راستہ بتا،

اگر ممکن ہوا تو میں آبِ فنا کو عبور کروں گا،
ورنہ بیابان میں اور دُور تک چلا جاؤں گا۔"

اُرشا بی نے کہا:

"گل گامش! تیرے اپنے ہاتھوں نے تجھے سمندر عبور کرنے سے محروم کر دیا ہے
تُو نے پتھر کی چیزوں کو توڑ ڈالا
تو کشتی کا بچاؤ بھی جاتا رہا۔"

گل گامش نے کہا:

"اُرشا بی! تُو مجھ سے اتنا خفا کیوں ہے؟
حالانکہ تُو سمندر کو دن رات اور ہر موسم میں عبور کرتا ہے"

اُرشا بی نے کہا:

"وہی پتھر تو تھے جن کی بدولت
میں سمندر کو سلامتی سے عبور کر لیا کرتا تھا
اچھا اب تُو جنگل میں جا،
اور اپنے تیشے سے ایک سو بیس شہتیر کاٹ،
ہر شہتیر پینتالیس گز لمبا ہو
ان شہتیروں کو تارکول سے رنگ، اور ان پر شام چڑھا
اور میرے پاس لا۔"

گل گامش نے یہ سُنا تو جنگل میں گیا۔
اُس نے ۱۲۰ شہتیر کاٹے، پینتالیس پینتالیس گز لمبے
انھیں تارکول سے رنگا اور اُن پر شام چڑھائی
اور اُرشا بی کے پاس لایا
تب وہ کشتی میں سوار ہوئے
اور ناؤ سمندر کی لہروں پر تیرنے لگی
وہ تین روز تک یوں چلتے رہے
گویا وہ ایک ماہ پندرہ دن کا سفر تھا
آخر کار اُرشا بی کشتی کو آبِ فنا تک لایا
تب اُرشا بی نے گل گامش سے کہا:

"کشتی چلائے جا، شہتیر کو پانی میں ڈال
مگر تیرے ہاتھ پانی میں بھیگنے نہ پائیں
گل گامش! دوسرا شہتیر لے، تیسرا شہتیر لے، چوتھا شہتیر لے
اب پانچواں، چھٹا، ساتواں شہتیر لے،
اب آٹھواں، نواں، دسواں شہتیر لے
اب گیارھواں اور بارھواں شہتیر لے"
اس طرح گل گامش نے ایک سو بیس شہتیر پانی میں ڈالے
تب گل گامش نے کپڑے اُتار ڈالے
اور اپنے بازوؤں کو مستول کی مانند اُونچا کیا
اور اپنے کپڑوں سے بادبان بنایا۔
پس ملاح اُرشا بنی گل گامش کو اُتناپشتیم کے پاس لایا
جسے سب ساکنِ ماورا کہتے ہیں
اور جو دلمون میں رہتا ہے
جو مشرقِ کوہ میں آفتاب کی رہگذر ہے
دیوتاؤں نے انسانوں میں
بس اُس کو حیاتِ جاودانی عطا کی ہے
اُتناپشتیم آرام سے لیٹا تھا
ناگاہ اُس نے نظر اٹھا کر دُور تک دیکھا
اور اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہنے لگا:
ناؤ بلا رسّے چرخی اور مستول کے کیوں آرہی ہے؟
مقدس پتھر کیوں ٹوٹے ہوئے ہیں؟
اور کشتی کو ملاح کیوں نہیں چلا رہا ہے —؟
وہ جو آرہا ہے میرا آدمی نہیں ہے
مجھے تو ایک ایسا آدمی نظر آرہا ہے
جس کا جسم جانوروں کی کھال سے ڈھکا ہے
یہ کون ہے جو اُرشا بی کے پیچھے پیچھے
ساحل پر آرہا ہے؟

بلاشبہ وہ میرا آدمی نہیں ہے،
پس اُتناپشتیم نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا :
"تیرا نام کیا ہے؛
تو جو جانوروں کی کھال اوڑھے ہوئے ہے
جس کے گال پیچکے ہوئے ہیں
اور منہ لٹکا ہوا ہے
تو نے سمندر کی دشوار گزار راہ کو عبور کر کے
یہ عظیم سفر کیوں اختیار کیا ہے
مجھے اپنے آنے کا باعث بتا۔"
اُس نے جواب دیا :
"گل گامش میرا نام ہے
میں عروق، بیتِ انُو کا رہنے والا ہوں"
تب اُتناپشتیم نے اُس سے سوال کیا :
"اگر تو گل گامش ہے
تو تیرے گال پیچکے ہوئے کیوں ہیں
اور تیرا منہ کیوں لٹکا ہے!
تیرا دل افسردہ کیوں ہے!
اور تیرا چہرہ طویل سفر سے آنے والے کی مانند کیوں ہے؟
ہاں، تیرا چہرہ گرمی اور سردی سے کیوں جھلس گیا ہے!
اور تو ہوا کی تلاش میں بیابانوں کی خاک چھانتا یہاں کیوں آیا ہے!"
گل گامش نے جواب دیا :
"میرے گال پچکے ہوئے کیوں نہ ہوں!
اور میرا منہ کیوں نہ لٹکا ہو؟
میرا دل افسردہ ہے
اور میرا چہرہ طویل سفر سے آنے والے کی مانند ہے۔
ہاں گرمی اور سردی سے جھلس گیا ہے۔
میں کیا بیابانوں کی خاک کیوں نہ چھانوں!

جب کہ میرے دوست، میرے چھوٹے بھائی پر
جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر ہلاک کر دیا
اور دیودار کے بن میں حمبابا کو پچھاڑا
میرے دوست پر جو مجھے بہت عزیز تھا
اور جس نے میرے ہمراہ کتنے ہی خطروں کا مقابلہ کیا
اِن کِدُو، میرے بھائی پر جس کو میں چاہتا تھا
موت قابض ہو گئی ہے۔
میں اُس کے لیے سات دن اور سات رات رویا کیا
یہاں تک کہ اُس کے جسم پر کیڑے رینگنے لگے
اپنے بھائی کے سبب مجھے موت سے ڈر لگتا ہے،
اپنے بھائی کے سبب میں بیابان کی خاک چھانتا ہوں
اس کے انجام سے میرا دل بوجھل ہے۔
میں خاموش کیسے رہ سکتا ہوں، میں آرام کیسے کر سکتا ہوں؟
وہ مٹی میں مل چکا ہے
اور مجھے بھی موت آئے گی اور ہمیشہ کے لیے مٹی میں ملا دے"
گل گامش نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:
"میں نے یہ سفر اُتناپشتیم سے ملنے کی خاطر اختیار کیا ہے
اسی مقصد سے میں نے روئے زمین کی خاک چھانی ہے،
اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھا ہوں،
سمندروں کو عبور کیا ہے
اور چل چل کر اپنے آپ کو تھکا مارا ہے
میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے
اور نیند جو بہت میٹھی ہوتی ہے،
اُس سے میری شناسائی ختم ہو چکی ہے
ابھی میں سدوری کے گھر بھی نہ پہنچا تھا
کہ میرے کپڑے تار تار ہو گئے۔
میں نے ریچھ، لکڑبگھے، شیر، تیندوے، ہرن، چیتیا، بارہ سنگھا،

غرض ہر قسم کے جنگلی جانوروں کا شکار کیا
اور گیا ہستان کی رینگتی چیزوں کو مار کر کھایا
اور ان کی کھال اوڑھی۔
میں اسی حلیہ میں شراب بنانے والی نوجوان عورت کے پھاٹک تک پہنچا
مگر اس نے اپنا ارال اور زنار کول کا پھاٹک مجھ پر بند کر دیا۔
لیکن راستے کی تفصیلات مجھے اسی سے ملیں۔
پس میں ملاح ارشانبی کے پاس گیا
اور اس کے ہمراہ آبِ فنا کو عبور کیا
بزرگ اُتناپشتیم! تو جو دیوتاؤں کے حلقے میں شامل ہو گیا ہے،
میں تجھ سے حیات و موت کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں
میں وہ زندگی کیسے پاؤں
جس کی مجھے تلاش ہے۔؟

اُتناپشتیم نے کہا:

دنیا میں کسی شے کو ثبات نہیں ہے
کیا ہم گھر اس لیے بناتے ہیں کہ وہ ابد تک قائم رہے؟
کیا ہم معاہدے پر مہر اس لیے لگاتے ہیں
کہ وہ دوامی ہو جائے۔
کیا بھائی اپنی موروثی جائداد کو آپس میں اس لیے بانٹتے ہیں
کہ وہ سدا محفوظ رہے۔
کیا دریا میں سیلاب کا موسم ہمیشہ رہتا ہے؟
تی اپنے خول سے نکلتی ہے
اکہ سورج کے چہرے کو بس ایک نظر دیکھ لے
زل سے آج تک کسی چیز کو ثبات نصیب نہیں ہوا ہے۔
وئے اور مرے آدمی میں کتنی مشابہت ہے!
ماری ہوں یا ناری، دونوں کی تقدیر میں فنا ہے،
تے وقت دونوں کی کیفیت یکساں ہوتی ہے۔
[illegible]
[illegible]

تو وہ آپس میں مشورہ کر کے انسان کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں
وہ حیات و موت کا دن مقرر کرتے ہیں
لیکن موت کا دن کسی پر ظاہر نہیں کرتے "
تب گل گامش نے اُتناپشیتم، ساکن ماورا سے کہا :
اُتناپشیتم! میں تجھے دیکھتا ہوں
تو مجھے تیری ظاہرا شکل و صورت اپنے سے مختلف نظر نہیں آتی
میرے جسم میں کوئی عجیب یا انوکھی بات نہیں ہے۔
میں نے سوچا تھا کہ تو بھی کوئی سورما ہوگا، دَرپے جنگ
مگر تُو تو اپنی پیٹھ کے بل زمین پر آرام سے لیٹا ہے
سچ بتا، تُو دیوتاؤں کے حلقے میں کیسے پہنچا
اور تجھے حیاتِ ابدی کیسے ملی؟"
اُتناپشیتم نے گل گامش سے کہا :
" میں سِرِ نہاں کو تجھ پر عیاں کروں گا
اور دیوتاؤں کا ایک راز تجھے بتاؤں گا "

پانچواں باب

سیلابِ عظیم

" تم شُروپاک سے تو واقف ہو گے؟
یہ شہر دریائے فرات کے کنارے واقع ہے۔
پھر یوں ہوا کہ وہ شہر پُرانا ہو گیا اور اُس کے دیوتا بھی بوڑھے ہو گئے۔
وہاں اَنُو تھا، مالکِ کائنات۔ اور اُس شہر کا آقا۔
اور جنگ کا دیوتا اِن لِیل شہر والوں کا مشیر تھا
ننورتا اُن کا معاون تھا
اور اِنّوگی اُن کی نہروں کا نگہبان،
اور اُن کے ہمراہ اِیا بھی تھا۔
پرانے زمانے میں روئے زمین پر ہر چیز کی بہتات تھی،

آبادی بڑھتی جاتی تھی
اور زمین جنگلی سانڈ کی مانند ڈکارتی تھی۔
عظیم دیوتا اِس شور و غل سے چونک پڑا
انلیل نے یہ ہنگامہ سُنا
تو دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ سے کہا:
"بنی نوعِ انسان کا شور و غل برداشت سے باہر ہو گیا ہے
اور ان کی ہمہمہ کے باعث اب سونا محال ہے۔"
پس دیوتاؤں کے دل میں سیلاب کا خیال آیا،
لیکن میرے آقا اِیا نے مجھے خواب میں خبردار کر دیا
اُس نے دیوتاؤں کی باتیں چپکے سے میرے جھاؤ کے گھر کو بتا دیں،
جھاؤ کے گھر، جھاؤ کے گھر!

دیوار، او دیوار!
جھاؤ کے گھر! میری سُن،
دیوار! غور سے سُن۔
او شروپاک کے انسان، اوبارا توتو کی اولاد!
اس گھر کو ڈھا دے اور ایک کشتی بنا،
اپنے اثاثے اور املاک سے کنارہ کش ہو جا

اور اپنی جان کی فکر کر،
دنیاوی چیزوں کو حقیر سمجھ
اور اپنی روح کو موت سے بچا۔
اپنا مکان مسمار کر دے
اور میں کہتا ہوں کہ ایک کشتی بنا۔
تیرے جہاز کا ناپ یہ ہو
اُس کی چوڑائی اس کے طول کے برابر ہو
اُس کے عرشے کی چھت محرابی ہو
اس قوس کی مانند جو عالمِ زیریں کو ڈھانپے ہوئے ہے
تب تمام جاندار مخلوق کے تخم کشتی میں رکھ دے

میں اُس کی بات سمجھ گیا اور میں نے اپنے آقا سے کہا :
"دیکھ میرے خداوند ! میں تیرا حکم بجا لاؤں گا
لیکن میں لوگوں کو، شہر کو، بڑوں کو کیا جواب دوں؟
تب ایا نے اپنا منہ کھولا اور مجھ غلام سے مخاطب ہوا :
" اُن سے کہہ دے کہ مجھے معلوم ہوا ہے
کہ ان لیل مجھ سے بہت خفا ہے
پس میری مجال نہیں کہ اُس کے ملک میں چلوں پھروں
یا اُس کے شہر میں رہوں
میں اپنے آقا ایا کے پاس رہنے کی خاطر
خلیج کے خطے کی راہ لوں گا
البتہ وہ تم پر فراوانی کی بارش کرے گا
اور نایاب مچھلیاں اور منتخب پرندے بھیجے گا،
اور لہریں اٹھیں گی جو فصلوں کے لیے مفید ہوں گی
اور شام کے وقت طوفان کا راکب تم پر گندم برسائے گا۔"
طلوع سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ میرے گھر کے لوگ میرے گرد جمع ہوئے
بچے رال لے آئے اور مرد ضرورت کی دوسری چیزیں
پانچویں دن میں نے جہاز کا پیندا بنایا اور خمدار کڑیاں جوڑیں،
اور تب میں نے تختہ بچھایا
جہاز کی نچلی منزل کا رقبہ ایک ایکڑ تھا
اور بالائی عرشہ ہر چہار جانب ساٹھ گز تھا
اُس کے نیچے میں نے چھ طبقے بنائے، کُل سات۔
اور اُن کو میں نے نو طبقوں میں تقسیم کر دیا
اور حسبِ ضرورت پچر بھی ڈالے۔
میں نے چپوؤں اور رسے شہتیروں کا بندوبست بھی کر لیا
اور ضرورت کی سب چیزیں فراہم کر لیں
باربردار پیپوں میں تیل سے آئے
میں نے تارکول ڈامر اور تیل کو بھٹی میں ڈالا

جہاز کی درزیں بند کرنے میں بہت سا تیل خرچ ہوا
اور تیل کی کافی مقدار جہاز کے داروغہ نے گودام میں رکھ لی۔
میں لوگوں کے لیے ہر روز بیل اور بھیڑیں ذبح کرتا۔
میں جہاز کے کاریگروں کو شراب اس فراخدلی سے پلاتا
گویا وہ دریا کا پانی تھا۔ اور تازہ شراب، سُرخ انگوری شراب
اور سفید انگوری شراب نہ تھی۔
نائے و نوش کا جشن ہوتا
جیسے نئے سال کے تیوہار پر منایا جاتا ہے
خود میں نے اپنے سر میں تیل گرایا۔
ساتویں دن کشتی تیار ہو گئی۔
مگر اتنے بڑے جہاز کو دریا میں لانا آسان کام نہ تھا
توازن کو قائم رکھنے کے لیے بھرت کو اوپر نیچے منتقل کیا گیا
یہاں تک کہ جہاز کا دو تہائی حصہ سطحِ آب سے نیچے ہو گیا۔
میں نے سونا چاندی، زندہ مخلوق، گھر کے لوگ، عزیز رشتہ دار
مویشی، جنگلی اور پالتو جانور، اور سب کاریگروں کو
جہاز میں بھر لیا۔
کیونکہ شمس نے جو وقت مقرر کیا تھا
وہ گذر چکا تھا۔
شمس نے کہا تھا:
"شام کے وقت جب طوفان کا مالک زمین پر
تباہ کرنے والی بارش بھیجنے لگے
تو جہاز میں بیٹھ جانا اور جہاز کے دروازے، کھڑکیاں بند کر دینا"
وقت ہو چکا تھا۔
تب شام ہوئی اور طوفان کے مالک نے بارش شروع کی
میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو موسم نہایت خطرناک تھا
تب میں بھی جہاز میں سوار ہو گیا اور دروازے کو بند کر دیا
اب سارا انتظام مکمل تھا، جہاز چھوڑ دیا گیا تھا

اور دوزیں بھری جا چکی تھیں۔
پس میں نے پتوار اور دیگر آلات جہازراں پوزور اموری کے حوالے کیے
اور جہاز کی تقدیر بھی اُس کے سپرد کر دی۔
طلوعِ سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ افق پر پارۂ ابر نمودار ہوا
طوفان کا آقا اَداد اُس کے اندر گرجنے لگا
شلات اور حنیش، طوفانوں کے نقیب آگے آگے، کوہ و بیابان میں
منادی کراتے جاتے تھے۔
پاتال کے دیوتا بھی جاگ اُٹھے۔
نرگل نے سفلی دریاؤں کے بند کھول دیے
جنگ کے دیوتا ننورتا نے پشتوں کو توڑ دیا
اور ساتوں قاضیوں —— انوناکی —— نے اپنی مشعلیں بلند کیں
جن کے شعلوں کی روشنی سے ساری دنیا میں اُجالا ہو گیا
اور جب اداد نے روشنی کو تاریکی میں بدل دیا
اور زمین کو پیالے کی مانند پاش پاش کر دیا
تو زمین سے آسمان تک مایوسی اور گھبراہٹ پھیل گئی
طوفان سارا دن شور مچاتا رہا
اور اُس کی برہمی ہر لمحے بڑھتی رہی،
طوفان کے تھپیڑے فوجی حملوں کی مانند لگتے رہے۔
بھائی اپنے بھائی کو دیکھ نہ سکتا تھا
اور زمین کے رہنے والے آسمان سے بھی نظر نہ آتے تھے
یہاں تک کہ سیلاب نے دیوتاؤں کو بھی دہشت زدہ کر دیا
اور انھوں نے فلک الافلاک پر انو کے پاس پناہ لی
وہ دیواروں کی آڑ میں ڈرپوک کتے کی مانند دبکے کھڑے تھے
تب شیریں آواز ملکۂ فلک، عشتار چیخنے لگی
جیسے حاملہ عورت دردِ زہ میں چیختی ہے
حیف کہ پرانے دن خاک میں مل گئے
کیونکہ میرا مطالبہ شر انگیز تھا۔

میں نے لوگوں کی تباہی کے لیے جنگ کا مطالبہ کیا تھا
مگر کیا یہ میری اولاد نہیں ہیں ؟
کیا میں نے اِن کو پیدا نہیں کیا !
اور اب وہ مچھلی کے انڈوں کی مانند سمندر میں تیر رہے ہیں
جنّت اور جہنّم کے عظیم دیوتا بھی اپنے منہ پر ہاتھ رکھے رو رہے تھے
چھ دن اور چھ رات آندھی چلتی رہی
بارش طوفان اور سیلاب نے دنیا پر غلبہ پا لیا تھا
اور طوفان اور سیلاب کا شور متصادم فوجوں کی مانند تھا۔
مگر ساتویں دن طلوع ہوا تو جنوبی طوفان ختم گیا،
سمندر پُرسکون ہو گیا
اور سیلاب رُک گیا
میں نے روئے زمین پر نگاہ دوڑائی
تو وہاں کامل سکوت تھا اور انسان مٹی کا ڈھیر بن گئے تھے
سمندر کی سطح مکان کی چھت کی طرح ہموار تھی،
میں نے کھڑکی کا پٹ کھولا تو روشنی میرے منہ پر پڑی۔
تب میں جھک گیا، پھر بیٹھ کر رونے لگا
آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے
کیونکہ ہر چہار سمت پانی ہی پانی تھا
میں عبث خشکی ڈھونڈ رہا تھا
لیکن اکیس کوس کے فاصلے پر مجھے ایک پہاڑ نظر آیا
اور میری کشتی وہاں جا لگی
میری کشتی کوہِ نصیر پر رُک گئی
اور پھر ہلنے نہ پائی۔
کشتی ایک دن کوہِ نصیر پر جمی رہی

لے یہ غالباً وہی پہاڑ ہے جس کا سلسلہ جنوبی زاب تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ انجیل کا کوہِ ارارات بھی ہو سکتا
جھیل وان کے شمال میں واقع ہے۔

کشتی دوسرے دن بھی کوہِ نصیر پر جمی رہی
تیسرے اور چوتھے دن بھی وہیں جمی رہی
پانچویں اور چھٹے دن بھی وہیں جمی رہی۔
ساتواں دن طلوع ہوا تو میں نے ایک فاختہ کو آزاد کیا
وہ اُڑ گئی مگر اُسے بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی
اور وہ واپس آ گئی۔
تب میں نے ایک ابابیل کو آزاد کیا
وہ اُڑی مگر بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ پا کر واپس آ گئی۔
تب میں نے ایک کوّے کو آزاد کیا
اُس نے دیکھا کہ پانی پیچھے ہٹ گیا ہے
پس اُس نے اپنا پیٹ بھرا، اِدھر اُدھر اُڑتا
اور کاؤں کاؤں کرتا رہا
مگر واپس نہ آیا
تب میں نے جہاز کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں
میں نے قربانی کی اور پہاڑ کی چوٹی پر شراب لنڈھائی
میں نے سات اور سات دیگچے چولہے پر رکھے،
اور لکڑی، بید، دیودار اور حنا کا انبار لگایا
ان کی خوشبو دیوتاؤں تک پہنچی
تو وہ مکھیوں کی طرح چڑھاوے کے گرد جمع ہو گئے۔
آخر عشتار بھی وہاں آئی
اور اس نے اپنے گلے کے ہار کو اونچا کیا،
آسمانی نگینوں کا یہ وہی ہار تھا
جس کو کسی زمانے میں اَنُو نے عشتار کو خوش کرنے کی خاطر تیار کیا تھا
" دیوتاؤ، جو یہاں موجود ہو!
اس لاجورد کی قسم جو میرے گلے میں پڑا ہے،
میں ان ایام کو اُسی طرح یاد رکھوں گی
جس طرح میں ان جواہرات کو یاد رکھتی ہوں

جو میرے گلے میں پڑے ہیں
گذشتہ دنوں کو میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گی
ان لیل کے سوا، سب دیوتا قربانی کے گرد جمع ہوں۔
اُسے چڑھاوے کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے
کیونکہ وہ بلا سوچے سمجھے یہ سیلاب لایا
اُس نے میرے آدمیوں کو مفت میں بھینٹ چڑھا دیا۔"

جب ان لیل آیا

تو جہاز کو دیکھ کر وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا
اور آسمانی دیوتاؤں پر بہت خفا ہوا :
کیا ان فانیوں میں سے کوئی زندہ بھی بچ رہا ہے ؟
اِس بربادی سے تو کسی ایک فرد کو بھی زندہ نہیں بچنا تھا۔"
تب کنوؤں اور نہروں کے دیوتا ننورتا نے اپنا منہ کھولا
اور ان لیل سے کہا :
" دیوتاؤں میں کون ہے جو ایا کے مشورے کے بغیر فیصلے کرے ؟
فقط ایا دانائے کل ہے۔"
تب ایا نے اپنا منہ کھولا اور سورما ان لیل سے کہا :
" عاقل ترین دیوتا ! سورما ان لیل !
تو نے بے خیالی میں سیلاب لا کر کیا غضب کیا
گنہگار کا گناہ اُس کے منہ پر مار
جرم کرنے والے کو اُس کے جرم سے آگاہ کر
اور جب وہ حد سے تجاوز کرنے لگے تو اُسے تھوڑی سزا بھی دے
مگر اُسے اتنا نہ ستا کہ وہ ہلاک ہو جائے
کاش سیلاب کے بجائے شیر نے انسانوں پر حملہ کیا ہوتا
کاش سیلاب کے بجائے کسی بھیڑیے نے انسانوں پر حملہ کیا ہوتا
کاش سیلاب کے بجائے قحط نے دنیا کو ویران کیا ہوتا
کاش سیلاب کے بجائے کسی وبا نے انسانوں کو ہلاک کیا ہوتا
وہ میں نہیں تھا

جس نے دیوتاؤں کا راز فاش کیا
فانی انسان تو اس راز سے خواب میں آگاہ ہوا تھا
اب آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کرو
کہ اس انسان کا کیا کیا جائے "

تب اِن لیل جہاز پر آیا۔
اُس نے مجھے اور میری بیوی کو ہاتھ سے پکڑا
اور جہاز کے اندر لے گیا
خود درمیان میں کھڑا ہوا اور ہمیں اپنے دائیں بائیں
رکوع میں جانے کا حکم دیا۔
اُس نے ہماری پیشانی چھوئی
اور ہمیں برکت دی :
" ماضی میں اُتناپشیتم ایک فانی انسان تھا
آئندہ وہ اور اُس کی بیوی یہاں سے دور دریاؤں کے دہانے پر
رہیں گے "
پس دیوتاؤں نے مجھے اپنی پناہ میں لیا
اور اس دور دراز مقام پر،
دریاؤں کے دہانے پر، رہنے کا حکم دیا۔"

چھٹا باب

مراجعت

اُتناپشیتم نے کہا :
" گلگامش ! تیری خاطر کون دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ بلائے گا !
تاکہ تجھے وہ زندگی نصیب ہو جس کی تجھے تلاش ہے،
مگر تو چاہے تو آزما دیکھ
بس تجھے چھ دن اور سات راتیں نیند پر قابو پانا ہوگا "
لیکن گلگامش کونے کے بل آرام کر رہا تھا
کہ نیند کی دھند

دُھنکے ہوئے نرم اُون کی مانند اُس کے اُوپر لہرانے لگی
اور اُتناپشتیم نے اپنی بیوی سے کہا:
"ذرا اس کو دیکھ!
یہ مردِ قوی حیاتِ ابدی کا طلبگار تھا
لیکن نیند کی دُھند اس پر ابھی سے لہرا رہی ہے"
اُس کی بیوی نے جواب دیا:
"اس آدمی کو چھو کر جگا دو
تاکہ وہ اپنے ملک کو سلامتی سے واپس چلا جائے
اُسی پھاٹک کی راہ جس سے وہ آیا تھا"
اُتناپشتیم نے اپنی بیوی سے کہا:
"سب انسان دھوکے باز ہوتے ہیں
یہاں تک کہ تو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرے گی۔
پس ہر روز ایک روٹی پکا کر اس کے سرہانے رکھتی جا
اور اُس کے ایامِ خواب کا شمار کرنے کی خاطر
ہر روز دیوار پر ایک نشان بھی بناتی جا"
پس اُس نے روٹیاں پکائیں:
اور ہر روز ایک روٹی گلگامش کے سرہانے رکھتی گئی
اور ایامِ خواب کی گنتی کے لیے ہر روز دیوار پر ایک نشان لگاتی گئی۔
اور اتنے دن گذر گئے کہ پہلی روٹی پتھر کی طرح سخت ہو گئی،
اور دوسری روٹی چمڑے کی مانند۔
تیسری روٹی پھیل گئی،
چوتھی کی پرت پر پھپھوندی لگ گئی
پانچویں پر سبزی جھلکنے لگی
مگر چھٹی روٹی تازی تھی
اور ساتویں چولہے پر تھی،
تب اُتناپشتیم نے اُسے چھو کر جگایا اور وہ جاگ اٹھا
گلگامش نے اُتناپشتیم [illegible] سے کہا:

"ابھی میری آنکھ بھی نہ لگی تھی کہ
تو نے مجھے چھو کر جگا دیا"

لیکن اُتناپشتیم نے جواب دیا :
"اِن روٹیوں کو شمار کر
تب تو جان جائے گا کہ تو کتنے دن تک سوتا رہا ہے۔
کیونکہ پہلی روٹی پتھر کی مانند سخت ہے،
دوسری روٹی چمڑا ہو گئی ہے،
تیسری روٹی سیلی ہے
چوتھی کی پرت پر پھپھوندی لگ چکی ہے
پانچویں کا رنگ سبز ہو رہا ہے
چھٹی روٹی تازی ہے
اور ساتویں روٹی ابھی چولہے پر تھی
کہ میں نے تجھے چھو کر جگایا"

گِل گامش نے کہا :
"اُتناپشتیم! میں کیا کروں، کدھر جاؤں؟
رات کا چور ابھی سے میرے اعضا پر مسلط ہے،
موت میرے گھر میں بیٹھ گئی ہے
اور میرا پاؤں جہاں رُکتا ہے
مجھے موت ہی دکھائی دیتی ہے"
تب اُتناپشتیم اُرشانبی ملاح سے مخاطب ہوا :
"اُرشانبی! تیرا بُرا ہو!
یہ بندرگاہ، اب اور اب سے سدا تجھ سے نفرت کرے گی
تجھ کو اس بندرگاہ پہ آنا اور سمندر کو پار کرنا منع ہے۔
اس ساحل سے دھتکارے ہوئے ملاح، یہاں سے چلا جا،
لیکن اس آدمی کو، جو تیرے پیچھے پیچھے چلا تھا،
جس کو تو یہاں لایا تھا،
جس کا بدن گندگی سے ڈھپا ہے،

اور جس کے اعضا کا حسن جنگلی کھالوں نے چھپا رکھا ہے،
اس کو نہانے کے گھاٹ پر لے جا،
وہاں وہ اپنے لمبے بالوں کو دھو کر برف کی طرح صاف کرے گا،
اپنی کھال کی پوشاک کو پھینک دے گا
جسے سمندر بہا لے جائے گا
اور اُس کے بدن کا حُسن نکھر آئے گا
اس کی پیشانی پر نیا فیتہ لگے گا
اور اُس کی عریانی کو ڈھانکنے کے لیے نئے کپڑے ملیں گے
جب تک وہ اپنے شہر نہ پہنچ جائے گا
اور اُس کا سفر تمام نہ ہو گا
یہ کپڑے جوں کے توں نئے رہیں گے۔"
پس اُرشابی گل گامش کو گھاٹ پر لے گیا
اور گل گامش نے اپنے لمبے بالوں کو دھو کر برف کی طرح صاف کیا
اُس نے اپنی چرمی پوشاک پھینک دی
جسے سمندر بہا لے گیا
اور اُس کے بدن کا حُسن نکھر آیا۔
اُس نے اپنی پیشانی کا فیتہ بدل ڈالا
اور عریانی کو ڈھانکنے کے لیے نئی پوشاک پہن لی
جو اُس وقت تک جوں کی توں نئی رہنے والی تھی،
جب تک وہ اپنے شہر میں نہ پہنچے گا
اور اُس کا سفر تمام نہ ہو گا۔
تب گل گامش اور اُرشابی نے ناؤ کو پانی میں ڈالا
اور اُس میں بیٹھ گئے اور روانگی کے لیے تیار ہو گئے
لیکن اُتناپشتیم ساکن ماوراء کی زوجہ نے اُس سے کہا:
"گل گامش یہاں کتنی مصیبتیں اُٹھا کر تھکا ماندا آیا تھا
تو اُسے اپنے دیس سے جانے کے لیے کیا چیز دے گا؟"
پس اُتناپشتیم نے گل گامش کو آواز دی

اور گل گامش نے ایک شہتیر اُٹھا لیا
اور کشتی کو ساحل پر لایا
"گل گامش! تو یہاں تھکا ماندہ آیا تھا،
اب میں تجھے کیا چیز دوں
جسے لے کر تو اپنے دیس کو جائے
گل گامش! میں ایک خفیہ بات تجھ پر ظاہر کرتا ہوں
اور یہ اسرار خداوندی ہے جو میں تجھے بتاؤں گا:
ایک بوٹا ہے جو پانی کے اندر اُگتا ہے۔
وہ گلاب کی مانند خاردار ہے
وہ تیری انگلیوں کو لہو لہان کر دے گا
لیکن تو اِس بوٹے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے
تو تیرے ہاتھوں میں وہ شے ہو گی
جس سے انسان کا شباب رفتہ لوٹ آتا ہے
گل گامش نے جونہی یہ سُنا،
بند کھول دیا تاکہ میٹھے پانی کا دھارا اُسے گہرائی میں لے جائے
اُس نے اپنے پاؤں میں بھاری بھاری پتھر باندھے
اور یہ پتھر اُسے پانی کی تہ تک لے گئے۔
وہاں اُس نے یہ پودا دیکھا
پودے نے اُسے لہو لہان کر دیا
لیکن اُس نے پودے کو ہاتھ سے پکڑ لیا
اور پتھروں کو پاؤں سے الگ کر دیا
اور سمندر اُسے بہا کر ساحل پر لے آیا
گل گامش نے اُرشانبی ملاح سے کہا:
"اِدھر آ اور اس عجیب و غریب پودے کو دیکھ!
اس کی تاثیر سے انسان اپنی زائل شدہ طاقت واپس لا سکتا ہے۔
میں اِسے مضبوط دیواروں والے عروک میں لے جاؤں گا
اور یہ پودا بوڑھوں کو کھانے کے لیے دوں گا

اس کا نام "بوڑھے دوبارہ جوان ہو جاتے ہیں" ہو گا
اور تب میں بھی اسے کھاؤں گا
اور میری گذری ہوئی جوانی واپس آ جائے گی۔"
پس گل گامش اُسی پھاٹک سے واپس ہوا
جس سے وہ آیا تھا
اور اُرشابی اُس کے ہمراہ تھا۔
وہ تیس کوس تک چلتے رہے
اور تب انھوں نے اپنا فاقہ توڑا
اور پینتالیس کوس کے بعد وہ رات گذارنے کے لیے ٹھہر گئے۔
گل گامش نے ٹھنڈے پانی کی ایک باؤلی دیکھی
تو اُس میں اُترا اور نہانے لگا
باؤلی میں ایک سانپ رہتا تھا
اُس نے پھول کی میٹھی خوشبو سونگھ لی
وہ پانی سے نکلا اور پودے کو ہڑپ کر گیا۔
فوراً ہی اس نے اپنی کینچلی اُتار دی
اور باؤلی میں واپس چلا گیا
تب گل گامش بیٹھ کر رونے لگا
آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے
اور اس نے اُرشابی کا ہاتھ پکڑ لیا
"اُرشابی! کیا اسی دن کے لیے میرے ہاتھوں نے اتنی محنت کی تھی؟
کیا اسی دن کے لیے میں نے اپنا دل خون کیا تھا؟
مجھے تو کچھ بھی حاصل نہ ہوا —
مجھے نہیں البتہ زمین کے ایک کیڑے کو میری محنت کا پھل ملا ہے
پانی کی لہر پودے کو تیس کوس دُور
اُسی جگہ واپس لے جائے گی جہاں میں نے اُسے پایا تھا۔
مجھے ایک نشانی ملی تھی مگر میں نے اُسے بھی کھو دیا۔
آ، ہم کشتی کو ساحل پر چھوڑ دیں اور یہاں سے چلے جائیں۔"

تیس کوس کے بعد انھوں نے فاقہ توڑا
اور پچاس کوس کے بعد وہ رات گذارنے کے لیے ٹھہر گئے
تین دن میں انھوں نے ایک مہینہ پندرہ دن کا سفر طے کیا
سفر تمام ہوا تو وہ عروق میں داخل ہوئے، مضبوط دیواروں والے شہر میں۔
گل گامش نے اُرشابی ملاح سے کہا :
" اُرشابی، عروق کی دیوار پر چڑھ
اُس کے بنیادی چبوترے کو غور سے دیکھ
اور چنائی کو جانچ
کیا یہ چنائی پکی اینٹوں سے نہیں ہوئی ہے ؟
اور کیا سات عاقلوں نے اُس کی نیو نہیں رکھی تھی ؟
شہر کا ایک تہائی حصّہ آبادی ہے ،
ایک تہائی باغ ہے
اور ایک تہائی کھیت
پھر عشتار دیوی کے حدود ہیں۔
یہ سب حصّے اور حدود عروق کے ہیں "
شہر کی تعمیر بھی بادشاہ گل گامش ہی کا کارنامہ تھا ،
وہ جس کو روئے زمین کے سب ملکوں کی خبر تھی
وہ عاقل تھا۔ واقفِ اَسرار اور حاملِ راز۔
وہ ہمارے لیے سیلاب سے پیشتر کی ایک داستان لایا۔
وہ ایک طویل سفر پر گیا
اور جب خستہ و درماندہ واپس ہوا
تو اس نے پوری داستان ایک پتھر پر کندہ کروا دی۔

ساتواں باب
گل گامش کا انجام

دیوتاؤں کے دیوتا، اِن لیل کوہستانی نے
گل گامش کی جو تقدیر لکھی تھی

وہ پوری ہوئی

"پاتال کا اندھیرا اُسے روشنی دکھلائے گا۔
پُشتہا پُشت تک نسلِ انسانی اس کی یادگار کا جواب نہ پیش کر سکے گی —
نئے چاند کی مانند سورماؤں اور دانش مندوں کی تقدیر میں بھی
عروج اور زوال لکھا ہوتا ہے —
مگر دنیا والے کہیں گے :
"کون ہے جس نے گل گامش کی مانند
طاقت اور جبروت سے حکومت کی ؟
اُس کے بغیر روشنی گم ہے ،
جیسے اندھیری راتوں میں ،
پرچھائیوں کے سینے میں
گل گامش ! تیرے خواب کی تعبیر یہی تھی ۔
تیری تقدیر میں بادشاہی لکھی تھی
مگر حیاتِ ابدی تیری قسمت میں نہیں تھی
لیکن اس کے باعث دل گرفتہ مت ہو ،
غم نہ کر اور نہ پریشان ہو۔
اُس نے تجھے بست و کشاد کی طاقت بخشی ہے ،
تُو انسان کا نور اور اس کی ظلمت ہے ۔
اُس نے تجھے انسانوں پر بے مثال اقتدار عطا کیا ہے
اور اُن لڑائیوں میں فتحیاب بنایا ہے
جن سے گریز پا بھی بھاگ نہیں سکتا تھا
اور اُن یورشوں اور یلغاروں میں سُرخ رُو کیا ہے
جن سے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا
لیکن اس قوت کو بے جا استعمال نہ کر ،
اپنے محل کے ملازمین سے انصاف کر
اور شمس کے رُوبرو عدل سے پیش آ۔"

بادشاہ نے اپنے آپ کو گرا دیا ہے

اور اب وہ کبھی نہ اُٹھے گا
آقائے کُلاب اب کبھی نہ اُٹھے گا
اُس نے شر پر قابو پایا
مگر وہ اب کبھی نہ اُٹھے گا
اس کے بازو قوی تھے مگر وہ اب کبھی نہ اُٹھے گا
اُس میں دانائی اور دلکشی تھی
مگر وہ اب کبھی نہ اُٹھے گا
وہ پہاڑوں میں چلا گیا ہے
اور اب کبھی نہ اُٹھے گا
وہ تقدیر کے بستر پر لیٹا ہے
اور اب کبھی نہ اُٹھے گا
بوقلمونی بستر سے اب وہ کبھی نہ اُٹھے گا
شہر کے چھوٹے بڑے، سبھی لوگ نوحہ کناں ہیں،
وہ بَین کر رہے ہیں
گوشت اور خون کے سبھی انسان بَین کر رہے ہیں
تقدیر آواز دے چکی ہے،
اور گِل گامش کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کی مانند
بستر پر پڑا ہے
پھندے میں گرفتار غزال کی مانند
بیدرد نمتار اُس پر چڑھا بیٹھا ہے
نمتار جس کے نہ ہاتھ ہیں نہ پاؤں،
جو نہ پانی پیتا ہے نہ گوشت کھاتا ہے
ننسون کے بیٹے گِل گامش کے لیے
اُس کی چہیتی بیوی نے، اُس کے بیٹے، اُس کی داشتہ نے،
اُس کے موسیقاروں نے، اس کے درباری مسخرے غرض گھر بھر نے
اپنے اپنے چڑھاوے وزن کیے۔
اس کے ملازموں، ہوار دعون، اُس کے محل کے سب لوگوں نے

نِن سون کے بیٹے گل گامش کے لیے اپنے اپنے چڑھاوے وزن کیے،
انھوں نے یہ چڑھاوے ملکۂ قضا، ایرش کی گل کو پیش کیے
اور مُردوں کے سبھی دیوتاؤں کو
پھاٹک کی پاسبان نیتی کے لیے روٹی،
سانپ کے دیوتا نِن گزی دا[1] کے لیے روٹی،
اور نوجوان گڈریے دُموزی کے لیے بھی
اِنکی[2] اور نِن کی[3] کے لیے، اِن دُوکوگا[4] اور نِن دُوکوگا[5] کے لیے،
اِن مُول اور نِن مُول کے لیے
تمام آبائی دیوتاؤں کے لیے
اِن لِیل کے آباؤ اجداد کے لیے
ضیافت کے دیوتا شُل پائی کے لیے
گلوں کے دیوتا سُموقان کے لیے
ماں نِن ہُورساگ[6] اور تخلیق کے دیوتاؤں کے لیے درجہ بدرجہ،
میزبانِ فلک، پروہت اور پروہتن کے لیے
مُردے کا چڑھاوا وزن کیا گیا۔
گل گامش، نِن سون کا بیٹا، قبر میں لیٹا ہے۔
اُس نے قربان گاہ پر روٹی کی نذر چڑھائی
شراب ٹپکانے کی جگہ پر اُس نے شراب ٹپکائی۔

---

[1] نِن گزی دا زرخیزی کے دیوتاؤں میں سے ہے۔ اُسے "شجرِ حیات کا آقا" بھی کہتے ہیں۔ اُس کا سر انسانوں جیسا اور بقیہ جسم سانپ جیسا ہے۔ وہ سحر اور شفا کا دیوتا بھی ہے۔ وہ تموز کا رفیق بھی ہے جو جنت کے پھاٹک پر تموز کے ہمراہ کھڑا رہتا ہے۔

[2] اِن کی زمین اور زرخیزی کا دیوتا ہے [3] نِن کی اِن لِیل دیوتا کی ماں ہے

[4] سُومیریوں کا آبائی دیوتا جو پاتال میں رہتا ہے

[5] سُومیریوں کا آبائی دیوتا جو پاتال میں رہتا ہے

[6] سُومیریوں کی ماتا دیوی۔ سُومیریوں کے چار بڑے خداؤں (آن، اِن لِیل، اِن کی) میں سے ایک۔ وہ بعض اوقات اِن کی کی زوجہ کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ زمین پر ہریالی اُسی نے پیدا کی۔ اُسے "زمین تو" ولادت کی دیوی اور "کی" یعنی زمین بھی کہتے ہیں۔ نِن ہُورساگ کے لفظی معنی "ماں" ہیں۔

اور یوں ہوا کہ انھیں مرفوں آقا گل گامش بن سون کا بیٹا کوچ کر گیا
بے نظیر بادشاہ، جس کا انسانوں میں جواب نہ تھا
جس نے اپنے آقا ان لیل کو فراموش نہ کیا۔
ستائش بے حساب گل گامش آقائے گلاب کی ۔

ضمیمہ

گل گامش اور اگّا

گل گامش اور اگّا فرمانروائے کیش کی داستان کا یہ متن چھ لوحوں سے مرتب ہوا ہے۔ ان میں سے پانچ لوحیں نیفر کی کھدائی میں نکلی تھیں۔ یہ سب لوحیں دو ہزار قبل مسیح کی ہیں لیکن اس نظم کا عہد تصنیف متعین نہیں ہو سکا ہے۔ اس نظم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک تاریخی واقعہ کو سومیری دیومالا سے بالکل آزاد ہو کر نظم کیا گیا ہے۔ گل گامش کی دوسری نظموں کے برعکس اس نظم میں دیوی دیوتا موجود نہیں اور فوق فطرت کارناموں کا تذکرہ ہے۔ اس نظم کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ اس سے سومیر کی شہری ریاستوں کے ابتدائی دور کی سیاسی کشمکش پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار اس نظم میں مجلس شوریٰ کا ذکر ہوا ہے۔ اور یہ نظم سومیری زبان میں ہے۔ اشور بنی پال کے محرروں نے جب گل گامش کی داستان بارہ لوحوں پر اکادی زبان میں قلم بند کی تو انھوں نے اس نظم کو اپنے نسخے میں شامل نہیں کیا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ نظم انھیں دستیاب ہی نہ ہوئی ہو، یا انھوں نے اس نظم کو اس وجہ سے مسترد کر دیا کہ اس کا جوڑ گل گامش کی بقیہ نظم کے ساتھ نہیں ملتا۔

ان مے براگ گیسی کے بیٹے اگّا نے کیش سے
اپنے سفیر گل گامش کے پاس عروق بھیجے
گل گامش نے ان کا یہ پیغام عمائدین شہر کے روبرو رکھا:
کیش[1] کے کنوئیں تیار کرو
ریاست بھر کے کنوؤں کو مکمل کرو

---

[1] سامیانی زبان کا مفہوم پروفیسر جیکوب سن کے قیاس کے مطابق یہ ہے کہ کیش نے اہل عروق سے زرعی کاموں کیلئے بیگار طلب کی تھی۔

کنوؤں اور زمین کے چھوٹے پیالوں[1] کی تکمیل کرو
کنوؤں کی کھدائی کرو
اور باندھنے والے رسّوں کو مکمل کرو"
(گل گامش رائے دیتا ہے کہ)
ہم کو خانوادۂ کیش کی اطاعت نہیں کرنی چاہئے
بلکہ اُس پر اسلحوں سے ضرب لگانی چاہئے
عمائدینِ شہر کی مجلس شوریٰ جواب دیتی ہے کہ
"ہم کنوؤں کو مکمل کر دیں
ارضِ کیش کے تمام کنوؤں کو مکمل کر دیں
کنوؤں اور زمین کے چھوٹے پیالوں کو مکمل کر دیں
کنوئیں کھودیں اور باندھنے والے رسّوں کو مکمل کر دیں
ہم کو خانوادۂ کیش کی اطاعت کر لینی چاہئے
اور اُس پر اپنے اسلحوں سے ضرب نہیں لگانی چاہئے
گل گامش، آقائے کلاب، نے
جو اِنانا کی خاطر عظیم کارنامے سرانجام دیتا ہے
عمائدینِ شہر کی باتوں کو دل میں جگہ نہ دی
اُس نے یہ مسئلہ شہر کے لوگوں کے سامنے رکھا
اور یہ رائے ظاہر کی کہ
"کنوؤں کی تکمیل کا تقاضہ یہ ہے،
ارضِ عوق کے تمام کنوؤں کی تکمیل کا تقاضا یہ ہے
کنوؤں اور زمین کے چھوٹے پیالوں کی تکمیل کا تقاضا یہ ہے
کنوؤں کی کھدائی کا تقاضا یہ ہے
رسّوں کے باندھنے کا تقاضا یہ ہے
کہ ہم خانوادۂ کیش کی اطاعت نہ کریں
بلکہ اُس پر اپنے اسلحوں سے ضرب لگائیں"

---

[1] غالباً پانی کی باؤلی یا گڑھے مراد ہے۔
[2] مطلب یہ ہے کہ کیش کا بادشاہ سن رسیدہ لوگوں سے تو زرعی کاموں میں بیگار لے گا اور جوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرے گا۔

اہلیانِ شہر کی مجلسِ شوریٰ نے گل گامش کے جواب میں کہا :
کس میں اتنی سکت ہے کہ
مستعدی سے مسلسل کھڑا رہے
اور احکام کے مطابق برابر کام میں لگا رہے
اور بادشاہ کے بیٹے کے ساتھ دھاووں میں برابر شریک ہوتا رہے
اور گدھے کو برابر چلنے پر مجبور کرتا رہے
لہٰذا خانوادۂ کیش کی اطاعت مت کرو
بلکہ اُس پر اپنے اسلحوں سے ضرب لگاؤ۔
عروق، جسے دیوتاؤں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا
اِیاناؔ، وہ مکان جو آسمان سے یہاں اُترا،
اُس کے حصّوں کو دیوتاؤں نے تراشا ہے
اُس کی بڑی دیوار بادلوں کو چھوتی ہے
اُس کی اونچی اقامت گاہ کو اَنُوؔ نے قائم کیا ہے،
گل گامش! تو جو ہمارا بادشاہ اور ہیرو ہے،
تُو نے اس کی دیکھ بھال کی ہے،
تو جو سرشکن اَنُوؔ کا چہیتا شہزادہ ہے
دشمن تجھ سے کتنا خوفزدہ رہتا ہے۔
اُس کی فوج مختصر ہوتی جاتی ہے
کیونکہ وہ عقب سے پراگندہ ہے
اور اُس کے سپاہی تیرے رُوبرو سر اُٹھا کر نہیں چل سکتے۔

گل گامش، آقائے کلاب، نے
اہلیانِ شہر کے یہ الفاظ سُنے
تو اُس کا دل خوش ہو گیا، اور اس کی روح بیدار ہو گئی
اُس نے اپنے خادم اِن کِدُو سے کہا :
" سُوکارا[1] کو اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا جائے

---

[1] سُوکارا شاید کوئی آلۂ زراعت تھا۔

اور لڑائی کے ہتھیار نچ لیے جائیں
یہاں تک کہ اُن سے وہشت اور ہیبت پیدا ہونے لگے۔
اور جب اُگّا حملہ کرنے آئے گا
تو میرا خوف اُس پر چھا جائے گا
اُس کی قوتِ فیصلہ جواب دے جائے گی
اور اُس کا مشورہ اکارت جائے گا"
پانچ دن بھی نہ گذرے تھے،
دس دن بھی نہ گذرے تھے [1]
کہ اِن سے براگ گیسی کے بیٹے اُگّا نے عروق کا محاصرہ کر لیا۔
عروق کی قوتِ فیصلہ جواب دینے لگی،
تب گل گامش، آقائے کلاّب نے اپنے سورماؤں کو یوں مخاطب کیا:
"میرے سورماؤ!
تم میں سے جس کی ہمت ہو وہ آگے بڑھے،
میں اُسے اُگّا کے پاس بھیجوں گا"
بِرہُور تری، ایک سردار، آگے بڑھا
اور بادشاہ کی تعریف کرنے کے بعد بولا:
"میں اُگّا کے پاس جاؤں گا
بے شک اُس کی قوتِ فیصلہ جواب دے گی"
پس بِرہُور تری شہر پناہ کے پھاٹک سے باہر نکلا
مگر جونہی وہ پھاٹک سے باہر نکلا
انھوں [2] نے اُسے پکڑ لیا اور اُس کا گوشت کھل دیا
اور اُگّا کے رُوبرُو لائے
ابھی بِرہُور تری کی زبان بھی نہ ہلی تھی
کہ بِرہور تری کا آقا زابرشدیب اُنو گا فصیل پر چڑھ کر

---

[1] سُومیری محاورہ جس کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ حملہ ہو گیا۔
[2] انھوں کی ضمیر اُگّا کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے [3] گل گامش

یہ منظر دیکھنے لگا
اگاؔ نے زابر دیب اُنُوگا کو دیکھا
اور برہوُرتری نے زابر کو پکارا۔
غلام، کیا فصیل پر کھڑا ہوا آدمی تیرا مذاق ہے
میرا آقا (زابر) رزق دینے والا نہیں ہے
حالانکہ میرا آقا بھی رزق دینے والا ہو سکتا ہے
اس کی غضب آلود پیشانی گِل گامش کی ہو سکتی ہے
اُس کا بھنیسے جیسا چہرہ گِل گامش کا ہو سکتا ہے
اس کی لاجوردی ڈاڑھی گِل گامش کی ہو سکتی ہے
اُس کی شفیق اُنگلیاں گِل گامش کی ہو سکتی ہیں
مگر سپاہیوں کی بھیڑ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوئی
غیر ملکیوں کا جمِّ غفیر اُس کی باتوں سے متاثر نہ ہوا
اُن کے منہ دھول سے نہیں بھرے
مگر ؔاُ جہاز کا رُخ نہیں بدلا
اور کیش کے بادشاہ اگاؔ نے اپنے جارحانہ دل کو نہیں روکا
وہ برہوُرتری کو برابر مارتے پیٹتے رہے
انھوں نے اُس کے گوشت کا قیمہ کر دیا۔
زابر کے بعد گِل گامش فصیل پر چڑھا
اور کلاب کے بوڑھوں اور جوانوں پر ہیبت طاری ہو گئی
یوروق کے سپاہیوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے
اور وہ شہر پناہ کے پھاٹک پر کمربستہ ہو گئے،
انھوں نے پھاٹک کے راستوں پر مورچے لگا لیے
اور اِن کِدُو شہر پناہ کے پھاٹک کی سمت روانہ ہو گیا۔
گِل گامش فصیل پر سے حالات کا جائزہ لیتا رہا
اور اگاؔ نے گِل گامش کو دیکھا

لے اس حملے میں اہلِ کیش نے جہاز بھی استعمال کیے تھے۔

اور اگّا نے اِن کِدوکو مخاطب کرتے ہوئے کہا :[1]

غلام! کیا رزق دینے والا ہی تیرا آقا ہے

ہاں، جیسا تم نے کہا

رزق دینے والا ہی میرا آقا ہے

یہ جواب سُن کر

مجمع کے سر جھک گئے

اور بھیڑ الٹ کھڑی ہوئی،

اور اُس نے اپنے آپ کو دھول سے ڈھانپ لیا۔

اور غیر ملکی لوگ لاجواب ہو گئے

اور اُن کے منہ میں دھول بھر گئی

اور گگرا جہاز کا رُخ بدل گیا

اور کِش کے بادشاہ اُگّا نے اپنے جارحانہ دل کو روک لیا

تب گل گامش اُگّا سے مخاطب ہو کر بولا :

"اُگّا تو میرا پاسبان ہے[2]

تو میرا کارندہ ہے

تو میری فوج کا سپہ سالار ہے

تو نے بھاگتے ہوئے پرندکو دانوں سے بھر دیا ہے

تو نے مجھے سانس دی ہے، تو نے مجھے زندگی دی ہے

تو بھاگتے ہوؤں کو پناہ دیتا ہے۔"

---

[1] اس پورے بند میں شاعر نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے چنانچہ یہ بات بالکل واضح نہیں ہوتی کہ یہ ہُنرتمی نے جب وہی تعریفی کلمات دہرائے جو ابتدا میں بے اثر ثابت ہوئے تھے تو پھر اُگّا کے جارحانہ دل کو کیوں قرار آگیا اور اس نے محاصرہ کیوں اُٹھا لیا۔

[2] اس بند میں بہ ظاہر متضاد باتیں کہی گئی ہیں۔ گل گامش نے تدبّر اور مصلحت اندیشی سے کام لیا تھا اور وہ اُگّا کی فوج سے لڑنے کے بجائے گفت و شنید کے ذریعہ محاصرہ اٹھوانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ایسی صورت میں اُس کا مرتبہ اُگّا سے کم ہونا چاہیے تھا مگر سومری کا شاعر اپنے ہیرو پر کسی اور کو فوقیت نہیں دینا چاہتا چنانچہ وہ گل گامش سے ایسی تقریر منسوب کرتا ہے جس میں گل گامش کا درجہ اونچا ہے اور اُگّا کا درجہ نیچا ہے۔

آخری بند میں شاعر اپنی نظم کو سومری اور اُس کے ہیرو کی ثنا و صفت پر ختم کرتا ہے۔

عروق جسے دیوتاؤں نے اپنے ہاتھ سے بنایا
جس کی اونچی دیوار آسمان کو چھُوتی ہے
عظیم اقامت گاہ جسے اُرُو نے قائم کیا
گِل گامش! تُونے اُس کی دیکھ بھال کی،
تُو جو بادشاہ اور ہیرو ہے۔
تُو جو اُرُو کا جِیتا ہے۔
اُگا نے تجھے آزاد کیا
اس نے اُرُو کے رُو برُو
تیرا پُرانا اقتدار تجھے واپس کیا۔
گل گامش، آقائے کُلاب ہم تیری ستائش کرتے ہیں۔

غبارِ شب

قاضی عبدالستار

جھام پور کے واجب الارض کے مطابق مہادیو جی کے پیپل کی وہ شاخ کاٹ دی گئی جو ٹریفک کانسٹبل کے سفید ہاتھ کی طرح تعزیوں کا جلوس روکے کھڑی تھی لیکن قصائیوں کا پچھائیں تعزیہ معمول کے خلاف اتنا اونچا تھا کہ اس کا گنبد شاخوں سے اُلجھ رہا تھا۔ جسم پر لپٹی ہوئی جامدانی کی پُرانی اچکن لہراتے ہوئے عنایت خاں جلوس سے نکلے اور پیپل کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے تفضل حسین کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ تفضل حسین نے اپنے فیروزی رنگے ہوئے موٹی تن زیب کے کُرتے کی ڈھیلی آستینیں شانوں پر پھینک دیں۔ بنے ہوئے بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیوں کی نمائش کر کے نیچی دھوتی کو لنگوٹ کی طرح کس کر باندھ لیا۔ پاس کھڑے ہوئے لڑکے کے کندھے سے بارہ سیر وزنی بانکا پھول کی طرح اٹھایا اور لانبے سیاہ فام ادھیڑ تھانیدار نے مسلح کانسٹبل کے کان میں گھُس کے کچھ کہا۔ پھر ساری پولیس فورس مسلمان تھانیدار کے پیچھے سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ پیپل کے نیچے سے دور چھوٹے سے مندر تک سارے میدان میں کھچا کھچ بھرا ہوا ہندو مجمع پھنکاریں مار رہا تھا اور قلعی کیا ہوا اندر رکھا گُپ سپہ سالار کی طرح کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ چودھری اقبال نرائن صفوں کو چیرتے، ریشمی کُرتے کے زردی بٹن بند کرتے نئے وارنش پمپ کو دھول سے برابر کرتے قدم رکھتے نکلے اور عنایت خاں سے تھوڑے فاصلے پر رُک گئے۔ ہندو لٹھ بندوں کا ایک دستہ نگراں کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔

عنایت خاں نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کاندھے پر پڑا ہوا سبز اونی چادرا کھینچ کر کمر سے باندھا۔ سر کا پھولا پھولا صافہ کس کر بیٹھا۔ پھر باجے بجانے والوں نے دلوں میں آگ لگا دینے والی دُھن کو جھوم جھوم کر بجانا شروع کر دیا۔ جوگیوں کے چودھری نے للکارا اور روشنی کرنے اور کارچوبی واسکٹیں پہنے ہوئے جوگیوں کے لڑکے چیخ چیخ کر نوحے پڑھنے لگے اور اچھل اچھل کر ماتم کرنے لگے۔ اکھاڑوں میں کرتب دکھانے والے اپنے اپنے استادوں کے پیچھے لکڑیاں ہلاتے بلّم گھماتے اور تلواریں چمکاتے دوڑے اور عنایت خاں کے پیچھے پھیل کر کھڑے ہو گئے۔ عنایت خاں کی سفید بھوؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی مطمئن آنکھیں جھکیں اور تفضل حسین پر گڑ گئیں۔ تفضل حسین نے چڑھنے کے لیے بانکے کے پھل کو رومال میں لپیٹ کر منہ میں دبایا اور درخت پر ہاتھ جمائے۔ کسی من چلے نے "یا علی" کا نعرہ لگایا جس کی تھلکہ ڈال دینے والی تکرار نے بڑے بڑے دلوں کو ہلا دیا۔ پھر چودھری اقبال نرائن گرجے۔

"قانون ہو چکا خانصاحب...... اب پیپل نہیں کٹے گا۔"

تفضل حسین نے پاؤں اتار لیا اور عنایت خاں کو دیکھا۔ عنایت خاں نے پرسکون آواز میں تھم تھم کر کہا۔

"تو پیپل تو کٹے گا چودھری جی!"

"نہیں کٹ سکتا۔" چودھری کی آواز پھٹ گئی۔

"تو تعزیے نہیں اٹھیں گے۔"

"نہ اٹھیں۔"

پھر تعزیے رکھ دیے گئے۔ ان کو اٹھانے والے ہندو مزدور بیڑیاں پینے لگے۔ خوانچے والے بھاگ کر اس مسجد کے نیچے آ گئے جہاں دور کھڑی عورتیں تماشا دیکھ رہی تھیں۔ بھڑکدار کپڑے اور کھنک دار زیور پہنے چمکتی کھنکتی عورتیں مٹھائی کے دونے اور گودوں کے بچے سنبھالے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگیں۔ قصائیوں اور گدیوں کے چودھریوں نے تعزیوں کے گرد لاٹھیوں کا حلقہ کھڑا کر دیا اور اطمینان سے چلمیں پینے لگے۔ عنایت خاں کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ کمر کے چادرے کی گرہ مضبوط کی اور لمبے لمبے ڈگ رکھتے بھاگے۔ راستے میں ملتے ہوئے سلاموں پر گالیاں سناتے جلوس کی طرف راہگیروں کو دھکیلتے ٹیالے پھاٹک تک آ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے آدمیوں نے اندر شیخ کو خبر کر دی۔ بیمار شیخ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ عورتیں چھپ گئیں۔ عنایت خاں دھکتے برستے اندر پہنچے۔ شیخ نے بڑی اذیت سے اپنے کو ابھارا اور گاؤ تکیے میں کہنیاں گاڑ دیں۔

"چودھری اقبال نرائن نے تعزیے روک دیے ہیں۔" عنایت خاں نے کھڑے کھڑے وار کیا۔

"ہوں!"

"قصائیوں کا پنچایتی تعزیہ اگر دو چار انگل اور اونچا ہو گیا تو کیا جلوس میں نہیں چلے گا؟"

"اقبال سے کہو...... میں ابھی مرا نہیں ہوں...... پیپل کٹے گا۔"

عنایت خاں کے جاتے ہی نوکر دوڑنے لگے۔ بندوقیں نکالی گئیں۔ سپاہی کیل کانٹے سے لیس ہو کر ڈیوڑھی پر لگی ہوئی فینس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہاروں کی قطار انتظار کرنے لگی۔ شیخ نے لیٹے لیٹے پائجامہ بدلا۔ بیٹھے بیٹھے اچکن پہنی، اپنے ہاتھ سے پگڑ چنا اور سر پر رکھ لیا۔ رنبیر نے آہستہ سے ان کے پاؤں میں جوتا پہنا دیا۔ رام سکھ اور لچھمن داس نے پورے ہاتھوں سے سہارا دے کر ان کو اٹھایا لیکن پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ شیخ نے دو قدم گھسیٹے، پھر گردن ہلائی اور کھڑے ہو گئے۔ اشارہ پاتے ہی نوکروں نے مسہری پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ منکا ڈھل گیا اور نکٹھ بچ گیا۔ عورتیں چیخنے پکارنے لگیں۔ بے پردہ ہوا۔ سینکڑوں چارپائیوں کو نگل جانے والا آنگن آدمیوں سے بھر گیا۔ حکیم غلام حسین دواؤں سے لدے پھندے آئے۔ تھانیدار الیاس نے اپنے کانپتے ہاتھ سے بید مشک کا چمچہ شیخ کے منہ میں انڈیل دیا۔ شیخ نے آنکھیں کھولیں۔ تیرتے ہوئے دیدوں کو تھام کر اپنی اکلوتی اولاد...... اپنی تیسری بیوی کی اکیلی نشانی جمیل کو دیکھا جو ان کا پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔ آنکھوں کے گوشے پانی کی لکیروں سے لپک اٹھے۔ پھر چودھری اقبال نرائن ہانپتے ہوئے آئے اور ان کا دوسرا پاؤں گود میں لے کر بیٹھ گئے۔ شیخ نے چودھری اقبال نرائن کو دیکھا اور کمزور آواز میں بولے۔

"یہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں چاچا۔"

"تعزیے ..... کیوں ..... رکھ ..... دیے؟"

"کہاں رکھ دیے گئے تعزیے ..... یہاں سے جاتے ہی تعزیے اٹھواتا ہوں ..... آپ آرام کیجیے۔"

"عنایت ..... خاں۔"

"چاچا ..... عنایت خاں جھوٹے ہیں ..... فسادی ہیں ..... بھلا تعزیے بھی کہیں روکنے کی چیز ہیں؟"

پھر چودھری اقبال نرائن اٹھے اور اپنے مسلمان سپاہی کو حکم دیا کہ پیپل کو کٹواؤ اور باجے بجواؤ ..... شیخ چاچا کو اطمینان ہو جائے۔

حکیم غلام حسین نبض پکڑے بیٹھے تھے۔ چودھری اقبال نرائن کا سپاہی نئی سائیکل پر سیتاپور ڈاکٹر لینے جا چکا تھا۔ شیخ محمد مظفر رئیس جام پور کی سانس کا کچا دھاگا ٹوٹ گیا۔ باجے ایک بار پھر رک گئے۔ عورتوں نے کہرام برپا کر دیا۔ بیرانیں جو نوحے پڑھنے [...]ئی تھیں شیخ کے بین کرنے لگیں۔ پیپل کی شاخیں تو کٹ گئیں لیکن جلوس اجڑ گیا۔ تعزیے تنہا مجرموں کی طرح سر جھکائے مقررہ استول پر چلتے ہوئے بارہ بجے رات کے بجائے دن کے دو ہی بجے دفن ہو گئے۔ چاروں طرف آدمی دوڑنے لگے۔ لالہ [...]گر رئیس مانک پور پھاٹک کے قریب چلتے ادھے سے پھاند پڑے اور شیخ کے جنازے تک پہنچتے پہنچتے کئی بار گر گر پڑے، [...]ئی بار سپاہیوں نے اٹھایا۔ پھر شیخ کا ہاتھ چادر سے نکال کر منہ پہ رکھ لیا اور چیخ مار کر کہا۔

"آج کمر ٹوٹ گئی۔"

اور پچھاڑیں کھاتے کھاتے بیہوش ہو گئے۔

شیخ کے کچے دیوان خانے کے پھاٹک سے دور سڑک تک پھیلا ہوا مجمع بڑھتے بڑھتے اسکول کے احاطے تک [...]گیا۔ تین تین کوس تک کا ایک ایک آدمی شیخ کو مٹی دینے کے لیے آچکا تھا لیکن شیخ اپنے کپڑوں میں لیٹے تھے۔ ان کی شیروانی [...] طرح مسہری کے تکیے پر پڑی تھی۔ ستر کھ کے ٹھاکر بھارت سنگھ کا انتظار تھا جن کو لانے کے لیے ستر کھ کا موٹر لکھنؤ جا چکا تھا۔ [...]ں کی گیسیں اور ہنڈے اندر سے باہر تک جل رہے تھے۔ پھر ستر کھ کے ٹھاکر آ گئے۔ شیخ کی پٹی پر سر رکھ کر روتے رہے [...]۔ لالہ سندر کر نکل پڑے۔ بھارت سنگھ ان سے لپٹ گئے۔

"آج باون برس کا ساتھ چھوٹ گیا ..... گرو!"

"آج جوڑا اجڑ گیا۔"

وہ چیختے رہے اور روتے رہے۔

پھر چودھری اقبال نرائن نے دونوں کو چھڑایا۔ شیخ نہلائے گئے۔ جب ان کو کفن پہنایا جا رہا تھا تب ٹھاکر نے لالہ [...] بازو پکڑ کر کہا۔

"اس کی شادی کے کپڑے بھی ہم دونوں نے پہنائے تھے ..... آؤ کفن بھی پہنا دیں۔"

جام پور کی مسجد سے جام پور کے رئیسوں کے قبرستان تک دو میل کا کچا راستہ آدمیوں سے بھک[...]

راستے ٹھاکر بھارت سنگھ تعلقدار سنر کھ اور لالہ ساگر نرائن رئیس مانک پور نے کاندھا نہیں بدلا۔

درختوں کے پھل آنسو بن کر ٹپک گئے۔ زرد پتوں کی لاشوں کے بچھونے بچھ گئے۔ جوگن پروائی نگر نگر دکھ کے بھجن گا گا کر تھک گئی۔ آخر آخر وقت کے طلسمی چشمے ہی جمیل نے اپنے دلدر دھو لیے۔ غم کی گھٹا برس کر کھلی تو نئے روشن آسمان پر پہاں سے وہاں تک مستقبل کی دھنک کھڑی تھی۔ تیج کے جہلم کے بعد وہ اپنی ماں کے بغیر رنگے چُنے چادرے جیسے سفید دوپٹے سے جھولتی ہوئی نقلی سونی یا دامی کلائیوں کے ہاتھ اپنی گردن سے اتار کر باہر آیا۔ دیوان خانے میں اونگھتی ہوئی آرام کرسی پر دیر تک مجسّمے کی طرح بیٹھا رہا۔ کام کرتے نوکروں اور چلتے پھرتے سپاہیوں کو کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ کھلے ہوئے پھاٹک سے سڑک پر آدمیوں کے گزرتے ہوئے گملوں کو گھورتا رہا۔ پھر اندر آ کر لکڑی کی سیڑھیوں پر بچھی ہوئی گھسی پٹی چٹائی پر آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تخت پر ڈھیر ٹھنڈے پتلونوں اور گرم شیروانیوں کے انبار کو صندوقوں میں قید کر کے وزنی تالوں کا پہرہ لگا دیا۔ ان کتابوں کو الماریوں میں ٹھونسنے لگا جن پر شیخ محمد جمیل کلاس دہم گورنمنٹ اسکول سیتاپور کے قلمی مونوگرام بنے تھے۔ ان کی خاک سے اب بھی اس مستقبل کی بشارت کی خوشبو آ رہی تھی جو ہلی۔ اسے کی سرحد کے پار کھڑا تھا۔ تھوڑے دنوں قبل جس طرح اس نے اپنے باپ کو قبر میں اتارا تھا اسی طرح ان کاغذی لاشوں کو دفن کر کے وہ اپنے ہاتھ جھاڑتا نیچے اتر آیا۔

اساڑھ بیت چکا تھا لیکن آسمان نیلے شیشے کی چادر کی مانند تنا کھڑا تھا۔ سورج نارنج کے جبر کی طرح بے گناہ انسانوں پر برس رہا تھا۔ وہ دیر تک دیوان خانے کے کچے طویل ٹھنڈے دالانوں میں ٹہلتا رہا۔ پھر بغیر گوگلس لگائے بغیر ہیٹ لیے باہر نکل پڑا۔ پھاٹک پر چلم پیتے سپاہیوں نے لپک کر لاٹھیاں اٹھائیں لیکن "بھیّا" نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا۔ سڑک پر مڑتے ہی پرچون اور حلوائی کی دکانوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کسی نے اس کے وجود کا اقرار نہ کیا۔ کسی نے سلام کے لیے وہ انگلیاں نہ اٹھائیں۔ اس کی نگاہ سے نگاہ مل جانے کے خوف سے سب سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ وہ سر جھکائے گزر گیا۔ آگے بکر قصابوں کی دکانوں پر بند خریدار چمکتی چھریوں اور بجتے گلوں کے زنجے میں کھڑے اپنے آپ کو اپنی اہمیت کا یقین دلا رہے تھے۔ وہ اجنبی سا گزر تو گیا لیکن ذہین طبیب کی طرح نئے مریض کا مرض تشخیص کرتا رہا۔ ان اہم آدمیوں کے متعلق سوچتا رہا جو شیخ کی زندگی میں اس کے کتوں کو چمکارتے تھے اور منہ سکھائے اس کے چہرے کو پڑھا کرتے تھے۔ اب وہ اپنے کھیتوں میں آ گیا جہاں اس کے نوجوان نوکر تڑپتی دھوپ میں کنوئیں کی چرخی چلا رہے تھے اور کھیت سینچ رہے تھے۔ بائیس برس کی زندگی میں وہ پہلی بار اپنے کھیتوں کی نگرانی کے لیے آیا تھا۔ بوڑھے بوڑھے سیربانوں نے ہانک لگائی اور قریب کے گاؤں سے پلنگ، چھتریاں، پنکھے، دودھ اور شربت کے چمکتے لوٹے اور ٹھنڈے پانی کے گگرے چلنے لگے۔ ایک مینڈھ پر پلنگ بچھ گیا۔ اعلیٰ قالین بچھا دیا گیا۔ ایک سیربان چھتری کھول کر کھڑا ہو گیا اور کئی آدمی دودھ اور شربت لیے بیٹھے رہے لیکن وہ بھیگی چکنی اور ٹھنڈی مینڈھوں پر ٹہلتا رہا۔ پھر رام سکھ نے اپنی آدھی دھوتی سے بھری چھاتی چھپالی اور بیڑی بجھا کر کان میں لگالی اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

"بھیّا!"

"اوں!"

"جل پان کر لیو آپ۔"

"مجھے خواہش نہیں ہے"

"یہ رسم ہے مالک۔"

نوکروں کے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ کنویں کی بھرنی تھم گئی اور بہت سی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"رسم ہے"

"ہاں مالک ...... آپ پہلے دن اپنے راج ماں آئے ہو۔"

"راج؟"

"راج ...... چاہے چھوٹا ہو ..... چاہے بڑا ...... ٹل راج راجہ ہے۔"

اس نے گردن ہلا کر حیرت کا اظہار کیا اور دو گھونٹ دودھ ملا ہوا گڑ کا شربت پیا اور دو درجن کلیاں کیں۔ پھر ٹہلتا ہوا اپنے گاؤں بھٹارہ کی طرف چلنے لگا۔ بھٹارہ وہ گاؤں تھا جس میں بارہ موضعے لگتے تھے اور جو شیخ کی آبرو تھا۔ مٹی کے چھوٹے گندے اور بے ہنگم مکانوں کی قطاروں کے پاس پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا تو کوئی دو درجن آدمیوں کی چلتی ہوئی قطار ٹھٹھک گئی۔ گاؤں کے بچے اسے دور سے دیکھتے اور بھاگ جاتے۔ عورتیں اپنے گھونگھٹ کھینچ کر منہ گھما کر کھڑی ہو جاتیں، آدمی جھک کر سلام کرتے اور ساتھ ہو لیتے۔ بوڑھی عورتیں خود ہی سلام کرتیں اور خود ہی منوں دعائیں دے ڈالتیں۔ بیچوں بیچ گاؤں میں شیخ کا بنوایا ہوا کھلا کھڑا تھا جس کے صحن میں املی کا چھتنار درخت تھا۔ اس کے نیچے رنگین پایوں کا نواڑی پلنگ بچھا تھا جس پر اونی قالین پڑا تھا۔ بوڑھوں کے اصرار پر وہ گھڑی بھر کے لیے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس گاؤں کا ایک ایک آدمی املی کے نیچے جمع ہو گیا۔ پھر نذر شروع ہوئی جب اس کے قدموں میں بچھے ہوئے رومال پر چاندی کے روپوں کا ڈھیر لگ گیا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے وہ چھنچھناتا ہوا رومال اٹھایا اور بھٹارہ کے پیردار رام سکھ کے حوالے کر دیا۔ ان گنت سلاموں کا ایک اشارے سے جواب دیتا ہوا وہ پھر اپنے ان کھیتوں کی طرف پھر لیا جہاں کام ہو رہا تھا اور ایک سیرہان کی چھتری کے سایے میں پلنگ پر نیم دراز ہو کر تقدیر کی اس عبارت کو پڑھنے لگا جو اس کے مستقبل کے ماتھے پر لکھ دی گئی تھی۔

"جے ہو"

جمیل نے چونک کر دیکھا تو ایک پانچ فٹ کا دبلا پتلا آدمی سامنے کھڑا تھا جو صرف ایک لنگوٹی باندھے تھا۔ ٹھڈی پر چگی داڑھی تھی اور کھچاچوں کی باچھوں پر جٹائیں لہرا رہی تھیں۔ پیٹھ پر بڑی سی گٹھڑی لدی تھی جسے وہ پتلے پتلے ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے تھا۔ ہر سانس پر اس کی پسلیاں نظر آ جاتیں جیسے پچھلے صاف پانی میں ریت کی دھاریاں نظر آتی ہیں۔

"رام داس بابا!"

"ہاں بچہ! ...... بھگتی ہو ...... آنند رہو۔"

"بابا کو چلم پلاؤ۔"

یہ حکم صادر کر کے وہ پھر اپنے خیالوں کے دیس میں لوٹ گیا۔ بابا کو نوکروں نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ نوعمر نوکر بابا سے ٹھٹھول کرنے لگے مگر بابا بے نیازی سے چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے چلم کے دم لگاتے رہے۔

"بابا ... دیکھت ہو .... آج کیسی آگی برس رہی ہے۔"

کسی لڑکے نے بابا کو چھیڑا۔

"تو بابا دکھیا کا کریں۔"

دوسرے نے جواب دیا۔

"بابا دکھیا یوں کریں کہ نی پانی برسائے دیں۔"

اس نے زور سے کہا۔

"ہوں!"

بابا نے نرم اور ریتلی زمین میں چلم گاڑ دی۔ اب دوسرے نوکروں نے بھی بابا کو گھیر لیا اور کئی زبانیں ایک ساتھ چلیں۔

"یار بابا..... آج برسائے دیو پانی۔"

بابا اب آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکے تھے۔ نوکروں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ننگ دھڑنگ آدمی پسینے میں اس طرح چمک رہے تھے جیسے پورے بدن پر تیل مل کر نقب لگانے نکلے ہوں۔

"کا .... جو بھیا کہہ دیں..... تو آج برسائے دیں۔"

اور بھیا جو دور دالان سے بیٹھے تھے چونک پڑے۔ بابا کے اس جملے سے تھوڑی دیر تک سناٹا رہا پھر کئی آدمی بول اٹھے ——"بھیا! آپ کہہ دیو۔"

اور بھیا نے کہہ دیا۔ بابا نے اپنی گٹھڑی کھولی۔ پوٹلی سے راکھ نکال کر بدن پر ملی اور آسن جما کر بیٹھ گئے اور جاپ کرنے لگے۔ نیلے شیشے جیسے آسمان پر بادل کا دور دور تک ایک دھبہ بھی نہ تھا۔ درجنوں آنکھیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ پھر معلوم نہیں کدھر سے ایک ایک بھورا بھورا بادل کا ٹکڑا آیا اور پٹر پٹر بوندیں پڑنے لگیں۔ گھڑی بھر میں کوئی فرلانگ بھر کا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ نوکر نوکر خود بھیا سے ہوئے بیٹھے تھے۔ منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی پھر اسی عالم میں بابا ایک طرف نکل گئے اور کسی کو بولنے کا یارا نہ ہوا۔ گھر پہنچ کر جمیل کو احساس ہوا کہ بابا کو وہ چونی نہیں ملی جو مرحوم شیخ نے مقرر کر دی تھی لیکن اب بابا کہاں ...... ؟ سارے جھام پور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کا کم سے کم ایک نفر ان کی تلاش میں نہ نکل گیا ہو۔

جھام پور اور اس کے جوار کی ساری سیاست پر شیخ کا حکم چلتا تھا جو جھام پور کی تین ہزار کی آبادی میں سب سے زیادہ چودھری اقبال نرائن اور عنایت خاں کو کھلتا تھا۔ چودھری اقبال نرائن جس اثر اور اعتبار کو روپے سے خریدنا چاہتے تھے، اسے عنایت خاں اپنی "قوم" کی اکثریت کی بنا پر ہتھیانا چاہتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہندوؤں کے اکثر معاملات چودھری اقبال نرائن کی بیٹھک اور مسلمانوں کے بیشتر مسئلے عنایت خاں کے چوپال میں طے ہونے لگے۔ اس کے باوجود دونوں کے راستے میں شیخ کی پرانی چوکھٹ کی روایتی زندگی پہاڑ کی طرح کھڑی تھی۔ تحصیل اور ضلع کے حکام جب جھام پور میں قدم رکھتے تو چودھری اقبال نرائن

جواب چودھری صاحب اور وجاہت خاں جو خانصاحب بجنے لگے تھے چیل کی طرح جھپٹتے اور جمیل کو درمیان میں لائے بغیر بالا ہی بالا معاملات کو حسبِ مرضی طے کر کے رخصت کر دیتے۔ جمیل کے اس دکھ میں جام پور کے "نیچ قوم" کے چند ہندو مسلمان گھرانوں کے علاوہ بھتارہ اور اس کے مزارعے شریک تھے جو شیخ کے مرنے کے بعد سیاسی طور پر لاوارث سے ہو چلے تھے۔

پہلا دونگرا ٹوٹ کر گرا تھا۔ کچے مکانوں کے پیڑے پھول پھول کر گرنے لگے تھے۔ موٹے موٹے چھپر ٹپکنے لگے تھے دم بھر کو ذرا سا آسمان کھلا تھا۔ سنہری دھوپ نے مٹی کے بھونڈے برتنوں جیسے مکانوں پر میلی میلی سنہری قلعی سی کر دی تھی۔ نہائے ہوئے درختوں کی شاخوں سے بوندیاں ٹپک رہی تھیں۔ جمیل دالان میں بیٹھا اپنی دیو پیکر بھینسوں کی اٹکھیلیاں دیکھ رہا تھا جو بارش کے پانی میں نہا کر مست سو رہی تھیں کہ ڈیوڑھی پر ہنگامہ برپا ہوا۔ وہ گیا تو دیکھا کہ منشی بکر قصاب کا بیٹا تیور بگاڑے کھڑا ہے اور رسولن بوا ناسے کی ہیٹ میں گوشت لیے بڑبڑا رہی ہیں اور راندر صحن میں اتی برس رہی ہیں۔

"ابھی تو جنتی کا کفن بھی نہیں میلا ہوا اور ابھی سے یہ نمک حرامی .... کہ میرے گھر میں کتوں کا راتب آنے لگا..... اللہ کی شان،..... رسولن!"

"جی!"

"پھینک دے یہ پلیٹ اس حرامزادے کے منہ پر...... ہمارا وقت بگڑ گیا ہے تو ہم نہیں کھائیں گے گوشت..... جب ہمارا وقت پلٹے گا تب ہم گوشت کھا لیں گے۔"

جمیل کو دیکھتے ہی بوا غرائیں۔

"اے بھیا...... گھنٹوں بیٹھے ریں ریں بھیک ایسی مانگا کریں تب یہ گوشت نصیب ہو.....منہ سے کچھ بولیں ... تو چھریاں چمکا کے کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔"

وہ پاؤں پٹختا باہر آیا۔ بیلوں کے مکانوں میں نوکر چاکر سانی پانی کر رہے تھے۔ رام غلام اس کے تیور دیکھتے ہی لٹیاں زمین پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"رام سکھ کو بلاؤ۔"

وہ گرجا اور رام غلام بجلی کی طرح دیوار سے لگی سائیکل لے کر پھاٹک سے نکل گیا۔ رام سکھ "سرکاری کھیتوں" میں "امالیہ" سے دھان بوا رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی رام غلام سائیکل سے پھاند پڑا۔

"بلوا ہے۔"

"کا ہے؟"

"بھیا برجھائے گئے ہیں۔"

"کی پہ؟"

"پچکوا (بکر قصاب) سارے بدماس ہیں۔"

"ہوں...... تو تم چل رکھو..... ہم آیت ہے۔"

پھر اس نے چلم کا آخری دم لگایا اور کام کرتے آدمیوں کو مختلف موضعوں پر روانہ کر کے حکم دیا کہ آدمی سنبھل کر دوارے پہنچیں۔ خود بھٹارہ کے آدمیوں کو بٹورنے چلا۔ بھٹارہ اور اس کے مزاعوں میں پاسیوں کی آبادی سب سے زیادہ تھی۔ دور اندیش شیخ نے ان کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ شیخ ضلع سیتاپور میں واحد رئیس تھے جو پاسیوں کے یہاں ڈنکے کی چوٹ پانی پیتے تھے اور کھلم کھلا گائے کے گوشت کی مذمت کرتے تھے۔ جھام پور میں کوئی ایسا نہیں تھا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ شیخ نے کبھی گائے کا گوشت کھایا ہے۔ اس کے بدلے میں بھٹارہ اور اس کے جوار کے پاسی سؤر نہیں پالتے تھے اور عام طور پر مشہور تھا کہ سؤر کھاتے بھی نہیں تھے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ کے جھوٹے برتن تک پاسی اٹھاتے تھے اور شرمندہ ہونے کے بجائے فخر کرتے تھے۔ رام سکھ اپنی "قوم" کا سب سے اہم آدمی تو تھا ہی لیکن شیخ کی مراعات نے اسے جوار کا سب سے اہم آدمی بنا دیا تھا۔ وہ شیخ کے پردے میں سارے جوار پر حکومت کرتا تھا۔ شیخ کی موت کا سب سے زیادہ اثر جمیل کے بعد رام سکھ ہی پر پڑا تھا اور بڈھا رام سکھ اندر ہی اندر اپنے اقتدار کو واپس لانے کے لیے بساط بچھائے بیٹھا تھا اور موقعے کا منتظر تھا۔ آج موقع آ گیا تھا وہ بڑے انتظام سے چلا۔

منشی گوشت کی دکان تو وضعداری میں لگاتا تھا۔ اس کی اصل تجارت کھالوں کی تھی۔ وہ سارے جوار اور سیتاپور سے کھالیں خریدتا اور کلکتے میں سودا کرتا۔ بکر قصابوں کا چودھری تو تھا ہی اب حج کر کے جھام پور کے معززین کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ عنایت خاں سے اس کے مساویانہ تعلقات تھے اور چودھری اقبال تراش سے لین دین تھا۔ شیخ کی زندگی بھر چپ رہا۔ ان کے مرتے ہی جھام پور کے اکلوتے حاجی نے پر پرزے نکالے۔ سماجی برتری کے لیے گیارھویں شریف میں پلاؤ کی دیگیں پکوائیں اور محرم میں شکر کے شربت کی سبیل لگائی۔ منشی زوروں پر جا رہا تھا کہ بیٹے نے یہ خبر سنائی۔ اس نے فوراً الگنی سے لانبا کرتا اتار کر پہنا اور شرعی پاجامے پر چادر کا صافہ باندھا اور عنایت خاں کے چوپال کی طرف ہو لیا۔ وہاں محاذ بنا کر چودھری اقبال تراش سے سازش کیا اور راستے بھر اپنے دل کو اطمینان دلاتا رہا کہ آج اگر فتح ہو گئی تو بیڑہ پار ہے۔ پھر دکان پر پہنچ کر اس نے اپنے بھائی بندوں کو اکسایا کہ زمیندار چودھری اقبال تراش بھی ہیں مگر وہ ہم سے کبھی چار آنے سیر گوشت نہیں مانگتے پھر جمیل بھیا میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ہم سارے جہان میں تو روپے سیر بیچیں لیکن وہاں چار آنے سیر پھینک آویں۔ منشی کی گفتگو سب نے غور سے سنی لیکن پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اس مصروفیت میں پیشہ ورانہ رقابت اور برادرانہ چپقلش کا بھی دخل تھا۔

رام سکھ کے "دوارے" پر پہنچتے ہی چاروں طرف سے آدمی گرنے لگے جیسے جھیل پر سرمائی چڑیوں کے غول اترتے ہیں اور جب رام سکھ کو اطمینان ہو گیا تب وہ سر پر مریٹھا باندھ کر اور سات ہاتھ کا لٹھ کندھے پر رکھ کر مضبوط قدم رکھتا "بھیا" کے سامنے آیا قبل اس کے کہ وہ سلام کرے "بھیا" گرجے۔

"رام سکھ!"

"مالک!"

"پکڑ کر لاؤ منشی کے بچے کو۔"

اور رام سکھ بھاگی ہوئی بکری کی طرح منشی کو بازو سے پکڑ کر لے آیا۔ اس کے بیٹوں بھتیجوں نے چھکنے کی کوشش کی لیکن آدمیوں کا بادل دیکھ کر بجھ گئے۔ پھاٹک کے بازو میں منقش ستونوں پر رکھے ہوئے چھپر کے سامنے بھیا "ٹہل رہے تھے۔ منشی کو

دیکھتے ہی حکم ہوا۔

"باندھ دو"

منشی باندھے جانے لگے تو اُلجھ گئے۔ بھیا نے ایک ہرواہے کے ہاتھ سے بیلوں کو ہانکنے والا چابک کھینچ لیا اور تھوڑی دیر میں منشی فرش ہو گئے۔ پھر منشی کی دکان بھنگیوں میں بانٹ دی گئی۔ چھپر پھونک دیا گیا۔ بیٹے بھتیجے بھائی برادری میں چھپ رہے۔ پھر ایک لونڈے نے منشی کو گٹھڑی بنا کر اٹھایا اور ان کے تروا ہے میں پٹک آیا۔ چودھری اقبال نرائن اور عنایت خاں کمیٹی کر رہے تھے کہ رام سکھ سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر تھانے گیا اور "بھیا" کا دستی خط تھانے دار کے حوالے کیا۔ تھانے دار نے اس لڑکے کا خط پڑھا جس کے باپ کے افسانے مشہور تھے اور جس کا تھانے دار الیاس نے جاتے جاتے تعارف کرا دیا تھا۔ گھوڑے پر چڑھ کر جھام پور کے پھاٹک پر اُتر پڑا۔ چوڑی ہڈی اور لانبے قد کے سُرخ و سفید "جمیل میاں" نے اپنے انگریزی بالوں کو انگلیوں سے برابر کیا، پائجامے کی چوڑیاں درست کر کے مخملیں جوتا پہنا اور نوابوں کی طرح برآمد ہوئے۔ آتے ہی مرغ کٹوانے اور کڑھائیاں چڑھوانے کا حکم دیا اور تھانیدار سے جو "الیاس چچا" کے واسطے سے مشفقانہ برتاؤ کر رہا تھا باتیں شروع کر دیں۔ اسکول کی باتیں، فٹ بال کی باتیں اور شکار کی باتیں۔ تھانیدار پوری دلچسپی سے سن رہا تھا اور گفتگو میں شریک ہو رہا تھا۔ پھر جب کا شستہ تھانیدار مرغ اور پراٹھے کھا چکا تب جمیل نے مقصد کی بات چھیڑی۔ تھانیدار سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ شام کو جمیل سے کچھ کہے بغیر تھانیدار اپنے گھوڑے پر چڑھ کر روانہ ہو گیا اور جمیل جھنجھلایا ہوا سوچتا رہا کہ وہ سنڈ کھ جا کر بھارت بابا سے داروغہ کی شکایت کرے یا مانک پور جا کر سوگر چاچا سے لیکن بڈھے رام سکھ نے اسے کہیں نہ جانے کا مشورہ دیا اور بیٹھا ہوا چوڑی چوڑی مونچھوں کے اندر مسکراتا رہا، چلم پیتا رہا۔ رات چڑھتے ہی شور ہوا۔ جمیل نے سپاہی کو حکم دیا کہ معلوم کرے کیا قصہ ہے۔ پتہ چلا کہ منشی کو تھانیدار باندھ لے گئے۔ جمیل کا جی چاہا کہ اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ چودھری اقبال نرائن اور عنایت خاں دونوں کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ اور صبح تک وہ پکڑ دھکڑ مچی رہی کہ ساری بستی لرز اُٹھی۔

اس سال تو یا بارام داس نے آسن بھی نہیں جمایا تھا، جاپ بھی نہیں کیا تھا مگر پانی تھمنے ہی کو نہ آتا تھا۔ سڑکوں پر نہریں چل رہی تھیں۔ لڑکے سیر مل بھوریں پکڑ پکڑ کر اپنے گھر لے جاتے۔ آخر مندروں میں کیرتن ہوئے، مسجدیں اذانوں سے گونج اٹھیں، استغفار کی نمازیں وہ بھیڑ ہوئی کہ سیر ھیوں پر صفیں کھڑی ہوئیں۔ تب کہیں اللہ اللہ کر کے چودہ دن بعد دھوپ کی صورت نظر آئی۔ دھوپ نکلتے ہی آدمی اس طرح بلبلا کر نکل پڑے جیسے الیکشن کے موسم میں لیڈر نکلتے ہیں اور مکانوں کی مرمت کا بندوبست کرنے لگے۔ رام سکھ نے بھیا کو مشورہ دیا کہ بانس، سینٹھا، پناور، بھوسا اور رجھا اگر قاعدے سے بچا جائے تو ہزار ڈیڑھ ہزار سے کم کا نہیں ہے۔ بھیا نے سُنا اور دیر تک سر جھکائے ٹہلا کیے۔ پھر جھام پور سے بشارہ تک سارے ضرورتمندوں کی فہرست بنائی اور گھر بیٹھے کھڑے سب کچھ تقسیم کر دیا اور آدھے دن میں بھیا کا نام بانس پر چڑھ گیا۔ ٹھیک کو مرے دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ جھام پور اور جوار کے سارے معاملے "بھیا" (جمیل) کے دیوان خانے میں طے ہونے لگے۔ چودھری صاحب پھر چودھری اکبال نرائن، اور "کھاں صاحب" پھر عنایت کھاں ہو کر رہ گئے۔

جب ہولی آگئی پیکر مرچلنے لگا تب ہمیشہ کی طرح سرکڈھ کے میلے کا اہتمام ہوا اور ریلوے لائن کے پچھم میں ٹھاکر صاحب سترکھ اور لالہ سدگر آف مانک پور کے درمیان کا پلاٹ جھام پور والوں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ سترکھ اور مانک پور کے خیمے تن بھی گئے اور آباد بھی ہو گئے لیکن جھام پور والے پلاٹ پر دھول اڑتی رہی۔ جب میلے کی گہما گہمی شروع ہو گئی تب ٹھاکر بھارت سنگھ نے پاسی کو خط دے کر جھام پور بھیجا اور بھیا نے بھارت بابا کے خوف سے مجبور ہو کر اسی وقت خیمے روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ بھٹارہ کے آدمیوں نے "رانی رانا" ویران ٹکڑے کو آباد کر دیا۔ دوسرے دن چار آدمے جوڑے گئے اور بھیا اپنے نوکروں کے ساتھ سوار ہوتے پڑاؤ پر اترتے ہی دونوں خیموں میں شور مچ گیا کہ جھام پور والے بھیا آ گئے۔ ٹھاکر کا مسلمان سپاہی بوٹے خاں ناف تک لہراتی ہوئی سفید داڑھی پر زعفرانی صافہ باندھے مہندی رنگی لاٹھی کندھے پر رکھے سامنے آیا اور فرشی سلام کر کے عرض کیا کہ ٹھاکر انتظار کر رہے ہیں جھام پور والے بھیا السلام ہوتے اٹھے اور بالوں کی گرد رومال سے صاف کرتے ہوئے دوسرے خیمے میں چلے گئے۔ ٹھاکر مسہری پر گاؤ تکیے کے سہارے پیروں پر الوان ڈالے نیم دراز تھے ان کے پاس ہی آرام کرسی کا لالہ سدگر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے تھے۔ دونوں نے دعائیں دیں پھر اس تاثیر پر بیٹھے اور نازک الفاظ میں ڈانٹا۔ جھام پور والے بھیا سفید بچوں کی طرح بھولا بھالا چہرہ جھکائے سنتے اور معصوم آنکھوں پر لانبی لانبی پلکیں جھپکاتے رہے۔ پھر جھام پور والے بھیا کا مسلمان نوکر براتی سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہے؟"

بھیا نے پوچھا۔

"اتنے وخت جو کھائے وہ پکایا جائے؟"

ٹھاکر اور بھیا کے بولنے سے پہلے لالہ سدگر اپنی کرسی سے ابھرے اور چوڑی چوڑی کھچڑی بھویں اٹھا کر فیصلہ کن لہجے میں بولے

"تم کو جو کھانا ہو وہ پکا لو...... بھیا کا کھانا نہیں پکے گا۔"

بھیا تو کسما کر رہ گئے لیکن ٹھاکر بول اٹھے۔

"شیخ تو میرے ساتھ کھایا کرتے تھے سدگر۔"

"ہاں لیکن آپ بیمار ہیں اور یہ بغیر گوشت کے نوالہ نہیں توڑتے ہوں گے۔ بلاوجہ بھنڈارا الگ کر کے کیا کیجئے گا۔"

"خیر...... تمہاری مرضی!"

جمیل نہا دھو کر فارغ ہی ہوا تھا کہ لالہ چاچا کا آدمی آ گیا۔ خیمے میں قدم رکھتے ہی بے داغ چوکا نظر آیا۔ رمضان سپاہی چینی کی پلیٹیں چن رہا تھا۔ شیشے کے گلاسوں میں پانی بھر کر وہ باہر چلا گیا۔ دوسری طرف سے چاچی آ گئیں۔ بھاری بھرکم جسم پر لہریا کنارے کی سفید دھوتی لپیٹے بھاگل پوری چادر اوڑھے بھاری بھاری زیور پہنے چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی آئیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں وہ ان کے جسم سے اٹھتی ہوئی ممتا کی خوشبو سے مہک اٹھا۔

"کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

کسی نے کہا اور لالہ بیٹھ گئے۔ اندر سے گرم گرم پوریوں کی تھالی لپ چھپ آتی رہی۔ جمیل اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہی ہوا تھا کہ ایک شیریں آواز آئی۔

"ہولستے!"

جمیل نے چونک کر اوشا کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ وہ چھوٹا سا گھونگھٹ نکالے اسی طرح کھڑی رہی۔

"کیوں لالہ ...... اوشا کی شادی میں تو بھیا آئے نہیں تھے۔"

"نہیں ...... یہ چھٹیاں منانے نینی تال گئے تھے۔"

لالہ نے ہاتھ روک کر جواب دیا۔

"اس کی شادی بھی شیخ صاحب نے کی تھی۔"

"دوسری باتیں کرو دوسری ...... عجیب واہیات عورت ہے۔"

چاچی جھڑکی کھا کر اپنی آنکھیں پونچھتی دوسری طرف چلی گئیں لیکن چاچی کے اس جملے نے فضا کی چہل پہل کو ڈس لیا تھا۔ اوشا پوری کی تھالی لے کر آئی۔ جمیل کے انکار پر ایسا تحکمانہ اصرار کیا کہ اس نے پوری کو قبول کر کے پہلی بار اوشا کو نگاہ بھر کر دیکھا لیکن ان سیاہ بےباک اور بےپناہ آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور سر جھکا کر نوالے بنانے لگا۔ ہاتھ بھر لمبے چاندی کے تھال سے بیڑہ اٹھا کر اس نے پھر آنکھوں کو جسارت کی اجازت دی۔ پھر چاچی آگئیں۔ لالہ اپنی چھولداری میں قیلولہ کرنے اور حقہ پینے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی چاچی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے ورجنوں امراض اور لالہ کے چڑچڑے پن کا رونا رو کر اوشا کے موضوع پر آئیں جو اپنا پورا چہرہ کھولے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

"گھرانا بڑا اچھا ہے بیٹا ...... لڑکا بھی سبھاؤ کا اچھا ہے ...... ویسے تو فوج میں ہوتے ہی ہیں سب لٹھ مار ...... ولایت پڑھنے گیا ہے آج کل ...... تمہارے باپ کی خبر سن کر کیسا کیسا بلکی تھی اوشا مگر آنے نہیں دیا ان لوگوں نے ...... بری کے زمانے میں اس کے ولایت جانے کا معاملہ آن پڑا ...... ارے یہ سمجھ لو بیٹا ...... کہ جس کو آنا کہتے ہیں تو اب آئی ہے اوشا۔"

"مائی!"

"ہاں!"

"اب بھیا جی کو آرام کرنے دو ...... اپنی باتیں تو میں خود کر لوں گی ان سے۔"

"اسے تو ہوگی لفٹیننٹ کی بیوی تو اپنے گھر میں ہوگی مجھ پر بابا کی طرح رعب مت جھاڑ ...... ہاں نہیں تو۔"

جمیل اپنے شامیانے کے دوسرے درجے میں آیا جس کی پشت پر چھولداریاں لگی تھیں اور داہنی طرف کینوس کی دیوار کے پیچھے لالہ چاچا کا زنانخانہ تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر ہمیشہ کی طرح لیٹا لیکن نیند ہمیشہ کی طرح نہ آئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر اس نے یہ سوچ کر اطمینان کر لیا کہ اس شور میں بھلا کوئی سو بھی سکتا ہے؟ ...... اس خیال کو تسلیم کر لینے کے باوجود اس کے دل میں ایک اندیشہ ایک کانٹا کھٹک رہا تھا جس کا عرفان جتنا ایک عام آدمی کے لیے آسان تھا اتنا ہی جمیل کے لیے مشکل تھا۔ عورت کے ہجر میں اس کی راتوں نے کبھی ستارے نہیں گنے تھے۔ اس کے دلوں نے آبلہ پائی نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کی کسی گھڑی پر کسی عورت کی ایسی پرچھائیں نہ تھی جو خوابوں کے دیپ جلاتی ہے ...... جو آرزوؤں کے گلاب کھلاتی ہے۔ اسے جس عورت کا سب سے پہلے

نشاط انگیز تجربہ ہوا تھا وہ ایک نٹنی تھی جو جام پور کے دسہرے کے میلے میں ناچنے آئی تھی۔ چمکدار کپڑوں اور کھنک دار زیوروں میں وہ ایک رانی کی طرح جھمک رہی تھی لیکن اس کے دیوان خانے کے وسیع ہال میں جب وہ رانی پہنچائی گئی تو کپڑوں کا کلابتو، زیوروں کا ملمع اور عارضوں کا غازہ جھوٹا پڑ گیا۔ وہ ایک خوبصورت بھکارن کی طرح دس روپوں کے لیے گڑگڑائی اور اس کے مخملیں جوتوں کو اپنے صندلیں ہاتھوں سے سہلانے لگی۔ جمیل نے اسے روپے دیے اور چھوئے بغیر رخصت کر دیا۔ ہفتوں اس کی غلاظت کی وجہ سے جمیل کا جی متلایا کیا لیکن آج جب وہ اپنے ذہن کو گمراہی سے بچانے کے لیے ان کھیتوں کا تصور کرتا جن میں اس کا گیہوں لہلہا رہا تھا تو کسی مینڈھ سے اوشا اٹھتی اور کھیتوں کے سبز پس منظر میں اپنی ترلونی ساری اور سنہرے بدن کا جھمکڑا اس ادا سے دکھلاتی کہ جمیل کی آنکھ جھپک جاتی۔ دل کی مٹی سے دفعتاً اُگ آنے والے شرمناک اور سہ زور خیالوں کو وہ اخلاق کے چابک مار کر رام کرتا اور اپنے ان اونچے اونچے بیلوں کا تصور باندھتا جن کا سارے جوار میں شہرہ تھا تو ان کی گردنوں پر رکھے ہوئے "ادھے" کا ریشمی پردہ پھڑپھڑاتا اور اوشا کی بے پناہ آنکھیں اس پر تڑپ کر گر پڑتیں۔ وہ اپنی نئی شیروانی کی گرد کی طرح ذہن سے خیالوں کو جھاڑتا اور اپنے اس کچے بنگلے کے متعلق سوچنے لگتا جس میں مہندی کی باڑھوں کی دیواریں تھیں اور جس پر پھولدار بیلوں کا گتھا ہوا چھپر پڑا تھا اور جس میں دروازوں کے بجائے پھولوں کی محرابیں کھڑی تھیں تو اس میں بچھی ہوئی نازک منقش مسہری کے مخملیں بستر سے اوشا انگڑائیاں لیتی اٹھتی اور اپنی سینے کی ٹھوس باہیں چمکاتی مسکراتی گزر جاتی۔ وہ بیقرار ہو کر اٹھا اور شامیانے کے سامنے سے صحن میں بچھی ہوئی ٹھنڈی چمکیلی دھوپ پر ٹہلنے لگا، ٹہلتا رہا۔

سورج غروب ہوتے ہی میلے نے دوسری کروٹ لی۔ میل بھر کے رقبے کے اندر کوئی لاکھ ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا ہجوم چھوٹی سی جھیل میں ہزاروں پرندوں کی طرح کلبلانے لگا۔ آوازوں کا شہر آباد ہو گیا۔ روشنیوں کی بستیاں جگمگا اٹھیں۔ سینماؤں، نوٹنکیوں، ناٹکوں اور تماشوں اور خفیہ امراض کی دواؤں کے اشتہارات اتنی تندی سے ہونے لگے کہ اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔

"بھیا جی کا بلاوت ہیں۔"

ایک بی ٹھٹی بھرن ٹھلکتی مٹکتی آئی اور گھنٹی سی بجا کر چلی گئی۔

چاچی چوکے پر سیاہ کامدار شال اوڑھے پیتل کا مندر نما پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ ان کے پہلو سے لگی زعفرانی ساری باندھے اوشا بیٹھی تھی۔ اس کی کندنی پیشانی پر یاقوت کا گول ٹک رکھا تھا۔ اوشا نے نگاہ اٹھائی تو جمیل سیاہ گہری آنکھوں میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ پھر دور کہیں جلترنگ کی رجاتی دھن بجنے لگی۔

"بھیا جی ہمارا فیصلہ کرائیے۔"

اور جمیل کچھ کہنے کے بجائے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ماں اور ٹھکرائن چاچی سب لوگ سنیما دیکھنا چاہتی ہیں اور ہم کلکتے میں روز روز دیکھ کر اکتا گئی ہوں تو آج کہیں نہ نوٹنکی دیکھی جائے...... کے بھیا!"

"رام رام..... نوٹنکی بھی کوئی تیرے دیکھنے کی چیز ہے؟"

"کیوں؟"

"ارے وہاں سب پاپی چمار دھنے ہوں گے۔"

"ہاں! اور سنیما میں تو جیسے سب باہمن ٹھاکر براجمان ہوں گے .... ارے مائی! یہاں کے سنیما میں تو سب بھر دیہاتی ہوں گے بھر دیہاتی ..... کے بھیا!"

اور راوشا کی لونی آنکھوں نے بڑے لاڈ سے تائید کی منت کی۔

"یہ بات تو ہے چاچی!"

"اچھا تو بڑی دھرن اور راوشا نوٹنکی دیکھیں ...... اور ہم سب کیرتن کے بعد کھا پی کر سنیما دیکھنے جائیں گے۔ کوئی لالہ کو بلا لاؤ ذرا۔"

مسرور و شادماں جمیل نے رام سکھ کو حکم دیا کہ پانچ چھ سیٹیں رکوا لے۔"

جب وہ اپنے پاجامے کی چوڑیاں دیکھتا اور شیروانی کا دامن برابر کرتا باہر آیا تو الاؤ کے گرد بیٹھی ہوئی بھٹارہ اور جام پور کے آدمیوں کی بھیڑ کھڑی ہو گئی اور چلنے کی تیاری میں اپنی چادروں، مرٹھوں اور لاٹھیوں کو سنبھالا۔ پھر اندھیرے ٹھنڈے اور کچے راستے پر اوشا آ گئی۔ اوشا کے پیچھے پکی عمر کی وہ دھرن تھی جو بھیا جی کے لیے بڑی تندہی سے پوریاں تلتی تھی۔ لالہ سدگر کئی آدمیوں کے ساتھ سترکھ کے شامیانے سے نکلے لیکن "بھیا" کے پیچھے ایک چھوٹے موٹے لشکر کو حرکت میں دیکھ کر چپ سادھے کھڑے رہ گئے۔ سرکھ کا میلہ اپنے مذہبی تقدس کے علاوہ بھی کئی باتوں کے لیے مشہور تھا۔ ہردوئی اور سیتا پور کے کھاتے پیتے بدمعاش چھوٹے چھوٹے راستوں میں پھنسے ہوئے مجمعے میں عورتوں کے ساتھ خوش فعلیاں تو کرتے ہی تھے لیکن موقع ہاتھ آ جانے پر اٹھا لے جانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شرفا رات میں اپنی عورتوں کو باہر نکالنے سے گریز کرتے تھے یا پھر سخت انتظام کرتے تھے۔ جمیل اسی ماحول میں جوان ہوا تھا۔ وہ مراد آبادی برتنوں کی دکانوں کا پورا چکر لگا کر نوٹنکی کے شامیانوں کی پشت پر نکلنا چاہتا تھا اور سرکھ کے میلے کے سب سے چوڑے راستے پر اپنے آدمیوں کے حلقے میں رینگ رہا تھا۔ اپنی پشت پر ہاتھ محسوس کر کے اس نے گردن موڑی تو کندھے پر وہ دہکتی ہوئی آنکھیں رکھی تھیں۔

"ادھر سے چلیے۔"

اپنے بازو پر رکھے ہوئے ریشمی ہاتھ کو اس نے آہستہ سے تھپتھپایا اور رام سکھ کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے آدمیوں کا حلقہ مڑنے لگا جیسے کچے راستے میں نوے ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے موڑ پر اینٹوں سے بھری ہوئی لاری مڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اب وہ اس راستے پر آ گئے جس کے دونوں طرف کھیل تماشوں کے تنبو لگے تھے اور جہاں مجمع تقریباً جم گیا تھا۔ وہ تھوڑی دور اور رینگ آئے۔ پھر بھیڑ کا ایک ریلا آگے سے آیا جسے اس کے آدمیوں نے کسی نہ کسی طرح سنبھال لیا۔ فوراً ہی دوسرا ریلا پشت سے آیا جس نے آدمیوں کا حلقہ توڑ دیا۔ جمیل کے پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے تھے اور دماغ آدمیوں کی بُو سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ سنبھلنے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا کہ وہ سیاہ چمکتی آنکھیں اس کے سینے پر چمک اٹھیں اور ریشمی ہاتھ اس کے بازوؤں پر جکڑ گئے۔ پکے ہوئے ہونٹوں نے ملد ذکر کچھ کہا لیکن شور کے طوفان میں قہقہوں کی چمک اپنی غرور کا انتقام دیکھے بغیر ڈوب گئی۔ [illegible]

تی۔ آدمی اسے اپنے گھیرے میں لینے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ اوشا کے چہرے پر جمیل کی سانسیں اور گرم ہونے لگیں۔ پھر بیل کے زندہ نز پر ہاتھ سونے کی راکھ سے تھسے ہوئے مخلیں پوروں پر پھسلنے لگے اور وہ دونوں کھڑے ہوئے اپنے اپنے خداؤں سے دعا مانگتے رہے کہ ان لمحوں کے کچے دھاگوں کو ابد سے باندھ دے۔ پھر بوڑھے رام سکھ نے اپنے غول کو سمیٹا اور پورا زور لگا کر جمیل کی لبالب بھری ہوئی گاڑی کو دلدل سے نکال کر نوٹنکی کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا۔ جب ایک ملازم نے اندر چلنے کو کہا تب جمیل کو ہوش آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے اوشا کی طرف جھکا تھا کہ اوشا نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کیمپ چلئے...... میرا جی الجھتا ہے۔"

رام سکھ نے شوقین لونڈوں کو نوٹنکی کے حوالے کیا اور خود بوڑھے بوڑھے آدمیوں کو ساتھ لے کر میل بھر کا چکر کاٹ کر اسے کیمپ پہنچا دیا۔ ستر کھڑک مسلمان سپاہی کندھے پر بندوق دھرے تینوں کیمپوں پر پہرہ دے رہا تھا۔ پھر مانک پور کے خیمے کے پردے گرا دئے گئے۔ جلتی ہوئی لالٹینیں تھما گئیں۔ اوشا کی روشنی سے تنکا تنکا چمک اٹھا۔ مہرن نے کیتلی انگیٹھی پر رکھی اور چائے کے برتن میز پر جما کر سوالیہ نشان کی طرح کھڑی ہو گئی۔

"تم درشن کر آؤ مگر جلدی آنا۔"

وہ باہر نکل بھی گئی لیکن وہ دونوں اجنبی سے بیٹھے رہے۔ جمیل اوشا کی ننھی انگلیوں کے رنگین ناخنوں کی لویں دیکھتا رہا۔ آوازوں کے سمندر میں خیمہ خاموشی کا جزیرہ بنا کھڑا تھا، کھڑا رہا۔

پھر سارنگی کے تاروں کی طرح تنا ہوا سناٹا جمیل کے قدموں سے جھنجھنا کر رہ گیا۔ اوشا لب ہلانے کی جرأت کو آواز دیتی رہ گئی۔

ٹھنڈے خیمے میں لگے ہوئے نرم گرم بستر پر وہ کروٹیں بدلتا رہا...... اور کینوس کی دیوار کے اس طرف چوڑیاں باتیں کرتی رہیں...... وہ ان کی اجنبی بولی سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

صبح ناشتے پر جمیل نے کنکھیوں سے ان نا آشنا آنکھوں کی بے پروا نگاہوں کو ٹٹولا جو رات کا خواب کہیں بھول آئی تھیں۔ چاچی رات کے تماشے کے واقعات دہراتی رہیں اور اپنے سارے بدن کے ساتھ ہنستی رہیں۔ جمیل ان کا رسماً ساتھ دیتا رہا اور اپنے خیالوں کے سہرے دیس میں بھٹکتا رہا۔ اوشا گرہستن کی پوری گمبھیرتا کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف کیے ہوئے ادھر سے ادھر آتی جاتی رہی۔

وہ ٹھاکر کے خیمے میں بیٹھا ہوا میلے کے انتظام پر گفتگو کر رہا تھا جب پاسی نے ابّی کا خط لا کر دیا۔ طلبی کا حکم پڑھ کر اور ٹھاکر سے اجازت لے کر وہ لالہ بابا کے یہاں آیا اور ان کو خبر سنائی اور سوار ہونے سے پہلے وہ چاچی سے ملنے کے بہانے پھر خیمے میں گیا لیکن وہ ایک وسیع قبر کی طرح خاموش تھا۔ اوشا سے ملے بغیر وہ سوار ہو گیا۔ اس نے آنگن ہی سے دیکھا کہ دالان میں زمین پر چاندنی بچھی ہے۔ گاؤ سے ٹیک لگائے فقیر ماموں بیٹھے ہیں۔ حاجی صاحب دلہری شریف کے سچے مرید کی طرح۔ گیروے رنگ کی موٹی چادر آدھی باندھے آدھی اوڑھے ہوئے۔ سیاہ داڑھی سینے پر اور سیاہ پٹّے شانوں پر لہراتے ہوئے فقیر ماموں بڑھاپے

کے بعد کہیں اپنی بہن کے یہاں چکّر لگاتے تھے لیکن ان کی آمد ہمیشہ سیاسی ہوا کرتی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھا ہوا رسمی باتیں کرتا رہا اور ان کی منقش کھڑاؤں کے نقوش گھورتا رہا اور سوچتا رہا کہ فقیر ماموں کس کس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہاں آسکتے ہیں۔ پھر جب وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا تب کسی نے اطلاع دی کہ باہر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ منشی بکر قصاب کی صورت دیکھ کر اس کی بھویں تن گئیں۔ منشی دوسرے بوڑھے بوڑھے آدمیوں کے ساتھ سلام کر کے اس کے بیٹھنے تک کھڑا رہا پھر بغیر اجازت لیے تخت پر اطمینان سے جم گیا اور پھیلا پھیلا کر بولا۔

"کچھ مولوی صاحبان شہر سے آتے ہیں۔ عشا کی نماز کے بعد وعظ دیں گے۔ ان کے کھانے دانے کا بندوبست میں نے کیا ہے ——!"

دوسرے بزرگ نے گڑگڑا کر کہا۔

"حاجی کی درخواست ہے کہ آپ بھی مولوی صاحبوں کے ساتھ کھانا کھالیں۔"

"میں سفر سے آرہا ہوں ...... تھکا ہوا ہوں ...... کھانا وانا نہیں کھاؤں گا۔"

"آپ جو پرہیزی کھائیں وہ پکوایا جائے۔"

"جی ..... جھام پور میں پکوڑوں دھنیوں کے یہاں ٹھہرنے والے مولویوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ میں ان کی سلامی مجرائی کرنا پسند کرتا ہوں ...... سنا آپ نے؟"

"جی!"

"جا سکتے ہیں آپ۔"

عصر کی نماز کے وقت جب وہ ٹہلنے کے لیے باہر نکلا تو چکّر کاٹ کر منشی کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ اس کے دروازے پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگا تھا اور چبوترے سے لے کر چھپر تک میلا میلا فرش بچھا تھا۔ یہاں سے وہاں تک بستی کے بزرگ مسلمان بیٹھے تھے۔ ان کے جلو میں کئی اجنبی صورتیں داڑھیوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں اور بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ گزرا تو کئی آدمیوں نے کھڑے ہو کر اسے "سلام" کے بجائے "سلام علیکم" کہا جس کے جواب میں اس نے ہمیشہ کی طرح سر کو جنبش دی۔ تھوڑی دور پر اس نے سنا کوئی اجنبی آواز سلام کرنے والے اور سلام کا جواب قاعدے کے مطابق نہ دینے والے پر تنقید کر رہی تھی۔ وہ ذرا سا جھنجھلایا پھر ان ناگوار خیالات کو ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ آبادی ختم ہو گئی تھی۔ دور دور تک ربیع کی فصلوں کے فرش لگے تھے۔ اور اونچے اونچے درخت خادموں کی طرح سبز وردیاں پہنے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ وہ اس سیدھی سنسان تھرپر ٹہلتا رہا جو مانگ کی طرح نکل ہوئی تھی۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے ڈگی پٹنے کی آواز اور وعظ کا اعلان سنا۔

فقیر ماموں کے ساتھ کھانا کھا کر جب وہ اپنے کمرے میں آگیا اور فقیر ماموں عشا کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلے گئے تب امی آئیں اور اس کے پاس ہی مسہری پر پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئیں۔

"فقیر بھائی نے آج پھر مجھ سے کہا ہے۔"

"جی!"

"بٹے بھیا کی لڑکی کے لیے...... ماشاء اللہ جوان ہوگئی۔ صورت سیرت دونوں میں ایک ہے.... میں یہ

"آپ نے کیا کہا ان سے؟"

"میں...... میں کیا کہتی..... میں نے وہی کہا جو تمہارے باپ نے مرنے سے پہلے کہا تھا...... وہ تو تاریخ کے لیے آئے ہیں۔"

"آپ فی الحال ٹال دیجئے.... امی!"

"کیا؟"

"میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گی لیکن...... ابھی ٹال دیجئے!"

وہ بڑی دیر تک آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور نجمہ کو دیکھتا رہا جو اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے شیریں ناگواری کے ساتھ پھوپھی جان کو پکار رہی تھی کہ دیکھئے مجو بھیا مجھ کو گدگدا رہے ہیں...... میری مہندی خراب کیے دے رہے ہیں۔ پھر اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ بھنچ گئے۔ کمرے کا کوئی دروازہ کھول کر اوشا آ گئی اور اپنے کرتک لہراتے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اس کی پٹی پر اداسی سے بیٹھ گئی۔ جمیل کا جی چاہا کہ جھمک سے چٹیا پکڑ کر باہر نکال دے اور کمرے کی ہاتھ بھر لمبی موٹی زنجیر لگا دے۔ نعرۂ تکبیر کی آواز سن کر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر آیا۔ پہرے کا پاسی بلم لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر سانٹ ہو گیا۔ جامع مسجد کے سامنے میدان میں شامیانہ لگا تھا۔ پچاتی فرش بچھے تھے گیسیں جل رہی تھیں۔ پیچھے بیٹھی ہوئی عورتیں لڑ رہی تھیں اور بچے کو چپ کرانے کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ ایک مولوی صاحب سر پر عربی رومال باندھے ہوئے پوری آواز سے پاکستان کے فوائد بیان کر رہے تھے۔ وہ درختوں کے اندھیارے میں ٹہلتا رہا اور تقریر سنتا رہا۔

صبح کو جب وہ فقیر ماموں کو روکنے کے لیے اصرار کرتے کرتے تھک گیا اور مجبور ہو کر ان کو پہنچانے کے لیے باہر نکلا تو ان گنت مکانوں کی منڈیروں پہ بانسوں اور سینٹھوں میں لگے ہوئے مسلم لیگی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس دن اس نے مجام پور کو ایسی خالی خالی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی بستی میں بھٹک کر آ گیا ہو۔ وہ دیر تک اپنے جوتی دار پائجامے کی چوڑیاں دیکھتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ ادھے میں جوڑے ہوئے بڑے بڑے بیل پھنپھناتے رہے اس کے نوکر ان کو گالیاں دے دے کر سنبھالتے رہے اور وہ غور کرتا رہا کہ وہ اپنی قوت فیصلہ کہاں رکھ کر بھول آیا ہے آخر اوشا کو دیکھنے کی خواہش سے دست بردار ہو کر اس نے ادھا کھول دینے کا حکم دیا اور دیوان خانے میں بچھی ہوئی مسہری کے ٹھنڈے قالین پر لیٹ گیا۔

جس دن مانک پور جانے ہوئے لالہ چاچا مجام پور سے گزرے تو اس نے ان کا ادھا روک لیا اور پھلا پھسلا کر چاچی سے اترنے کو کہا۔ چاچی نے خانگی مصروفیات کا بہانہ کر کے اوشا کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اگر چاہے تو شام تک کے لیے ٹھہر جائے اور جمیل کے پہلی ہی بار کہنے پر وہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ پھاٹک پر ادھا لگایا گیا اور ساقی نے اوشا کو اتار لیا۔ وہ مسکرا مسکرا کر اسی سے باتیں کرتی رہی۔ جمیل تھوڑا دور سے کھا اندر آیا اور اسے اپنا نیا ریڈیو سنوانے کے لیے باہر لے آیا۔ ڈیوڑھی پر پہنچتے ہی اس نے آواز دی کہ نوکر دیوان خانے میں نہ جانے پائیں اور پھاٹک بند کرا دیا جائے۔ جب جمیل نے ہال کی چلمن اٹھا کر اوشا کو آگے بڑھنے کا

مہذب اشارہ کیا تو اس نے تیکھے تیوروں سے جمیل کو دیکھا اور بولی۔

"میں اتنی بُری لگتی ہوں آپ کو۔"

"کیا؟"

جمیل کو ایسا لگا جیسے کہانیوں کے اس بدنصیب انسان کی تقدیر بدل گئی ہو جو بھیک مانگنے کسی شہر میں صبح ہی صبح داخل ہو ہو اور شہر والوں نے اسے پکڑ کر بادشاہ بنا دیا ہو۔

"اگر آپ آنے کے لیے کہتے تو میں باندھ کر نہ روک لیتی۔"

"یہ آپ ٹکر ٹکر کیا دیکھے جا رہے ہیں کچھ منہ سے بولیے۔"

"میں کیا بولوں...... میں بولنے کے قابل کہاں ہوں...... میں اگر اپنی مرضی کے مطابق کچھ ہو سکتا...... تو آج تم میرے گھر میں اس طرح نہ آتیں جس طرح آئی ہو۔"

"پھر کس طرح آتی؟"

اس کے لہجے میں آشتی کی قلعی تھی۔

"تم...... تم اس طرح آتیں...... کہ یہاں شامیانے لگے ہوتے...... ڈھولکیں بج رہی ہوتیں...... رنڈیاں ناچ رہی ہوتیں۔ اندر عورتیں بھری ہوتیں اور باہر آدمی۔ تمہارے ہاتھوں میں مہندی ہوتی اور مانگ میں موتی اور تم اتنی عورتوں میں گھری بیٹھی ہوتیں کہ میں تم سے ملنے کے ہزار جتن کر کے بھی نہ مل پاتا۔"

اوشا نے ہلکے سے اپنے ہاتھ چھڑا کر ریڈیو آن کر دیا۔

"لیکن میرے راستے میں ایسی ایسی سنگین دیواریں کھڑی ہیں جن کے توڑنے کے لیے پورے پورے دو جنم بھی تھوڑے ہیں۔"

پھر اوشا بٹیا کو پکارتی ہوئی جہاندیدہ ائی اندر آ گئیں۔

عصر کی نماز کے وقت سے اوشا چلنے کے لیے بظاہر بے قرار ہونے لگی اور جمیل خوبصورتی سے ٹالتا رہا۔ جب گلابی دھوپ اونچی اونچی دیواروں سے بھی پرے چلی گئی تب دروازے پر تاڑے لگنے لگے اور جمیل پوری بے نیازی کے ساتھ اوشا کے تانگے پر سوار ہو گیا، دوسرے پر آدمی بیٹھ گئے۔ جب سُرمئی فضا کا رنگ گہرا ہو گیا اور رحیم پور کی بستی پیچھے چھوٹ گئی تب بھاگتے اور ہچکولے کھاتے تانگے میں اوشا کا ماہتاب سا چہرہ اس کی گود میں ڈھلک آیا اور وہ آسمانوں پر پرواز کرتا رہا۔

پھر وہ الکشن آ گیا جس نے ایک دل، ایک جان، ایک زبان، ایک تہذیب، ایک تاریخ اور ایک ملک کو تقسیم کر دیا۔ کئی دن پہلے سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ منشی بکر قصاب دیکھتے دیکھتے حاجی صاحب بن گئے۔ گوشت کی دکان بند کر کے لاٹا گئی اور رنگا پاجامہ پہن کر وہ آنے والے مولویوں کی مدارات کرنے لگے۔ چوپالوں میں گردش کرتے ہوئے حقوں کی گڑگڑاہٹ، پاٹ دار قہقہے، ناول جیسی داستانیں اور خون نچوڑ کر دینے والے لطیفے سب معلوم نہیں کہاں ہجرت کر گئے۔ ساری آبادی پر ایک جوشیلے تیور والی فضا طاری ہو گئی۔ شادی بیاہ میں پہنے جانے والے دمدار کپڑے پٹاروں اور ٹین کے بکسوں کا منہ کھول کر نکل آئے۔ تنگ [illegible]

کے پتے اور بوسیدہ اچکنیں پڑے پرانی ہوئی دیکھی جانے لگیں۔ مسجدوں میں میلے لگے رہنے لگے اور جمیل چہروں کی کتابیں پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پانے لگا۔

پھر وہ رات آئی جس کی صبح کو سیتا پور میں ووٹ پڑنے والے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ جمعیۃ العلماء کے ایک ٹوٹے پھوٹے مولوی سے ملنے گیا۔ ... تھا کہ چاروں طرف سے مولویوں نے اسے گھیر لیا اور دلیلیں دلا دلا کر کوشش کی کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسی میں قوم کی فلاح ہے ... اسی پر قوم کا اتفاق ہے ... وہی قوم کا مقدر ہے۔ جمیل اسکول کے طالب علموں کی طرح خاموشی سے ان کی تقریریں سنتا رہا۔ پھر جب وہ تھکنے لگے تب اس نے اپنی ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ اٹھایا اور مضبوط آواز میں بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتا اور اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس قصبے میں جہاں میرے آبا و اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں مسلم لیگ کو شکست ہوگی اس لیے کہ میں اس کو ووٹ نہیں دوں گا۔"

مولوی صاحبان چلے گئے اور وہ پھندنا ..... وہ مغرور پھندنا جس کے پھریرے پر قوم کا مستقبل مرقوم تھا دیوان خانے کے کونے میں کھڑا رہا۔

صبح ہوتے ہی مڈل اسکول کی وسیع عمارت کے احاطے میں جمیل کی آرام کرسی ڈال دی گئی اور اس کے نوکروں کا دستہ اجلے کپڑے پہن کر کھڑا ہو گیا۔ ووٹ پڑنے سے تھوڑی دیر قبل جمیل آیا اور اس کرسی پر دراز ہو کر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا۔ آہستہ آہستہ حاجی منشی کا شامیانہ سا جڑنے لگا اور جمیل کی کرسی کے پیچھے بچھے ہوئے عیدگاہ کے فرش پر تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ سیتا پور سے آئے ہوئے مولوی صاحبان نے طلاقت لسانی کے سارے جادو جگائے۔ ایک ایک سبق کا آموختہ پڑھا۔ ایک ایک مضمون کو دس دس رنگ سے باندھا مگر جمیل کے سایے میں بیٹھی ہوئی اکثریت کے کان پر جوں نہ رینگی۔

ابھی "فتح" کا اعلان کرنے والے گولوں کے فلیتے گرم تھے کہ اس "فساد" کی ہیجان انگیز خبریں آنے لگیں جس کی سرخی کے لیے کروڑوں دلوں نے اپنے لہو کی سبیل لگائی تھی۔ سیتا پور کے بازار سے آنے والے اخبار لاتے جسے ایک پڑھتا اور دس سنتے اور روز سنی ہوئی خبروں کو نمک مرچ لگا کر دوسروں کو سناتے اور چٹخارے لیتے۔ پھر مسجدوں کی صفوں پر جانے کی نمازوں کا گمان ہونے لگا۔ میلاد شریف کی محفلوں پر جملہ کے ناکوں کا شک ہونے لگا۔

جمیل کے ذہن پر ہتھوڑے چلتے رہے۔ اعصاب پر ٹوٹ جانے والے تار کا تناؤ رہنے لگا۔ جب بوڑھے بوڑھے چہرے خوف کے وظیفوں کا ورد کرتے اس کے پاس آتے تو وہ بے خوف آواز میں ان کی دلداری کرتا ان کی ڈھارس بندھاتا لیکن جب وہ چلے جاتے تب وہ خوف سے لرز لرز اٹھتا۔ ایک صبح وہ ناشتہ کر کے باہر آیا۔ ہال میں داخل ہوتے ہوتے اس نے دیکھا کہ پھاٹک پر پھاٹک کا آدھا کھولا جا رہا ہے۔ پھر آدمی اپنے اپنے سر گھما کر کھڑے ہو گئے اور رادھا برآمد ہوئی۔ وہ سیدھی اسی کے پاس چلی آئی اور جمیل نے دیکھا کہ ان سب کی چمکیلی آنکھوں پر سہمنے کی عادت نے اپنے سایے ڈال دیئے ہیں اور قاتل نگاہوں کی دھار اتر گئی ہے اور رادھا نے اس کی بے خواب آنکھوں میں وحشت کی پرچھائیاں دیکھ لیں۔

"اپنی آنکھوں سے تمہیں بخیریت دیکھنے کے لیے میں نے کتنی بار تم کو بلایا۔"

"میں تو نانک پور آتا ...... لیکن یہاں یہ خبر اڑ جاتی کہ میں پاکستان چلا گیا ہوں اور پھر معلوم نہیں کیا ہوتا۔"

"میں تو اخبار پڑھ پڑھ کر پاگل ہوئی جاتی ہوں۔"
"میرے پاگل پن کو سمجھنے کے لیے اپنے پاگل پن کو کم سے کم دس سے ضرب دے دو۔"
"میں ایک بات کہوں؟"
"کہو۔"
"تم پاکستان چلو۔"
"پاکستان ــــ..... تم پاکستان جانے کو مسرکھ جانا سمجھتی ہو کہ میرے منہ سے ایک لفظ نکلا اور وہاں خیمے برپا ہو گئے، باورچی خانہ قائم ہو گیا، پہرہ کھڑا ہو گیا۔ پاکستان جانے کا مطلب ایک نیا جنم ہے، ایک بن باس ہے جس کو جھیل لے جانے کی میں اپنے آپ میں طاقت نہیں پاتا۔"
"تم خوب سوچ لو۔"
"اور اتنے دنوں میں نے کیا کیا ہے؟ تم یہ مکان دیکھتی ہو..... یہ جائداد دیکھتی ہو، یہ نوکر چاکر دیکھتی ہو لیکن تم یہ نہیں دیکھتیں کہ میری ایک بیوہ پھوپھی ہیں جو اپنے پاندان کے لیے میرا منہ دیکھتی ہیں، ان کے پانچ بچے ہیں جو اسکول کی فیس کے لیے میرا دامن پکڑتے ہیں۔ میری ایک بچی ہیں جن کی دو بیٹیاں ہیں..... جو تم سے بڑی ہیں، خجلہ سے بڑی ہیں جن کی جوانی شادی کا انتظار کرتے کرتے سو گئی ہے۔ اس بستی کے بوڑھے بوڑھے آدمی ہیں جن کے سروں پر بہت سی دوسری تلواروں کے ساتھ ایک تلوار یہ بھی لٹک رہی ہے کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں..... اور یہ مسجدیں ہیں جن میں کبھی میں نے نماز نہیں پڑھی لیکن یہ مجھے اپنا محافظ سمجھتی ہیں..... یہ درگاہیں ہیں جن پر کبھی میں نے فاتحہ نہیں پڑھا لیکن ان کی حفاظت میرا فرض ہے..... میں کہاں جاؤں..... میں ان سب کو کہاں لے جاؤں؟ کاش میں رئیس جہام پور کے گھر کے بجائے کسی مزدور کے گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ صبح سے شام تک ڈلیا ڈھوتا اور رات کو جوتی کی روٹی اور چولائی کا ساگ کھا کر باٹ دار آواز میں برہا گاتا اور سو جاتا۔"
اس کی آواز بھرا گئی..... اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اوشا اپنی کرسی سے اٹھی۔ اپنے آنچل سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔
"تم نے میری بات کو دھیرج سے نہیں سنا..... تم نے میری بات پر دھیان نہیں دیا..... جنم تمھارا نہیں میرا ہوگا..... میں اوشا نہیں رہوں گی..... میں تجمہ ہو جاؤں گی..... بن باس تمھارا نہیں میرا ہوگا۔ تم چودہ برس میں چودہ دفعہ آ سکو گے... میں مر کر بھی یہاں نہ آ سکوں گی۔"
"تم!"
"ہاں..... میں..... میں سونا نہیں نیم کی لونگیں پہنوں گی..... ریشم نہیں ٹاٹ پہنوں گی۔ وہ بھی جب تمھاری ماں پہن لیں گی..... تمھاری ماں سے بچ رہے گا۔"
پھر اوشا بیٹی کو پکارتی ہوئی امی آ گئیں۔ ان دونوں نے گھبرا کر اپنی اپنی آنکھیں پونچھیں۔ اپنے چہروں پر بحالی کے نقاب ڈال لیے۔ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی سرخی لگا لی۔
جاگتے جاگتے رات کی آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ سوچتے سوچتے دل کے اعصاب شکستہ ہو گئے مگر دل کی بیقراری کو کسی کروٹ

کسی صورت قرار نہ آیا۔

چیت آگیا فصل پک کر تیار ہوگئی۔ سہ پہر بانوں نے کٹوانا شروع کر دیا۔ جب مڑخی چلنے لگی ملّہ او سایا جلنے لگا تب
بہت اصرار کے بعد جمیل اپنے پھاٹک کے باہر نکلا۔ دن دوپہر سنسان بستی میں لٹکے ہوئے چہروں اور سوجی ہوئی آنکھوں کے سلام
لیتا ہوا کھلیان پہنچا تو مدتوں کے بعد فضا کچھ چونچال نظر آئی۔ دراز گھنگھٹوں میں تبسم کے چراغ جل رہے تھے۔ سیاہ لہنگوں کے جھول
میں پنڈلیوں کی مشعلیں روشن تھیں۔ دو رنگ سنہرے اناج کے ٹیلے کھڑے تھے جن کے نظارے نے آنکھوں کو مست کر دیا تھا
شوخ لڑکے چہلیں کر رہے تھے۔ بڑے بوڑھے ان کو گھڑک کر جمیل کی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے جو سینے پر بازو باندھے ٹہل
رہا تھا۔ پھر ایک سہ پہر بان گھڑے میں گوبر گھول کر لایا اور دوسرے نے لکڑی کا چھاپا اس میں بھگو بھگو کر راس کو چھاپ دیا۔ وہ نہر میں
نہاتی ہوئی عورتوں کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے گھر آیا۔ جانماز پر بیٹھی ہوئی امّی نے اسے اشارے سے بلایا اور بڑے ماموں کا
پاکستان سے آیا ہوا خط پکڑا دیا۔ وہ سارے خاندان کے ساتھ پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ان کا لڑکا سیکرٹریٹ میں ملازم ہوگیا۔ ان
کو کراچی میں کوٹھی الاٹ ہوگئی تھی اور اب جمیل کی آمد ان کی زندگی کی آخری آرزو بن کر رہ گئی تھی۔ یہ رات جمیل پر بڑی بھاری گزری۔
پنکھا کھینچنے والا خدمت گار اسٹول پر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے فقیر ماموں زعفرانی رنگ کی آدھی چادر باندھے
آدھی اوڑھے نرگھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہے ہیں۔ ایک ہاتھ ان کی تسبیح گھما رہا ہے دوسرا آنسو پونچھ رہا ہے۔ بڑے ماموں کا منکا ہمی
دیوان خانے کے چبوترے سے لگ کر بیٹھ رہا۔ ڈیوڑھی سے امّی کی سسکیاں آ رہی ہیں۔ بڑے ماموں کا خاص خدمت گار رومال سے
چاندی کے روپے نکال نکال کر اس کے نوکروں میں تقسیم کر رہا ہے۔ بڑے ماموں نے اسے سینے سے لگا کر آنسو بہائی آواز میں دعائیں
دیں اور کٹہرے پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ پھر امّی کی بھیجی ہوئی چھوٹی پالکی آئی۔ اس نے ہاتھی کے پاؤں پوجے اور ہاتھی اپنے گھنٹے بجاتا ہوا گراؤنڈ پھلانگ
پھاٹک سے گزر گیا۔ . . . . پھر ایک دھان پان سی لڑکی جوڑا اور زیور میں گوندھی ہوئی . . . . . کچے کام کے ریشم میں ڈوبی ہوئی پازیب کے
چھوٹے چھوٹے گھنگھرو بجاتی ہوئی آئی۔ جھومر سے لدا ہوا سر اوپر اٹھایا . . . . آنسو اور کاجل لگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ جگمگاتے ہوئے
ہاتھ نے پیشانی پر چمکتے ہوئے ٹیکے کو چھو لیا . . . . . . اور جمیل اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر بیٹھ گیا . . . . . بیٹھا رہا . . . . . .

امّی کی تہجد کی نمازوں کا سلسلہ فجر تک دراز ہو ہی چکا تھا۔ اب وہ اکثر اوقات جانماز ہی پر بیٹھی رہتیں۔ سفید ہاتھوں میں
سفید آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگا کرتیں اور کبھی کبھی ایسی آہ بھرتیں کہ عورتوں کے ہاتھ سے برتن چھوٹ جاتے۔

نوچندی جمعرات کی رات کو جب جمیل کھانے پر بیٹھا تو امّی اپنی پلیٹ میں چمچہ بھر شوربا لیے بیٹھی رہیں اور اس کے اصرار
پر بھی لقمہ نہ توڑا۔ وہ کھانا کھا کر باہر چلا گیا۔ پھر بستر پر لیٹ کر انتظار کرتا رہا لیکن بڑی دیر کے بعد بھی امّی نے اسے قرآن کی آیتیں دم
کرنے کے لیے نہ بلایا اور انتظار کر کے وہ دبے پاؤں گیا اور ڈیوڑھی سے اس نے دیکھا کہ صحن میں چوکی پر امّی سجدے میں پڑی ہیں اور محل
سرا کی بیٹھک کا لیمپ پوری روشنی سے جل رہا ہے۔ وہ واپس چلا آیا۔ پھر صبح صادق کے وقت جب رحمت کے فرشتے اس عالم خاکی
پر نزول اجلال فرماتے ہیں وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اسی بدحواسی سے اندر بھاگا جیسے چڑیلیں اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ اونگھتے ہوئے پہرہ دار
نے کڑکدار آواز میں جاگتے رہو کا نعرہ لگایا اور اس کے پیچھے پیچھے خلافِ معمول کھلی ہوئی ڈیوڑھی تک آ گئے۔ جمیل نے سجدے میں

پڑی ہوئی امی کو کانپتے ہاتھوں سے کھسوٹا لیکن امی اس مقدس رات میں آسمان سے آنے والی روحوں کے ساتھ کب کی پرواز کر چکی تھیں۔
جمیل کی چیخ سے سارے جہانگیر پور کی نیندیں پرواز کر گئیں۔ ہنگامہ برپا ہو گیا۔

چہلم کے فاتحے کے دن اندرونی عمارت کے طویل دالان میں لوبان اور اگر کی خوشبو کے مرغولوں کے درمیان نابینا حافظ نے پُرسوز آواز میں تلاوتِ کلامِ پاک شروع کی تو ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ جمیل کانپنے لگا........ ایسی رقت طاری ہوئی کہ جمیل رونے لگا۔

پاکستان سے آئے ہوئے ایک موٹے موٹے لفافے کو کھولتے ہی ایک تصویر میز پر گر پڑی۔ نجمہ دلہن بنی ہوئی۔ نجمہ ایک خوش رُو دولہا کے پہلو سے لگی شرما رہی تھی۔ جمیل نے نجمہ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا لیکن ان شادماں آنکھوں میں اس سے بچھڑنے کے دُکھ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ بڑے ماموں نے اپنی ساری وضعداری کو بالائے طاق رکھ کر بڑے چھچھورے پن کے ساتھ اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہے اور اس کی رگوں میں سانس لیتی ہوئی خاندانی انانیت زخمی ناگن کی طرح بل کھانے لگی۔ اس نے ان کے لمبے چوڑے خط کو پڑھے بغیر چاک کر دیا اور نجمہ کی تصویر اس طرح اٹھا کر پھینک دی جیسے وہ تصویر تصویر نہیں بلکہ خود نجمہ ہے۔ پھر اس نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنی کثیر زمینوں کا حساب لگایا اور اپنی پھوپھی، اپنی چچی اور ان کی اولادوں میں تقسیم کر دینے کا منصوبہ بنا لیا۔ ان لوگوں کی روٹیوں کے بندوبست کے خیال سے اسے بڑی تسکین ہوئی۔ پھر اس نے قصائی کی طرح اپنے درجنوں جانوروں کو ٹٹولا، لکڑی کاٹنے والوں کی طرح اپنے مشہور باغوں کا کنکوت کیا، سناروں کی طرح اپنی امی کے موٹے موٹے خاندانی زیوروں کو اچھال اچھال کر پرکھا اور بنیوں کی طرح اپنے باپ کے روپے کو بجا بجا کر گنا...... پھر پورے سکونِ قلب کے ساتھ اس نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کیا کہ اسے پہلے مشرقی پاکستان جانا چاہیے یا سیدھے کھوکھراپار ہو کر گزر جانا چاہیے........ اسے پتہ بھی نہ چلا اور برسوں کی ریاضت کے بنائے ہوئے عینیت کے بُت ایک ہی دھماکے میں چور چور ہو کر رہ گئے۔

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے کمبل کو برابر کر کے اس نے کھڑکی کا دروازہ کھولا اور ٹھنڈی ہوا سے کمرہ لبریز ہو گیا۔ نیم کی تازی مسواک لانے والے آدمی کے ساتھ مانک پور کا سپاہی بغلی کٹھری میں لپٹا ہوا سوں سوں کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے اس کے ہاتھ میں بادامی کاغذ کا پُرزہ پکڑا دیا۔ اس نے بھویں سکوڑ کر بچوں کی طرح ہجے لگا لگا کر معلوم کر لیا کہ اودھ شا نے اسے فوراً بلایا ہے۔ مسواک ہاتھ میں لیتے ہی اس نے ادّھا کھینچنے کا حکم دیا۔

جب اس کا ادّھا جھیل کے کنارے مانک پور کے باغ سے گزر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ مانک پور کے بڑے مختار یک پیڑ کی جڑ پہ بیٹھے ناریل پی رہے ہیں۔ قریب پہنچنے پر انھوں نے فرشی سلام کیا۔ ملازم نے ادّھا روک لیا۔ پتہ چلا کہ مختار زمین کے اماد کو شکار کھلا رہے ہیں۔ مختار کے ہاتھ کی سیدھ میں جمیل نے دیکھا کہ ایک موٹا موٹا لمبا ڈھنگا آدمی خاکی نیکر پہنے پچھلے پچھلے پانی لی بندوق لیے کھڑا ہے۔ جمیل نے ادّھا بڑھانے کا اشارہ کیا۔ لالہ قدِ آدم چبوترے پہ تلسی کے پیڑ کے پاس بیٹھے سندھیا کر رہے تھے۔ ماد کی خاطروں کے انتظام میں بولائی ہوئی چاچی اس سے رسمی باتیں کر کے چلی گئیں۔ اودھ شا اکیلی رہ گئیں۔

"تم کو مبارک ہو۔"

جمیل نے قالین کے پھولوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔
"تم کو بھی مبارک ہو۔"
"وہ کیوں؟"
اوشا کی آواز میں غم کی تھرتھراہٹ محسوس کر کے اس نے پوچھا۔
"میں جو آپ کو پریشان کیا کرتی تھی...... کل تک مانک پور سے چلی جاؤں گی۔ پھر کب آؤں گی، مجھے بھی نہیں معلوم۔"
اور اس نے جمیل کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھ لیں۔
"اسی دن کے خوف سے تو میں تم سے دور دور رہنا چاہتا تھا...... تم نے یہ میرے ہاتھ دیکھے ہیں؟"
اوشا نے اس کا ہاتھ اپنی ہتھیلیوں کی گود میں لے کر بھینچ لیا۔
"یہ ہاتھ بڑے خوش نصیب ہیں۔ انھوں نے سونے کو چھوا تو وہ مٹی ہو گیا...... یہ پارس ہیں...... ابھی کل رات میں نے سوچا تھا کہ اپنی تاریک زندگی کے کالے کوسوں کو تمھاری روشنی کی رفاقت کے سہارے کاٹ لے جاؤں گا..... تمھاری قربت کے مرہم سے سب زخم بھر جائیں گے، سب داغ بجھ جائیں گے۔"
پھر عورتیں آگئیں اور وہ تنہائی کے انتظار میں چپ ہو گیا لیکن تنہائی سے پہلے لالہ جی آگئے جمیل بیٹا پکارتے ہوئے۔
باہر دھوپ میں کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا دوسری پر گندے پاؤں رکھے تھے۔ دھوپ میں چاند چمک رہی تھی۔ اس نے جمیل کے سلام کے جواب میں اپنے آپ کو تھوڑا سا ابھارا اور گوشت اور بالوں سے لدا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جمیل نے جھک کر ہاتھ ملایا اور دوسری کرسی پر بے دلی سے بیٹھ گیا۔ لالہ چاچا کی پیشانی پر اس بدتہذیبی سے شکنیں پڑ گئیں اور وہ ہڑ بڑا کر مونچھ کو چھو کر ہدایتیں دینے لگے۔ اس نے جمیل پر رعب ڈالنے کے لیے چرمی بیگ سے پائپ نکالا اور تمباکو بھرنے لگا۔
"آپ 'اسموک' کرتے ہیں؟"
"جی ہاں...... لیکن لالہ چاچا کے سامنے نہیں کرتا۔"
"اچھا!"
وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔
"آج کیا مارا آپ نے؟"
جمیل خاموشی سے اکتانے کے بجائے اپنے جانسوز خیالوں سے اپنے ذہن کو بھٹکانے کے لیے بات کرنا چاہتا تھا۔
"آپ کے یہاں چڑیا ہے وے نہیں۔"
"اس ضلع میں میرا علاقہ چڑیوں کی کان سمجھا جاتا ہے۔"
"تو پھر میرا خیال ہے کہ دیہاتی شکاریوں نے اندھا دھند فائر کر کے چڑیوں کو بھڑکا دیا ہے...... آدمی کی داب ہی نہیں سہتیں۔"
اگر مجھ کو آپ کی آمد کی اطلاع ہوتی تو چڑیوں کو بندھوا کر جھیل میں ڈلوا دیتا۔"
جمیل اس کے بات کرنے کے انداز سے جھلا گیا تھا۔ جملہ پورا کرتے ہی وہ اٹھا اور اپنے آدمیوں کو اتھا کھینچنے کا حکم دیا۔

لالہ چاچا اسے کھانے کے لیے روکتے ہوئے آدھے تک آئے لیکن وہ سوار ہو گیا۔

جولائی کی پہلی تاریخ کو جھام پور کے پٹواری پنڈت درگا چرن بغل میں بستہ دبا کر آئے اور دیوان خانے کے دالان میں پڑے ہوئے ننگے تخت پر بیٹھ گئے اور جب جمیل برآمد ہوا تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح زمین کو چھوتا ہوا اسلام کیا اور اس کے بیٹھنے کے بعد تخت کے کونے پر ٹک گئے۔ پھر مری مری آواز میں انھوں نے زمینداری کے خاتمے کا اعلان کیا اور کہا کہ مجھے حکم ہے کہ میں ڈگی پیٹ کر اس خبر کو مشتہر کروں۔ جمیل نے بھنگیوں کو بلوایا اور اصرار کر کے اپنے پھاٹک کے سامنے ڈھیر اپٹوا کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کرایا۔ اس دن سے جمیل کے نوکر نے بازار کے بھاؤ سے گوشت خریدا۔ اس کے بیر دار عمل نے سرکاری کھیتوں میں چلتے ہوئے اسامیوں کے ہل کھلوا دیے۔ کٹھار کی مرمت کرتے ہوئے مزدوروں کو پوری مزدوری دی گئی۔ دوسرے دن جھام پور سے بھٹارہ تک تمام متفرق درخت جن کے نکل جانے کا اندیشہ تھا تقسیم کر دیے گئے۔ اسی دن شام کو چودھری اقبال نرائن جن کی دولت کا انحصار زمینداری پر نہیں سودی کاروبار پر تھا جمیل کے خلاف زہر اگلتے ہوئے پائے گئے۔ جھام پور میں روٹی کے حصے دار کو پہلی بار اپنی آزادی کا احساس ہوا۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ رئیس جھام پور کے پھاٹک کے قریب ایک لمبا چوڑا سوئر چر رہا ہے۔ آج تک کبھی جھام پور میں داخل ہونے والا سوئر زندہ نہیں واپس ہوا۔ جمیل نے سنا تو بظاہر نظر انداز کر دیا لیکن اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ رام سکھ کا بیٹا دلارے گھی کی لٹیا لے کر "دوارے" آیا تو پھاٹک پر سوئر چرتا دیکھ کر چونک پڑا۔ سیدھا پھاٹک کے بازو میں بنی ہوئی پہرے داروں کی کوٹھڑی میں پہنچا اور تیر کمان لے کر باہر آیا اور کان تک گھسیٹ کر تیر پٹھے پر مار دیا۔ سوئر نے چیخ کر ایک چکر کھایا اور ڈھیر ہو گیا۔ چودھری اقبال نرائن نے بڑا ہنگامہ مچایا۔ سو پچاس آدمی بھی اکٹھا کر لیے لیکن رام سکھ کا سامنا کون کرتا۔ سوئر بھون کر کھا لیا گیا۔

آہستہ آہستہ بیکاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ زمینداروں کے ڈھیروں خدمتگار، سپاہی اور کارندے مکھیاں مارنے لگے۔ کچھ کانپور اور بمبئی چلے گئے۔ کچھ محنت مزدوری پر آمادہ ہوئے اور بہت بڑی تعداد ایسے خواب پرستوں اور کاہلوں کی بچ رہی جو پردۂ غیب سے کچھ نمودار ہونے کا انتظار کرنے کے لیے اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائیوں کو اور توڑنے لگے۔ ان میں کوئی ہندو اور کوئی مسلمان نہ تھا۔ ان سب کا مذہب ایک تھا۔ بیکاری، بھوک، روٹی۔

ان میں جو لوگ ذہن پیر کے سلونزا زبان کے تڑتے اور مزاج کے اکھڑتے انھوں نے اپنی پیاس بجھانے کے لیے اپنی سمجھ اپنی منطق کے مطابق اپنے کنویں کھود لے ...... اور جرائم کی تعداد بڑھ گئی۔

غیر محسوس کن طریقے پر زندگی اپنے معمولات کو دہرانے لگی۔ دلوں میں بھڑکی ہوئی خوف کی آگ بجھنے لگی۔ جانور کھیتوں میں پھاند کر چھوٹی موٹی ذمہ داریوں کی تنظیم کرنے لگے۔ بھائی بھاوجوں کے جھگڑوں پر لاٹھیاں اٹھنے لگیں۔ دوکانداروں اور گاہکوں میں تکرار ہونے لگی اور چار چار بچوں کی ماؤں کی محبتوں کے مقدمے پنچایتوں میں پیش ہونے لگے۔ جمیل کا دیوان خانہ ایک بار پھر "کچہری" بن گیا اور اس کے فیصلے اپیل سے بری ہونے لگے۔

گلشے کی نغز بانی تو جمیل کے گھر میں کبھی ہوتی ہی نہ تھی اب اس نے دوڑ دھوپ کر کے سمجھا بجھا کر اور ڈرا دھمکا کر سارے جھام پور میں اس قصے کو ختم کر دیا۔ محرم کے لیے جب ڈپٹی کمشنر نے بہت زور دیا اور حلقہ انسپکٹر پولیس نے بہت اصرار کیا تب اس نے حامی بھر لی۔ پھر بھی اتنی احتیاط کی کہ جھام پور کا ایک تعزیہ بھی اتنا اونچا نہ تھا جو کسی درخت کی ایک پتی کو بھی چھو سکے.... چودھری اقبال نرائن کی بچھائی ہوئی بارود پڑے پڑے سیل گئی۔

پھر جھام پور کی پنچایت کا الیکشن آ گیا۔ جمیل کے مقابلے پر چودھری اقبال نرائن بڑے طنطنے سے کھڑے ہوئے۔ مہینوں پہلے سے سیتا پور سے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ایم ایل اے اور ایم پی آ کر پڑ گئے۔ ایک ایک ہندو کے مکان پر گئے۔ جلسوں میں اقبال نرائن کا قصیدہ پڑھا اور پورے یقین کے ساتھ الکشن لڑایا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، تیس سو ووٹ پڑے جس میں اقبال نرائن کو کل دو سو ووٹ ملے، وہ بھی حاجی منشی کی دوڑ دھوپ کے بعد.... چودھری اقبال نرائن کھسیانی بلی کی طرح گھات لگا کر بیٹھ رہے۔

بدلو دھوبی کا لڑکا منوآں سوم میں پڑھتا تھا کہ بدلو چل بسے۔ ماں نے سال چھ مہینے تو پڑھایا پھر ایک دن اس کا ہاتھ پکڑا اور جمیل کے نوکروں کے دستے میں شامل کر دیا۔ تھوڑے دنوں بعد ماں بھی ایک کچا مکان اور دو چار برتن چھوڑ کر اپنے میاں کے پاس چلی گئی۔ منواں جمیل کی خدمت کرتا رہا اور رکھا کر ہاتھ پیر نکالتا رہا۔ جب جمیل نے نوکروں کی "چھٹنی" کی تو منواں بھی نکالا گیا۔ نوکری چھوڑتے ہی اس نے اپنا کچا مکان بیچا اور بال بڑھا لیے، بیچ سے مانگ نکال کر گردن میں کیلے کا لال رومال باندھ کر گشت شروع کر دی۔ ملو قصائی سے تو دیرا ہی ملی تھی اب اور یارانہ ہو گیا۔ اس کا اکثر وقت ملو قصائی کے بر دھٹے میں گاتا گاتے گزرتا۔ ایک دن ملو ڈانگر بھینسا خرید کر نا وقت گھر پہنچا تو دروازے کی کنڈی اندر سے بند تھی اس نے السا کر بجائے پکارنے کے ہاتھ ڈال کر کنڈی کھولی اور اندر چلا گیا۔ نوٹنکی کی لیلیٰ کی طرح اس کی پینتیس برس کی کالی بیوی منواں کی گود میں سر رکھے شتر غمزے کر رہی تھی۔ ملو قصائی تھا ہی اس نے مار مار کر منواں کو بھوت بنا دیا۔ جب وہ لنگڑاتا ہوا باہر چلا گیا تب اس نے کوٹھری میں چھپی ہوئی بیوی کو نکالا اور بھینسے ہانکنے والا ڈنڈا اٹھایا۔ منواں اپنی مار تو جمیل لے جاتا لیکن محبوبہ کی چیخوں نے اس کے دل میں گرہ ڈال دی۔

منواں وصولیابی کے تحصیلدار کے پاس جمیل کا خط لے کر مسرکھ گیا۔ بڑی خوشامدیں کیں لیکن نوکری کی کوئی صورت نہ نکلی مایوس ہو کر وہ چلنے کو اٹھا تو ہلکی ہلکی بوندیاں پڑنے لگیں۔ ایک دھرم شالے کے سائبان میں بیٹھا وہ پانی تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ مغرب کی اذان ہو گئی مگر بوندا باندی جاری رہی۔ پانچ چھ سال کے بوڑھے ٹلو کے میں بھیگتے ہوئے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ مسرکھ ہی میں اپنے ایک شناسا کے یہاں پڑ رہا۔ پیال کی توشک اور الاؤ کی گرمی کے لحاف میں کچھ سوتے اور کچھ جاگتے اس نے رات کاٹ دی۔ اور منہ اندھیرے وہاں سے گھر کے لیے چل پڑا۔ بوندیوں نے سڑک کی مٹی بٹھا دی تھی جیسے کھیت بو کر سراون چلا دی گئی ہو..... جیسے مرعلی ہوئی مارکین پر ٹھنڈی استری کر دی گئی ہو۔ دور دور تک کوئی آدمی کوئی جانور نہیں تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک بونے ہوتے

کھیت سے دو آدمی "لاتی" لگاتے ہوئے سڑک پر آ گئے اور ایک جانور کے پیروں کے واضح نشانوں کو دیکھتے ہوئے اطمینان سے چلتے رہے۔ منواں کی جبلی "کرید" جاگ اٹھی۔ اس نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ذات کے برہمن ہیں اور ان کو "دان" میں ملی ہوئی گا بھن گائے کسی نے کھونٹے سے کھول لی ہے۔ اب بڑی مشکلوں سے لاتی ملی ہے۔ اب وہ اسی لاتی پر جا رہے ہیں۔ پھر جھام پور کی آبادی نظر آنے لگی۔ چرائی پر چھوٹے ہوئے جانوروں کے قدموں کے ان گنت نشانوں میں بھی جانے والی گائے کے نشان ملتے چلے گئے۔ جب وہ نشان مگر قصائی کے چھپر میں کھو گئے تب منواں کے ذہن میں ایک منصوبہ چمک گیا۔ وہ ان لوگوں کو وہاں سے ٹال لایا اور اپنے مکان کے پچھواڑے مشورے کرتا رہا۔ بادلوں نے سورج کی تابانی کو ڈھانپ لیا تھا جیسے خامیاں خوبی پر پردہ ڈالتی ہیں مگر بہر حال صبح ہو چکی تھی اور جھام پور اپنے معمولات میں مصروف تھا۔ وہ دونوں پنڈت سیدھے چودھری اقبال نرائن کے گھر پہنچے اور اپنی بپتا سنائی۔ شکار بھری ہوئی بندوق کی نال پہ آ گیا تھا۔ چودھری اقبال نرائن نے پل بھر میں دس بیس آوارہ آدمی جمع کیے اور مگو قصائی کے گھر کو گھیر لیا پھر دروازہ توڑ کر اندر پہنچے۔ گائے کے ٹکڑے کٹے رکھے تھے۔ ایک طرف مرا ہوا لال لال بچہ پڑا تھا پیلی کھال اور ٹیڑھے سینگوں کا سر دیکھتے ہی پنڈتوں نے پہچان کر دہائی مچائی۔ چودھری اقبال نرائن نے بھری ہوئی بندوق کی لبلبی دبا دی۔ زمین سے آدمی اگنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجمع سیکڑوں کی تعداد سے گزر کر ہزاروں کی تعداد کو پہنچ گیا۔ ساری بستی میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ جمیل نے خبر سنی تو الٹے سیدھے کپڑے پہن کر نکلا لیکن پھاٹک پہ کھڑے ہوئے ہندو نوکروں نے اسے روک لیا اور دیوانخانے میں بٹھا دیا۔ پھر بستی بھر کی عورتوں نے بھاگ بھاگ کر اس کے گھر میں پناہ لی۔ سارا اندرونی مکان عورتوں سے سارا بیرونی مکان مردوں سے بھر گیا۔ پھاٹک بند ہو گیا۔ اس کے ہندو نوکر اس کی کرسی کے گرد بھری ہوئی بندوقیں اور بھرا ہوا پستول لیے کھڑے تھے جس کرسی پر وہ ایک لاش کی طرح پڑا تھا۔ پھر پھاٹک پہ دستک ہوئی، سرگوشیاں ہو گئیں۔ پھر کسی نے کڑک کر پھاٹک کھولنے کو کہا اور نوکروں نے رام سنگھ کی آواز پہچان کر پھاٹک کی کھڑکی کھول دی۔ وہ ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا اندر آیا اور اپنے ہاتھ سے پھاٹک کے گرانڈیل دروازے کھول دیے اور جھومتا ہوا دیوانخانے کی طرف چلا۔ دالان کی سیڑھیوں پہ ہمیشہ کی طرح جوتے اتارے اور کندھے سے انگوچھا اتار کر پیروں کی گرد صاف کی اور اس طرح کمرے میں داخل ہوا جیسے نمازی مسجد میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے وجود کو سونگھ کر بھی جمیل اسی طرح لاش کے مانند پڑا رہا۔ رام سنگھ نے جھک کر سلام کیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر بڑی دیر کے بعد جمیل بولا۔

"کیا خبر ہے؟"

"دس ہجار (ہزار) آدمی کمیل کانٹے سے لیس بستی گھیرے پڑا ہے اور آدمی بڑھتے چلا آئے رہا ہے۔"

"کیا خیال ہے؟"

"بھگوان بچا دیں تو بستی بچے اور پہ صب بات یہ ہے کہ ساری عورتیں یہاں جمع ہیں .... گنڈوں لنگاڑوں کا دھاوا ان پر ہوئی۔"

"رام سنگھ!"

"مالک۔"

"تم نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ تم نے مجھے گود میں کھلایا ہے لیکن میں نے تم کو گالیاں بھی دی ہیں اور مارا بھی ہے آج ان تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ میرا کہنا مانو اور ان تمام ہندو نوکروں کو اپنے ساتھ لے کر بٹارہ چلے جاؤ۔ اگر کر سکو تو یہ کرو کہ مجھے تھوڑے سے کارتوس بھیج دو۔"

جمیل کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ رام سکھ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور کانپتی آواز میں بولا۔

"ہم اور ہمارا پریوار آپ کا نمک کھائیں ہے۔ آج وہ نمک ادا ہوئی...... آپ...... آپ کی ایک پگڑی کے رومیں کی کھاتر (خاطر) آپ کے کھیت کی ایک بالی کی کھاتر سیکڑوں لٹھ چلے ہیں۔ سیکڑوں سر بجے ہیں...... رام سکھ اکیلا نا ہیں آوا ہے...... رام سکھ کے سنگ پانچ سو جودھا آئے ہیں...... ای تماسہ دیکھے نا ہیں آئے ہیں...... ای جان دینے آئے ہیں...... پھاٹک کے باہر رام سکھ کا پروار مری اور پھاٹک کے بھیتر رام سکھ کے یار، تب کوئی آپ تک پہنچ سکت ہے...... ہنر کھ، مانک پور اور تھانے کھبر جائے چکی ہے۔"

یہ کہتا ہوا اٹھا اور تیر کی طرح باہر گیا۔ پھاٹک پر کھڑے ہوئے آدمیوں کا لشکر ساری عمارت کے گرد پھیلا دیا اور خود اوٹے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ جب "جے بجرنگ بلی" کے نعروں سے دیواریں لرزنے لگیں تب اس نے اپنے بڑے بیٹے کو للکارا کہ وہ دس بیس آدمی لے کر جائے اور رحال لے کر آئے۔ بیٹا دیسی پستول میں کارتوس لگا کر اور بلم کندھے پر رکھ کر اس سڑک پر چل دیا جو قصائیوں کے محلے کو جاتی تھی اور جس پر ہجوم کا سب سے زیادہ دباؤ تھا۔ جمیل بیقرار ہو کر نکلا اور مسلمانوں کی بھیڑ سے زندہ مُردوں کی بھیڑ سے گزرتا ہوا اندر گیا۔ سارا آنگن، سارے دالان عورتوں سے بھرے تھے۔ بچوں سے بھرے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی قوتِ گویائی چھین لی گئی ہو...... جیسے یہ قبروں سے نکال کر یہاں بٹھا دیے گئے ہیں۔ اب کوئی دم میں آفتاب سوا نیزے پر آ جائے گا اور حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ اس کے کھنکارنے کے باوجود کسی عورت نے گھونگھٹ نہیں نکالا۔ کسی نے منہ نہیں پھیرا۔ وہ اپنے ہندو نوکروں کے ساتھ کوٹھے پر گیا۔ پھر لکڑی کی سیڑھی پر چڑھ کر وہ تیسری منزل پر پہنچ گیا جس کی چہار دیواری کمر سے اونچی تھی۔ اب ساری آبادی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔ بستی کے اندر مکمل سناٹا تھا۔ کوئی آدمی کوئی جانور کوئی پرندہ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا جیسے اس کے گھر کی عورتیں دسویں محرم کا جلوس دیکھا کرتی تھیں۔ پھر وہ تیزی سے اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ رام سکھ اوٹے سے اُتر کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ دس بیس آدمی اس کے داہنے بائیں چلنے لگے۔ ملّو قصائی کے گھر کے سامنے آدمیوں کا ہجوم تھا۔ کٹی ہوئی گائے کو چماروں نے لمبے لمبے تختوں پر رکھ دیا تھا۔ چودھری اقبال نرائن کے اشارے پر مجمع نے "جے بجرنگ بلی" کے نعرے لگائے جن کی گونج سے گھڑی بھر کے لیے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ پھر قدرے خاموشی ہوتے ہی اس نے چودھری اقبال نرائن کو مخاطب کیا اور مشورہ دیا کہ کٹی ہوئی گائے معتبر چماروں کی نگرانی میں دے دی جائے اور ملّو قصائی کو باندھ کر تھانے بھیج دیا جائے۔ چودھری اقبال نرائن نے جو زمین سے آسمان پر پہنچ چکے تھے سُنی اَن سُنی کر دی۔ مجمع "خون کا بدلہ خون" کے نعرے لگانے لگا۔ ملّو قصائی اپنے مکان کی دہلیز پر تڑپ رہا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگ رہا تھا۔ "بھیا" کی صورت دیکھتے ہی اس نے اپنے مرتے ہوئے جسم کا سارا زور لگا کر جست لگائی اور ذبح کیے ہوئے بیل کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ جمیل کے پائجامے کی چوڑیاں اس کے خون سے نہا گئیں۔ جمیل پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا

چہرہ لال ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے تھے۔

"آدمی کی جان لے لی اب اور کیا لو گے اقبال نرائن؟"

وہ اتنے زور سے چیخا کہ خاموشی چھا گئی۔

"ایک دیوی کی جان کے بدلے میں ایک ہزار جانیں بھی تھوڑی ہیں بھیا جی۔۔۔۔۔۔ اور آپ کا قصائی تو ابھی زندہ ہے۔"

اقبال نرائن نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

"تو کاٹ دو گلا۔"

"کاٹ بھی دیں گے تو کون مائی کا لال روک لے گا۔"

پھر جے جے کار کی ہاہا کار شروع ہو گئی۔

اس کے نوکر وہاں سے اس کو نکال لائے۔

مجمع بڑھتا چلا گیا۔

لالہ سدگر سیتا پور گئے تھے۔ ان کا مسلمان مختار جھام پور کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا اور سیتا پور کو دوڑ پڑا۔

سترکھ کے بیمار ٹھاکر نے جو اس قیامت کی خبر سنی تو ہاتھ ملنے لگے اور "بڑے بھیا" کو بلانے کے لیے چیخنے لگے۔ "بڑے بھیا" آئے اور بے نیاز سے بیٹھ کر کمزور خوشامدانہ آوازیں دیے جانے والے احکام کو سنتے رہے۔ پھر بندوقیں نکالی گئیں، انتخاب کی گئیں، ہاتھی نہلایا گیا پھر کسا گیا۔ پھر آدمی جمع ہوئے ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ آخر "بڑے بھیا" سوار ہوئے۔ ایک بجے کے لگ بھگ جھام پور پہنچے۔ پورے قاصدانہ تکلف کے ساتھ "بڑے ٹھاکر" کا پیام پہنچایا۔ جمیل نے اس سے زیادہ پُرتکلف برتاؤ کیا۔ نوکروں کو مٹھائی تقسیم کرائی۔ "بڑے بھیا" سے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ ہاتھی کے لیے بوجھ بھر گنّے لانے کا حکم دیا۔ "ٹھاکر بابا" کی خیریت پوچھی۔ ان کے مرض پر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر جب "بڑے بھیا" چلنے کے لیے اٹھے تو اس نے بغیر مخلصانہ اصرار کے ان کو رخصت کر دیا۔ حاجی منشی اور عنایت خاں دونوں اس خوف سے لرز اٹھے تھے کہ کہیں "بھیا" سترکھ چلے نہ جائیں، مطمئن ہو گئے۔ اس طوفان میں یہ حقیر اطمینان بھی ڈوبنے والے کے لیے تنکے کا سہارا تھا۔

مجمع برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

دو بج گئے اور اس کے باپ دادا کی بنوائی مسجد میں اذان نہ ہوئی۔ وہ باہر نکلا سایے کی طرح ساتھ چلتے ہوئے سپاہیوں کو سیڑھیوں پر چھوڑ کر وہ مسجد میں داخل ہو گیا اور زندگی میں پہلی بار اتنے لحن اتنے سوز اور اتنے طنطنے سے اذان دی کہ حاجی منشی، عنایت اور سیکڑوں بوڑھے بوڑھے مسلمانوں کی داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ جب سنتیں پڑھ کر اس نے سلام پھیرا تو سیڑھیوں تک صفیں قائم تھیں۔ وہ خود فراموشی کے عالم میں تکبیر کہنے کے لیے کھڑا ہوا تو حاجی منشی دوسرے آدمیوں کے ساتھ اپنی صف سے نکلے کانپتے ہاتھوں سے اس کے بازو پکڑے اور منبر پر کھڑا کر دیا۔ جھام پور نے اتنی رقت کے ساتھ کبھی نماز نہیں پڑھی۔

جب وہ برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر نڈھال ہو کر گر پڑا تب گردیال جو شی جس نے "بھیا" کا پتر اسایا تھا جلا

"بھیا" کی الپ کاٹی تھی۔ بازوؤں پر چندن اور ماتھے پر تلک لگائے آدھی دھوتی باندھے اور آدھی دھوتی اوڑھے کھانے کی تھالی لے کر آیا۔ اس کا بڑا بیٹا پیتل کا گلاس اور پیتل کا لوٹا لیے تھا۔ وہ تھوڑی دیر سوالیہ نشان بنے کھڑے رہے۔ پھر رام سکھ نے جمیل کے آگے میز لگا دی اور دلارے سلفچی لے آیا اور رحیم مراد آبادی لوٹا اور تولیہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ بھیّا نے سر اٹھایا۔

"بُھرجی کو بلاؤ۔"

کالا کالا بُھرجی حاضر ہوا اور فرشی سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

"رام سکھا"

"مالک!"

"چنے کی بوریاں نکال کر بھنواؤ اور گڑ کی پاریاں نکلوا کر تقسیم کراؤ۔"

گرم گرم چنوں کی سوندھی سوندھی خوشبو گڑ کے اجلے اجلے ٹکڑوں کے ساتھ اندر سے باہر تک اِتراتی پھر رہی تھی کہ فسادیوں نے حملہ بول دیا۔ جہانگیر پور آم کے اونچے اونچے باغوں کی سبز پہاڑیوں کے اندر پیالے کی طرح آباد تھا۔ شمال مشرق سے شمال جنوب تک کھنچی ہوئی کمان کی طرح قصائیوں کے گھر آباد تھے۔ جمیل کا گھر بیچوں بیچ آبادی میں میر مجلس کے مانند کھڑا تھا۔ بھیانک نعروں اور خوفناک آوازوں کے ساتھ مجمع ریلا مار کر بستی کے اندر چلا۔ جمیل نے اپنی عمارت کے باہر حلقہ بنائے ہوئے سارے آدمیوں کو پھاٹک کے اندر بلا لینے کا حکم دیا اور خود تیسری منزل پر چڑھ گیا۔ یہاں سے وہاں تک قصائیوں کے مکان جل رہے تھے، پھنک رہے تھے، ذبح ہونے والی بکریوں کی طرح انسان چیخ رہے تھے اور جمیل دیکھ رہا تھا۔ وہ جمیل دیکھ رہا تھا جس کے نوکر کی صورت دیکھ کر بڑے بڑے نامی بدمعاش راستہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اب اس کے مکان کے پیچھے سے گزرنے والی سڑک پر سیکڑوں برہم انسانوں کا ہجوم چلا آ رہا تھا جس کی قیادت چودھری اقبال نرائن کر رہے تھے۔ پھر رام سکھ نے اپنے کالے کمبل کو سنبھال کر اوڑھا، اپنا مڑیٹھا کھینچ کر باندھا پاؤں سے کمان جھکا کر چڑھائی اور تیر جوڑ کر للکارا۔

"بس چودھری جی..... نیرے نہ آئیو۔"

"کیا؟"

"یہ گھر ٹلوک سائی کا نا ہیں ہے..... اِی گھر کی ایک ایک اینٹ کے لیے لاٹھی چلی۔"

"تو تم روکو گے؟"

"ہاں..... ہاں..... ہم روکب۔"

اس نے اپنی بوڑھی چھاتی پہ ہاتھ مار کر کہا اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ڈیڑھ دو سو آدمیوں کو للکار دیا۔

شکاریوں کی صورت دیکھتے ہی گیہوں کے کھیت روندتی ہوئی ہرنیوں کی ڈار میں تہلکہ پڑ گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔

پھر خبر آئی کہ بھوکے ننگے فسادی فصلیں نوچ نوچ کر اپنے گھر بھرے لے رہے ہیں۔ آناً فاناً جمیل بھیا کے کھیتوں میں بانس گاڑ دیے گئے، بانسوں میں جھنڈے باندھ دیے گئے اور اعلان کر دیا گیا کہ اگر کسی نے ان کھیتوں کی ایک بالی نوچ لی تو اس کا گھر

لٹ دیا جائے گا، اس کے گاؤں کا کھلیان پھونک دیا جائے گا۔ لوٹنے والے جانتے تھے کہ رام سکھ بارہ برس بعد بھی اپنا سودا چکائے گا
سے پہلے جمیل بھیا کی مینڈھ پر چڑیا تک نہیں آئی اور سارے مسلمانوں کے کھیت لوٹ لیے گئے، کھود لیے گئے۔

پھر بڑے تھانیدار سکھ نندن شرما گھوڑا کداتے آئے۔ لانبی لانبی ٹارچوں کی روشنی میں انسانوں کے لہریں لیتے ہجوم کو ریوالور نکال کر
یا اور تتر بتر کر دیا۔ جلتے ہوئے مکان بجھے۔ چیختی عورتوں، چلاتے بچوں اور گم سم مردوں کی ڈھارس بندھی۔ پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس آئے
ڑے اسکول میں چہل پہل ہو گئی۔ بھام پور کے نیتا چودھری اقبال نرائن نے ملاقات کی اور دبی زبان میں اظہارِ خیال کیا کہ بھام پور میں ایک ہی
ہے جس کے داہنے ہندو اور بائیں مسلمان رہتے ہیں جب تک وہ بند نہ ہو گا آگ نہ بجھے گی۔ مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھے ہوئے چوکیدار نے
سنی اور جمیل کے کانوں میں اُگل دی۔ حاجی منشی، عنایت خاں، تفضل حسین اور بہت سے آدمی باندھے جا چکے تھے۔ جمیل نے بڑے
سے اپنا پائجامہ بدلا، چوڑیاں برابر کیں، بکس کھلوا کر دھرا ہوا شیروانی نکالی، چسٹر کو برش کرایا، مکان کے اندرونی کمرے مقفل کرائے اور
انے میں آکر بیٹھ گیا۔ سکھ نندن شرما آئے۔ بجھے بجھے لہجے میں گفتگو کی، پھر نظریں جھکا کر کہہ دیا کہ بڑے اسکول میں چھوٹے صاحب نے
کرنے کے لیے بلایا ہے۔ جمیل فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ملازم نے چسٹر پہنا دیا۔ مفلر کو گلے میں لپیٹتے ہوئے اس نے گلوگیر آواز میں رام سکھ
طلب کیا۔

"میں جا رہا ہوں .... مانک پور خبر بھیج کر ضمانت کا بندوبست کر لینا....... اور دیکھو میرے اسلحے میری عدم موجودگی
ا کو بھی نہ دینا۔ چاہے وہ چھوٹے صاحب ہوں چاہے بڑے صاحب۔"

"مالک!"

رام سکھ منہ کھولے کھڑا رہا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جمیل میاں .... آپ نے تھانے دار دیکھے ہیں .... مرد نہیں دیکھے ہیں .... آپ کا
ے نام اور میرا استعفیٰ ساتھ ساتھ داخل ہو گا۔"

سکھ نندن شرما نے "چھوٹے صاحب" کو یقین دلا دیا کہ اقبال نرائن ایسے سو آدمیوں کو بند کر دیجئے تو کوئی چوں نہ کرے گا
یل میاں سے بدتہذیبی کی گئی تو غریب ہندوستیہ گرہ کریں گے اور نایب ہندو ڈی آئی جی تک معاملہ لے جائیں گے۔ آخر چھوٹے صاحب
نے معقول برتاؤ کیا اور جب جمیل آنے کے لیے اٹھا تو ایک جیپ کا ہارن بجا اور ڈی ایم آ گیا اور جمیل کے سلام کے جواب میں بولا۔

"آزادی کے تیرہ برس بعد .... اور آپ کے ہوتے یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟"

جمیل نے سر جھکا لیا۔

صبح ہوتے ہوتے امن کمیٹی بن گئی۔ جمیل میاں اس کے چیرمین بنائے گئے، اقبال نرائن نائب چیرمین۔ گائے کے ٹکڑے
کے ساتھ ایک قبر میں دفن ہوئے، اس پر پہلا جھنڈا لہرایا گیا اور کوئی دس بجے دن میں دس بیس معزز آدمیوں کے ساتھ جمیل
میں گشت کرنے نکلا۔ آگے آگے اقبال نرائن تھے پیچھے پیچھے وہ، اور اس دن جمیل کو محسوس ہوا کہ وہ اقبال نرائن کا محکوم ہے،
ہے بستی میں جیسے طاعون چل گیا ہو، قبرستان کا سا سناٹا تھا جس کو یہ لوگ قبریں کھودنے والے مزدوروں کی طرح توڑ رہے تھے

وروں میں لپٹی ہوئی عورتیں سر جھکائے ہوئے مردوں کے پیچھے پیچھے اپنے اپنے گھروں میں بسنے جا رہی تھیں۔ دکانیں پھوڑی آنکھوں کی مانند
ئی تھیں۔ گاہک خوابوں کی طرح غائب تھے۔

جلے ہوئے مکانوں میں شعلوں کی گرمی باقی تھی۔ مرے ہوؤں کی قبروں کی مٹی تازی تھی۔ زخموں سے تازہ تازہ لہو رِس رہا تھا کہ
وس کی وہ رات آگئی جس کی صبح نیم سار میں "نہان کا میلہ" لگتا تھا جس میں شرکت کے لیے دور دور کا یاتری آتا تھا۔ اقبال نرائن نے
تی رات ہاتھ کے لکھے ہوئے پرچے تقسیم کرائے اور غدار مسلمانوں کے ظلم کو اتنا طول دے کر مشتہر کرایا کہ خود حجام پور کے امن پسند
ل اٹھ کھڑا گئے۔ گائے کی قبر پر میلے کا بندوبست ہوا اور میلے کو ہنگامے میں تبدیل کرنے کا انتظام۔ ہر گھڑی نئی خبر آتی تھی جو پرانی خبر کی
شت کو بھلا دیتی تھی۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بجائے گھر جانے کے اپنے خاندانی قبرستان گیا۔ ایک ایک قبر پر فاتحہ پڑھا۔ ان کھیتوں کو دیکھتا ہوا
لوٹ لیے گئے تھے اور ان کھیتوں کو دیکھتا ہوا جن میں بانس گڑے تھے اور جن کی مینڈوں پر الاؤ روشن تھے اور مسلح آدمی پہرہ دے رہے
تھے وہ بستی آگیا۔ یہاں کی درگاہوں میں اگر کی بتیاں سلگائیں، موم بتیاں روشن کیں اور جب اپنے گھر آیا تو پہرہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک لانبا
سیاہ سیاہ سایہ اس کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔

"رام سکھ!"

"مالک!"

"کیا یہ سب کچھ صرف ایک گائے کے لیے ہوا؟"

"اوں ہوں۔"

اس نے بڑی گمبھیرتا سے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"پھر؟"

"یو ای لیے ہوا...... کہ آج لگ آپ کا حکم کیسے چلت ہے...... آپ کی چھائیں ماں یہاں مسلمان بے کھٹکے
کیسے رہت اہیں...... یہاں تو او ہوئے جو اکبال نرائن کہیں...... سب اکبال نرائن کا سلام کریں...... سب اکبال نرائن
کے دوارے جائیں۔"

"ہوں...... تو اقبال نرائن نے میرے خلاف دس ہزار آدمی اس لیے جمع کر لیے کہ میں مسلمان ہوں اور وہ ہندو ہے۔"

"ای ماں کا بسندیہ ہے۔"

"اور اگر میں ہندو ہوتا اور اقبال نرائن مسلمان ہوتے...... تو۔"

"اوں ہوں...... اوئی تو ہندو ہے ہیں...... آپ ہندو ہوتے تو بھٹارہ کے لونڈے اکبال نرائن کا بس ناس کیے دیتے۔"

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔

"ادھا کھینچواؤ۔"

"کا مالک؟"

"اَدھا کھینچواؤ.... بندوقیں نکلواؤ"

جمیل نے مرحوم شیخ کے طنطنے سے حکم دیا۔

تاروں کی چھاؤں میں اَدھا مسلح آدمیوں کے جلو میں روانہ ہو گیا۔ مسرکھ جانے والی سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہوئے اندھیار پیڑوں کے سایے میں ڈوب گیا۔

ٹھاکروں کے مکان کے سامنے سڑک کے داہنے بازو پر برگد کے چھتنار درخت کے نیچے گاٹے کی اُجلی قبر پر لگے ہوئے جھنڈے کا پیلا ریشمی پھریرہ لہریں لے رہا تھا۔ دور دور تک چاندنی بچھی تھی۔ لاتعداد آدمی کھڑے بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھے پنڈت گیتا کا پاٹ کر رہے تھے۔ ساری فضا تقدیس کی فضا سے بوجھل تھی۔ مسرکھ سے آنے والی سڑک پر ایک اَدھا دھول کے بادل اڑاتا نظر آیا۔ اونچے اونچے دوڑتے بیلوں کی گردن میں پڑی ہوئی گھنگھروؤں کی ہیلوں کی گونجیلی کھنک نے سب کو متوجہ کر لیا۔ اقبال نرائن نے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجہ بنا کر غور سے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ کل کے جمیل میاں کا اَدھا گاٹے کی قبر کے پاس رک گیا۔ وہ کھدر کی دھوتی پر کھدر کا گرم کرتا اور جواہر کٹ صدری پہنے کلف دار گاندھی ٹوپی لگائے اُترے۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کی چوڑی پیشانی پر چندن اور تلک کی دھاریاں تھیں۔ ان کے خوبصورت گھونگھریالے بال معلوم نہیں کہاں کھو گئے تھے۔ چھلی ہوئی گدی پر براق ٹوپی سے چوٹی کا سرا ذرا سا جھانک رہا تھا۔ قبر کے قریب پہنچ کر انھوں نے جوتے اتارے اور قبر کو ڈنڈوت کی۔ گردیال جوشی "پرشاد" کا تھال لیے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بوڑھے پنڈت نے پاٹ ختم کر دیا۔ اقبال نرائن نے ہکلا کر کہا۔

"جمیل میاں!"

کل کے جمیل نے اس کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔

"جمیل میاں نہیں.... جھام سنگھ.... اقبال نرائن!.... جھام سنگھ"

پھر اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا.... اور کڑک کر بولا۔

"بولو گئو ماتا کی"

"جے!"

اتنی زور سے تکرار ہوئی کہ جھام پور کے مکانات لرز گئے، لرزتے رہے۔

پھر کسی من چلے نے نعرہ لگایا۔

"جھام سنگھ بھیا کی جے!"

ایک بار پھر جھام پور کے درودیوار کانپ اٹھے۔

گردیال جوشی نے پرشاد کا تھال جھام سنگھ بھیا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ جھام سنگھ بھیا نے پرشاد تقسیم کر دیا۔ دوسرا تھال.... تیسرا تھال.... معلوم نہیں کتنے تھال جھام سنگھ بھیا نے تقسیم کر دیے۔

پھر جھام سنگھ بھیا اپنی جے جے کار کے جلو میں جمیل میاں کے مکان پر آئے۔ گاٹے کی قبر سے نوچا ہوا جھنڈا اپنے مالک کی پیشانی

پہرگا اڑ دیا گیا۔ بوڑھے بوڑھے مسلمان آنکھیں مل کر جھام سنگھ بھیا کو گھور رہے تھے۔ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے اقبال نرائن اپنا سر کھجا رہے تھے۔ گردیال جوشی اپنے گھر سے کھانے کی تھالی لائے۔ پیتل کی تھالی میں گرم گرم کھانوں سے بھری ہوئی پیتل کی کٹوریاں چنی تھیں جب تک جھام سنگھ بھیا نے جمیل میاں کے باپ کے بنوائے ہوئے کنویں پر رام رام کر کے اشنان کیا تب تک گردیال جوشی نے چبوترے کا ایک کونا گائے کے گوبر سے لیپ دیا۔ جب جھام سنگھ بھیا "آن پوجا" کر کے اٹھے تب بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ اقبال نرائن اسی طرح بیٹھے بیٹھے خالی نگاہوں سے خلا میں گھور رہے تھے۔

"چودھری اقبال نرائن جی!"

چودھری اقبال نرائن جی نے آنکھوں کے ساتھ ساتھ منہ کھول کر اسے دیکھا۔

"اپنی گزر بسر کے لیے بھارت ورش کے کسی دوسرے گاؤں میں ڈیرہ ڈالو .... جھام پور میں جھام سنگھ رہے گا ...... جھام سنگھ۔"

چودھری اقبال نرائن جی نے کچھ کہنے کے لیے آنکھیں جھپکائیں اور ہونٹ کپکپائے کہ جھام سنگھ بھیا گرجے۔

"رام سکھ!"

"مالک!"

"اس سور کھد کی گردن میں ہاتھ دے کر باہر نکال دو۔"

رام سکھ کے سنگسی ایسے ہاتھ نے اقبال نرائن کی دبلی گردن دبوچ لی اور وہ حاجی منشی کے ہاتھ میں پھنسے ہوئے بڈھے بیمار بکرے کی طرح خرخراتا ہوا پھاٹک کے باہر نکل گیا۔

سلطان شہید

بنگالی اسٹیج ڈرامہ

مصنف: مہندر ناتھ گپتا

مترجم: احمد سعدی

افراد:

حیدر علی خاں ـــــ میسور کا سلطان
کریم شاہ ـــــ حیدر علی کا چھوٹا لڑکا
قمرالدین ـــــ سپہ سالار
عبدالخالق ـــــ ٹیپو سلطان کا لڑکا
مادھو راؤ نارائن ـــــ مرہٹوں کا پیشوا
سندھیا ـــــ مرہٹوں کا لیڈر
نظام ـــــ نظام حیدرآباد
تہور جنگ ـــــ نظام حیدرآباد کا سپہ سالار
جیو تشک ـــــ ایک دھوکہ باز
لارڈ کارنوالس ـــــ گورنر جنرل
سر آرتھر ویلیسلی فرنگی سپہ سالار
صوفیہ ـــــ باپو جی کی لڑکی

ٹیپو سلطان ـــــ حیدر علی کا بڑا لڑکا
سید غفار ـــــ سپہ سالار
پورنیہ ـــــ دیوان
معاذالدین ـــــ ٹیپو سلطان کا لڑکا
نانا فرنویس ـــــ پیشوا کا نمائندہ
بھونسلہ ـــــ مرہٹوں کا لیڈر
ہری پنتھ ـــــ پیشوا کا سپہ سالار
باپو جی ـــــ اندھا جیوتشی
موسیو لالی ـــــ حیدر علی کا فرانسیسی سپہ سالار
کپتان برتھ ویٹ ـــــ فرنگی سپہ سالار
رونی بیگم ٹیپو سلطان کی بیگم
کرشنا بائی ـــــ پیشوا کی ماں

اس کے علاوہ
مرہٹہ سردار
قاصد
پہرے دار اور سپاہی

پہلا ایکٹ

پہلا منظر

میسور کے شاہی محل کا وسطی حصہ، جہاں سے صرف سامنے کی چیزیں دکھائی دے رہی ہیں، پیچھے کا حصہ نظر نہیں آتا، محل کا بڑا دروازہ کھلا ہوا ہے اور کھلے ہوئے دروازہ سے باہر کشادہ برآمدہ اور صحن کا کچھ حصہ نظر آرہا ہے، برآمدہ پر دو پہرے دار چکر کاٹتے ہوئے نظر آرہے ہیں، یکایک محل کے پچھلے حصہ سے حیدر علی خاں وسطی حصہ میں آتے ہیں ان کے ہاتھ میں ایک خط ہے اور وہ سخت غصہ کی حالت میں دکھائی دے رہے ہیں چند لمحوں تک حیدر علی ایک جگہ کھڑے ہو کر کچھ سوچتے ہیں، پھر غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ اتنے میں برآمدہ پر سید غفار نظر آتا ہے۔ وہ بڑے دروازے کے راستے اندر آکر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے، حیدر علی کی نظر اس پر پڑتی ہے اور وہ چکر کاٹتے کاٹتے رُک جاتے ہیں۔

حیدر علی: سید غفار!

سید غفار: جناب عالی!

حیدر علی: وہ فرنگی قاصد کہاں ہے؟

سید غفار: محل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے حضور عالی!

حیدر علی: اُسے ابھی اور اسی وقت محل کے دروازے سے سیدھا مدراس واپس جانا ہوگا، انگریز سرکار کا یہ خط لے جاؤ اور اسے قاصد کے سامنے اپنے پیروں تلے روند کر اُسے میرا حکم سنا دو۔

(حیدر علی خط سید غفار کی طرف بڑھاتے ہیں اور سید غفار خط لے لیتا ہے)

اس سے کہہ دو کہ سمجھوتہ کا وقت گزر چکا ہے، اب حیدر علی کے ساتھ فرنگی قاصد کی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ میری ملاقات اب جنگ کے میدان میں فرنگی سپہ سالار سے ہوگی، جاؤ——!

(سید غفار چلا جاتا ہے اس کے جانے کے بعد ہی کریم شاہ آتا ہے)

کریم شاہ: ابا حضور!

حیدر علی: کون! کریم شاہ!

کریم شاہ: آپ فرنگی قاصد کو ذلیل کر کے لوٹا رہے ہیں!

حیدر علی : ہاں — ! اور وہ اس لیے کہ انگریز سرکار مجھے اس سے قبل ذلیل کرچکی ہے۔
کریم شاہ : (حیرت سے) انگریز سرکار نے آپ کو ذلیل کیا ہے !
حیدر علی : ہاں ! اس نے میرے مقبوضہ ماہی بندر کو فرانسیسیوں سے چھین لیا ہے، میں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تھی، اس نے اپنے قاصد کی معرفت مجھے کیا جواب بھیجا، جانتے ہو !

(کریم شاہ کوئی جواب نہیں دیتا ہے خاموش رہتا ہے)

اس نے جواب میں ایک زنگ خوردہ بندوق اور ایک جوڑا گھوڑے کی زین بھجوائی اور وہ زین سور کے چمڑے کی بنی ہوئی تھی !
کریم شاہ : پھر بھی فرنگی قاصد کے ساتھ ایسا ذلیل سلوک کرنا کیا آپ کے لیے مناسب تھا !
حیدر علی : تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مجھے اس کے ساتھ ایسا ذلیل سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا !
کریم شاہ : آپ کو یہ بات ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ پلاسی کی جنگ میں بنگال فتح کرنے کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کی طاقت ناقابل تسخیر ہو گئی ہے، وہ اگر چاہیں تو پورے ہندوستان میں بغیر کسی مزاحمت کے بڑی آسانی سے سامراجی نظام قائم کرسکتے ہیں اس طاقت کے خلاف ....

(کہتے کہتے رک جاتا ہے)

حیدر علی : ہاں، ہاں، کہو، رک کیوں گئے، اس طاقت کے خلاف !
کریم شاہ : اس طاقت کے خلاف آج کوئی بھی صف آرا نہیں ہو سکتا، کوئی بھی ٹھہر نہیں سکتا۔
حیدر علی : (گرج کر) کریم شاہ !
کریم شاہ : میں بالکل درست کہہ رہا ہوں ابا حضور ! یہاں تک کہ آپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے، نہیں ابا آپ بھی اس کے سامنے نہیں ٹک سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میسور کی پہلی جنگ میں جس حیدر علی خاں نے مدراس کا محاصرہ کیا تھا، وہ بہادر اور طاقتور شخصیت آج کمزور، مریض اور نحیف و ناتواں ہو چکی ہے، اس کے بازو شل ہو چکے ہیں، اس کا سینہ اور اس کی پیٹھ زخموں سے چور ہے۔
حیدر علی : اگر حیدر علی کمزور اور ناتواں ہو چکا ہے، اگر اس کا تمام جسم زخموں سے چور ہے تو کیا ہوا ! اس کا لائق بیٹا کریم شاہ تو زخمی نہیں ہے، وہ تو فرنگیوں کے ساتھ لڑ سکتا ہے، جنگ کرسکتا ہے !
کریم شاہ : کریم شاہ نے انگریزوں کے ساتھ کبھی جنگ نہیں کی اور نہ کبھی وہ جنگ کرے گا، انگریزوں کے ساتھ آپ کی خوش بختی اور بدنصیبی کا ساتھی، آپ کا لائق اور فرمانبردار بیٹا فتح علی خاں ٹیپو جنگ کرے گا۔
حیدر علی : پھر کریم شاہ کیا کریں گے !
کریم شاہ : میں جب تک زندہ ہوں، موت کی سمت بڑھنے والے ان جذباتی مسافروں کو تباہی کے راستے سے لوٹانے کے لیے ہمیشہ کوشش کرتا رہوں گا۔

حیدر علی : کوشش کروگے ؟ اور اپنی مضبوط پیٹھ پر انگریز سوداگروں کے جوتے ڈھو کر اپنے خاندان کی پیشانی پر پڑے ہوئے انگریز دشمنی کے داغ کو مٹانے کی کوشش کروگے ! کیوں !

کریم شاہ : آبا حضور !

حیدر علی : میں تمہاری ذہنیت سے واقف ہوں، انگریزوں کے خوشامدی ! تمہاری اس مضبوط پیٹھ پر میں ایسے نشان ڈال دوں گا کہ تم جب بھی کبھی انگریزوں کے جوتے ڈھونے جاؤگے تمہیں یہ ضرور یاد آئے گا کہ تمہارا باپ انگریزوں کا دشمن اور فاتح حیدر علی خاں ہے ——— غلام ——— !

(غلام داخل ہوتا ہے)

اس ناکارے کو لے جاؤ اور اس کی پیٹھ پر گن کر پچیس ۲۵ کوڑے لگاؤ تاکہ اس کی کھال چھید کر کوڑے کے نشانات گوشت میں اتر جائیں اور اس کا زخم برسوں رستا رہے ۔

کریم شاہ : آبا حضور !

غلام : جہاں پناہ !

حیدر علی : میں کچھ سننا نہیں چاہتا ، لے جاؤ ، ابھی اور اسی وقت ....

کریم شاہ : (بات کاٹ کر) آپ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں ، دیجئے ، لیکن پھر بھی میں آپ سے یہی کہوں گا کہ اگر آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انگریزوں کے غصہ کی آگ نہ بھڑکائیں ، انھیں غصہ نہ دلائیں ورنہ اس کا انجام بہت بُرا ہوگا ۔

(غلام ، کریم شاہ کو لے کر چلا جاتا ہے)

حیدر علی : جاؤ ناکارے ! حیدر علی کو ایسی زندگی نہیں چاہیے جو انگریزوں کے رحم و کرم کی محتاج ہو ، حیدر علی ایسی نوابی بھی نہیں چاہتا ، جو نوابی ، انگریزوں کی غلامی کے مترادف ہو ۔

(پورنیہ داخل ہوتا ہے)

پورنیہ : جہاں پناہ !

حیدر علی : کیا خبر ہے دیوان پورنیہ !

پورنیہ : مرہٹہ نانا فرنویس شرفِ باریابی کی اجازت چاہتے ہیں ، میں نے جہاں پناہ کے حکم کے انتظار میں انھیں باہر کے مہمان خانے میں بٹھا دیا ہے ۔

حیدر علی : باہر کے مہمان خانے میں کیوں ؟ انھیں میرے خاص مہمان خانہ میں ..... نہیں ، وہاں نظام کا قاصد ہے ۔ فرنویس میرے مہمان خاص ہیں اسی محل میں لے آؤ ۔

(پورنیہ چلا جاتا ہے اور حیدر علی پھر چکّر کاٹنے لگتے ہیں)

نانا فرنویس ! اس طاقتور مرہٹہ برہمن کو اگر جنگ میں دوست کی حیثیت سے اپنے قریب پاسکوں تو کیسا رہے ؟

(پورنیہ کے ساتھ نانا فرنویس داخل ہوتا ہے اور حیدر علی اس کا استقبال کرنے کیلئے آگے بڑھ جاتے ہیں)

آئیے، آئیے، مرہٹہ وزیر اعظم نانا فرنویس، آئیے! آج آپ کے قدموں نے غریب خانہ کی رونق بڑھا دی ہے۔

نانا فرنویس : ہندوستان کے سب سے زیادہ طاقتور اور آزاد نواب حیدر علی خاں بہادر، ایک مرہٹہ لیڈر کی اس قدر عزت افزائی فرمائیں گے، مجھے اس کی اُمید نہیں تھی۔

حیدر علی : لیکن اس مرتبہ تو آپ لوٹ مار مچانے کے لیے میسور نہیں آئے ہیں مرہٹہ وزیر اعظم!

نانا فرنویس : نہیں...... اس مرتبہ میں میسور کے والی کے پاس مرہٹہ قوم کی ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔

حیدر علی : حیدر علی خاں وہ درخواست سننا چاہتے ہیں۔

نانا فرنویس : میرا خیال ہے سلطان اس حقیقت سے ضرور باخبر ہوں گے کہ مرہٹہ پیشوا نارائن راؤ اپنے چچا رگھوبا کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔

حیدر علی : ہاں، میں سُن چکا ہوں کہ نارائن راؤ کو قتل کرنے کے بعد رگھوبا اب پیشوا کی گدی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ آپ آنجہانی پیشوا کے لڑکے کی حمایت میں ہیں، یہی بات ہے نا!

نانا فرنویس : صرف میں ہی نہیں، اگاگوار کے علاوہ تمام مرہٹہ لیڈر، سندھیا، بھونسلہ، ہولکار، سبھی اس لڑکے کی حمایت کر رہے ہیں اور تمام مرہٹہ قوم اس لڑکے کو باپ کی گدی پر بٹھانے کے خواہشمند ہیں۔

حیدر علی : (سوچتے ہوئے) ہوں! اور رگھوبا!

نانا فرنویس : رگھوبا فرنگی حکومت کی پناہ میں ہے اور فرنگی حکومت پیشوا کی گدی سے نارائن راؤ کے نابالغ لڑکے کو بے دخل کر کے اس مجرم رگھوبا کو گدی پر بٹھانا چاہتی ہے۔

حیدر علی : ہوں —!

نانا فرنویس : میں انگریزوں کے ساتھ ہونے والی اس امکانی جنگ میں میسور کے والی سے مدد حاصل کرنے کی درخواست لے کر آیا ہوں۔

حیدر علی : دیوان پورنیہ!

پورنیہ : عالی جناب!

حیدر علی : شہزادہ ٹیپو کو بلاؤ!

(پورنیہ چلا جاتا ہے)

سنیئے مرہٹہ وزیر اعظم! چونکہ شہزادہ ٹیپو بھی اب امورِ سلطنت کو سمجھنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس لیے میں اس معاملے میں شہزادہ سے مشورہ کیے بغیر آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

(پورنیہ کے ساتھ شہزادہ ٹیپو داخل ہوتا ہے)

ٹیپو سلطان : کیا حکم ہے ابّا حضور!

حیدر علی : شہزادہ ٹیپو، مرہٹہ وزیر اعظم نانا فرنویس ہمارے پاس ایک درخواست لے کر......

ٹیپو سلطان : (بات کاٹ کر) میں ان کے آنے کا مقصد جاسوس کی زبانی سن چکا ہوں ابا حضور! یہ انگریزوں کے ساتھ ہونے والی امکانی جنگ میں ہماری مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

نانا فرنویس : شہزادے نے جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ٹیپو سلطان : میری رائے! میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ انگریزوں کی حمایت حاصل کریں۔

نانا فرنویس : حمایت!

حیدر علی : (حیرت سے) انگریزوں کی حمایت!

ٹیپو سلطان : میرا خیال ہے رگھوبا نے انھیں بہت بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا ہے، ورنہ انگریز تاجر اسے کبھی پناہ نہ دیتے، اگر آپ بھی فرنگی حکومت کو رگھوبا سے زیادہ انعام دینے کا لالچ دیں، تو آپ دیکھیں گے انگریز حکومت رگھوبا کی حمایت سے دستبردار ہو کر فوراً نارائن راؤ کے لڑکے کو پیشوا بنانے کا اعلان کر دے گی۔ یہ سوداگروں کی حکومت ہے، سوداگروں کے لیے روپیہ سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ روپیہ خرچ کیجئے۔ پھر دیکھئے بغیر خون خرابہ کئے ہوئے آپ کا کام ہو جائے گا۔

نانا فرنویس : لیکن ہم خون خرابہ ہی چاہتے ہیں، ہم جنگ کرنا چاہتے ہیں۔

حیدر علی : (حیرت سے) جنگ کرنا چاہتے ہیں؟

نانا فرنویس : ہاں سلطانِ معظم! ہندستان میں ہر لمحہ بڑھتی ہوئی انگریزوں کی طاقت کو آج ہم ایسا سبق دینا چاہتے ہیں کہ مستقبل میں پھر کبھی ہمارے گھروں میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکا کر ہم لوگوں کے اوپر دوبارہ حکومت نہ کر سکے۔ رگھوبا اس لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور ہم اس مرتبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انگریزوں کی حاکمانہ قوت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

حیدر علی : آپ ایسا کر سکیں گے! آپ ایسا کر سکیں گے مرہٹہ وزیر اعظم!

نانا فرنویس : اگر سلطان معظم ہماری مدد کرنے کو تیار ہوں تو ہم ضرور کر سکتے ہیں۔

حیدر علی : اس سے قبل نظام حیدر آباد نے بھی اسی تجویز کے ساتھ اپنے قاصد کو میرے پاس بھیجا ہے، نظام، مرہٹہ اور میسور، اگر یہ تینوں طاقتیں یکجا ہو جائیں تو پھر مجھے یقین ہے کہ انگریز تاجر ہمارے سامنے صف آرا ہونے کی جرأت نہ کر سکیں گے، پھر انھیں اس دیس کی مٹی کی محبت کو خیر باد کہہ کر اس کی پاداش میں کالے پانی کے راستے اپنے جہازوں کو بہا کر اپنے ملک واپس لوٹ جانا پڑے گا۔

(چند لمحوں کیلئے خاموش ہو جاتے ہیں)

لیکن، لیکن مجھے یقین نہیں آتا، کیا واقعی یہ تینوں طاقتیں یکجا ہو سکتی ہیں، کیا یہ ممکن ہے؟

نانا فرنویس : ممکن کیوں نہیں سلطانِ معظم! نظام کی حمایت کا اعلان کر دیں اور مرہٹوں کی تجویز منظور کر لیں۔ آئیے ہم ہندستان کی تین عظیم طاقتیں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو کر میدان جنگ میں اُتر جائیں۔

حیدر علی : تمہارا کیا خیال ہے شہزادہ ٹیپو؟

ٹیپو سلطان : ماہی بندر کے محاصرہ کے بعد انگریزوں کے ساتھ ہماری جنگ یقینی ہوگئی ہے، اگر مرہٹہ اور نظام حیدر آباد ہمارا ساتھ دیں تو پھر ہمیں صرف حملہ کرنے کے طریقوں میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔

حیدر علی : آپ کس حصے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، نانا فرنویس ؟

نانا فرنویس : ہم برار اور مدھیہ بھارت کے علاقہ پر حملہ کریں گے۔

حیدر علی : شہزادہ ٹیپو ؟

ٹیپو سلطان : ہم مدراس اور جنوبی علاقہ پر قبضہ کریں گے اور نظام پر شمالی و جنوبی علاقہ دخل کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔

حیدر علی : ٹھیک ہے، ہم اسی طریقے سے جلد از جلد حملے کی تیاری کریں گے، آئیے! نانا فرنویس، نظام کا قاصد میرے مہمان خانے میں انتظار کر رہا ہے ـــ آئیے ہم دونوں معاہدہ پر اپنی اپنی مہریں لگا دیں، اس کے بعد دیکھیں کہ پلاسی کے میدان میں جو نفرت کا پودا لگایا گیا تھا اُسے جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں یا نہیں!

(حیدر علی اور نانا فرنویس چلے جاتے ہیں)

ٹیپو سلطان : (اپنے آپ سے) پلاسی میں بویا جانے والا نفرت کا پودا! میر جعفر، امیر چند اور جگت سیٹھ کے ساتھیوں نے خود اپنے ہاتھوں سے جو نفرت کا پودا لگایا تھا، وہ میر مدن اور موہن لال کے خون میں ڈوب کر بھی نہ مرجھا سکا، سراج الدولہ اور میر قاسم اپنی جان دے کر بھی اس پودے کو اُکھاڑ کر پھینک نہ سکے۔

(ٹیپو سلطان چکر کاٹنے لگتا ہے، عقب سے صوفیہ کی آواز سنائی دیتی ہے)

صوفیہ : اور اب حیدر علی خاں بہادر اور فتح علی خاں ٹیپو بھی اپنا خون دے کر اس نفرت کے پودے کو اُکھاڑ پھینکنے میں کامیاب نہ ہوں گے۔

(ٹیپو سلطان چکر کاٹتے کاٹتے رُک جاتا ہے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے)

ٹیپو سلطان : کون! کون باتیں کر رہا ہے ؟

(صوفیہ سامنے آجاتی ہے)

کون ہو تم ؟

صوفیہ : داسی کو صوفیہ کہتے ہیں۔

ٹیپو سلطان : صوفیہ ؟ ـــ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے لڑکی! تمہاری اتنی ہمت! تمہیں ایسی بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی ؟

صوفیہ : سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے شہزادے اور اسی لیے ایسی باتوں کو دیوانوں کی بکواس کہہ کر لوگ ہمیشہ اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دیتے رہے ہیں۔

ٹیپو سلطان : (حیرت سے) سچی بات! تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ سچ ہے ؟

صوفیہ : آپ کو یقین نہیں آتا شہزادے ؟

ٹیپو سلطان : تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہم انگریزوں کو شکست نہیں دے سکتے ؟

صوفیہ : میرا باپ جیوتشی ہے اور وہ اپنے حساب میں کبھی غلطی نہیں کرتا شہزادے!

ٹیپو سلطان : او، اب کھلا بھید، یہ جیوتش کا حساب! ہا ہا ہا، کون ہے تمہارا باپ؟

صوفیہ : میرے باپ کا نام معلوم کرکے آپ کیا کریں گے؟

ٹیپو سلطان : میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

صوفیہ : دیکھنا چاہتے ہیں یا سزا دینا چاہتے ہیں!

ٹیپو سلطان : فضول باتیں نہ کرو، بتاؤ وہ کہاں ہے؟

صوفیہ : میں نہیں بتاؤں گی۔

ٹیپو سلطان : (ڈپٹ کر) صوفیہ!

صوفیہ : خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے شہزادے! اگر آپ سزا دینا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔ بے گناہ جیوتشی کو قید کرکے آپ کو کوئی خوشی حاصل نہ ہوگی، اس کی جگہ آپ مجھے قید کر سکتے ہیں، قتل کر سکتے ہیں کیونکہ باپو جی کی مہربانی سے میں بھی اس علم سے تھوڑا بہت واقفیت رکھتی ہوں۔

ٹیپو سلطان : اور جو کچھ تم جانتی ہو وہ نہ جاننے کے برابر ہے اب تمہیں دوبارہ اس علم کو سیکھنا ہوگا، کیونکہ جو زائچہ تم نے تیار کیا ہے وہ غلط ہے۔

صوفیہ : غلط ہے؟

ٹیپو سلطان : ہاں، اور وہ اس لیے کہ میسور کی طاقت نے آج تک انگریزوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالا، انگریزوں سے اپنی شکست تسلیم نہیں کی اور نہ کبھی شکست تسلیم کرے گی۔

صوفیہ : جو صحت مند اور توانا آدمی کبھی بیمار نہیں پڑتا اس کی صحت اور توانائی کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آئندہ بھی کبھی بیمار نہ ہوگا؟

ٹیپو سلطان : تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن میسور کی طاقت کے درمیان ابھی ایسی کوئی علامت دکھائی نہیں دی ہے، جس سے اسے بیمار سمجھا جائے اور اسی لیے آج ہم صحت مند اور توانا جسم کے ساتھ اپنی پوری قوت کو یکجا کرکے انگریز کے خلاف جنگ کر رہے ہیں اور ہمارے ساتھ جانباز مرہٹے اور نظام حیدر آباد کی پوری فوج بھی اس جنگ میں شریک ہے۔

صوفیہ : کیا یہ اتحاد ممکن ہے؟

ٹیپو سلطان : کیوں نہیں! آج تین عظیم طاقتیں انگریزوں کے خلاف متحد ہو چکی ہیں۔

صوفیہ : لیکن میرا علم کہتا ہے کہ ان تین طاقتوں کے درمیان اتحاد نہیں ہو سکتا، یہ اتحاد ممکن نہیں۔

ٹیپو سلطان : کیوں ممکن نہیں؟

صوفیہ : یہ میں نہیں جانتی، شاید اس لیے کہ اس قوم پر خدا کا عتاب ہے۔

ٹیپو سلطان : صوفیہ!

صوفیہ : میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں شہزادے! ہندستان میں اگر کبھی مختلف طاقتوں کے درمیان اتحاد ہوا ہے تو وہ غیر ملکیوں کے

قدم جمانے کے لیے ہوا ہے، غیر ملکیوں کی طاقت کو توڑنے اور انھیں شکست دینے کے لیے کبھی اتحاد نہیں ہوا۔ جس طرح ٹیکشلا اور سکندر کے درمیان اتحاد ہوا تھا جس کے نتیجے میں راجہ پورس کو شکست کھانی پڑی تھی، جس طرح جے چند اور محمد غوری کے درمیان اتحاد ہوا تھا جس کے نتیجے میں پرتھوی راج کو جان دینی پڑی تھی اور جس طرح پلاسی کے میدان میں میر جعفر، جگت سیٹھ اور لارڈ کلایو کے درمیان اتحاد ہوا تھا جس کے نتیجے میں بدقسمت سراج الدولہ کو اپنی جان کی قربانی دینی پڑی تھی۔

ٹیپو سلطان : صوفیہ!

صوفیہ : فرمائیے شہزادے!

ٹیپو سلطان : سچ بتاؤ تم کون ہو؟

صوفیہ : جیوتشی!

ٹیپو سلطان : نہیں، یہ نجوم کی باتیں نہیں ہیں، یہ سیاسی باتیں ہیں، جاسوسی کی باتیں ہیں، تم ضرور میرے دشمنوں کی خفیہ جاسوس ہو، میں تمہیں قید کر دوں گا، تمہارے ہاتوں میں ہتھکڑی ڈال دوں گا، اب تم آزاد نہیں رہ سکتیں۔

(عقب کی طرف سے روبی بیگم داخل ہوتی ہے اور ٹیپو سلطان کے قریب آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

روبی بیگم : اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان : کون! (مڑ کر دیکھتا ہے) روبی بیگم!

روبی بیگم : ہاں، میرے آقا!

ٹیپو سلطان : کیا بات ہے، تم یہاں کس لیے آئی ہو؟

روبی بیگم : ایک معمولی لڑکی کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے اعلیٰ حضرت! اسے چھوڑ دیجئے۔

ٹیپو سلطان : تم نہیں جانتی روبی بیگم، یہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے، یہ کوئی غیر معمولی لڑکی ہے، اس نے مجھے شک و شبہ کے درمیان لا کر کھڑا کر دیا ہے، اس نے مجھے وسوسے میں ڈال دیا ہے، اس نے مجھے فکر مند کر دیا ہے۔

روبی بیگم : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ایک معمولی لڑکی نے آپ کو وسوسے میں ڈال دیا ہے، آپ کو فکر مند کر دیا ہے! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا، شہزادہ ٹیپو سلطان شک و شبہ میں پڑ کر ایک لڑکی کو سزا دینا چاہیں، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی، ایسا سوچتے ہوئے بھی میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

ٹیپو سلطان : (کچھ سوچ کر) تم ٹھیک کہتی ہو روبی بیگم! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے (صوفیہ سے مخاطب ہو کر) صوفیہ! میں تمہیں سزا نہیں دوں گا، لیکن پھر بھی تمہیں آزاد نہیں رہنے دوں گا، میں تمہیں اسی محل میں قید کر کے رکھوں گا۔

صوفیہ : میں اس کی وجہ معلوم کر سکتی ہوں شہزادے!

ٹیپو سلطان : اگر سچ مچ تم علم نجوم جانتی ہو تو پھر جو کچھ تم نے کہا ہے، اُسے سچ ثابت کرنے کے لیے تمہیں اس وقت تک میرے ساتھ رہنا ہو گا، جب تک میں زندہ ہوں۔

صوفیہ : لیکن بن کی چڑیا اگر پنجرہ میں مقید کر دی جائے تو وہ چہکنا بند کر دیتی ہے، پھر وہ اپنے دل کا حال نہیں سنا سکتی، اس وقت وہ رٹائے ہوئے جملے بولتی ہے۔

ٹیپو سلطان : ہوں —— لیکن اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو تم بھاگ نہیں جاؤ گی اس کی کیا ضمانت ہے ؟

صوفیہ : زمین کے سینے پر جب رات کی سیاہی پھیل جاتی ہے، اس وقت کھلے آسمان کی وسعتوں میں اڑنے والے پنچھی آسمان کی وسعتوں میں نہیں رہتے، اس وقت وہ زمین پر بنائے ہوئے گھونسلوں میں واپس آجاتے ہیں۔

ٹیپو سلطان : اچھا تو پھر جاؤ، آزاد فضا میں اڑنے والی پنچھی، جاؤ، میسور کی قسمت کا ستارہ اگر کبھی تاریکیوں میں ڈوب جائے تو تم اس تاریکی میں واپس لوٹ آنا نہ بھولنا، میں اس وقت تمہارا انتظار کروں گا، میں تمہارا بے چینی سے انتظار کروں گا۔

(صوفیہ آہستہ آہستہ سامنے کے دروازے سے باہر چلی جاتی ہے اور ٹیپو سلطان اور روبی بیگم اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

دُوسرا منظر

پونا میں واقع مرہٹہ پیشوا کا محل، دیوار پر قومی ہیرو اور دیوی دیوتاؤں کی رنگین تصویریں بڑے بڑے فریم میں جڑی ہوئی، آویزاں ہیں، سامنے ایک بڑا سا دروازہ ہے جس کے دونوں پٹ بند ہیں، دائیں طرف ایک قد آدم آئینہ ٹنگا ہوا ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی گول میز رکھی ہوئی ہے جس کے چاروں طرف چھ کرسیاں ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک ڈھال ٹنگا ہوا ہے جس میں دو ننگی تلواریں لٹک رہی ہیں۔ یکایک سامنے کا دروازہ کھلتا ہے اور دروازہ کے باہر دو سنتری ہاتھ میں بھالا لیے ہوئے کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد چند مرہٹہ لیڈروں کے ساتھ نانا فرنویس کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

نانا فرنویس : نہیں، نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا سندھیا!

سندھیا : لیکن میں جو بمبئی کی حکومت سے وعدہ کر آیا ہوں کہ جس طرح بھی ہو گا میں اس اتحاد کو توڑ کر رہوں گا۔

نانا فرنویس : اگر انگریز اور مرہٹہ کے درمیان اتحاد ممکن ہوتا تو یہ اتحاد بہت پہلے ہو چکا ہوتا۔

سندھیا : (حیرت سے) بہت پہلے!

نانا فرنویس : ہاں، اس اتحاد کی تمام شرائط بھی طے ہو چکی تھیں۔

(تمام لوگ گول میز کے گرد پھیلی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

اس معاہدہ کا نام انھوں نے Convention of Wargaon رکھا تھا، اس معاہدہ کی شرائط تھیں کہ

انھیں رگھوبا کو میرے حوالہ کرنا ہوگا، مہاراشٹر کی تمام مقبوضہ ریاستوں کو واپس کرنا ہوگا اور وہ مستقبل میں مہاراشٹر پر حملہ نہ کریں اس لیے انھیں پیشوا کے دربار میں چند انگریزوں کو ضمانت کے طور پر رکھنا ہوگا۔

سندھیا: آپ کچھ بھی کہیں، انگریز حکومت کے لیے واقعی یہ تمام شرائط بہت ہی ذلت آمیز تھیں، اور اسی لیے گورنر جنرل محمد ان شرائط سے اتفاق نہ کر سکے۔

نانا فرنویس: اس وقت جب یہ شرائط ان کے لیے قابل قبول نہیں تھیں تو پھر آج کیسے ہو گئیں، آج انگریزوں کے گورنر صاحب اسی معاہدہ کے لیے اتنے بے قرار کیوں ہیں؟

سندھیا: فضول جنگ و جدل سے کیا فائدہ ہے، آپ ہی بتایئے؟ خاص کر اس حالت میں جبکہ وہ لوگ امن چاہتے ہیں؛

نانا فرنویس: نہیں، وہ لوگ امن کے لیے ایسا ہرگز نہیں چاہتے، نظام، حیدر علی اور مہاراشٹر کے لیڈروں کے اتفاق اور ان تین طاقتوں کے اتحاد نے انھیں، ان سامراجیوں کو حواس باختہ کر دیا ہے اور اسی لیے وہ اس اتحاد کو توڑ دینا چاہتے ہیں، ان طاقتوں کو منتشر کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ اس کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کو آسانی کے ساتھ تباہ و برباد کر سکیں! میں ان کے ساتھ معاہدہ کرنے کو بالکل تیار نہیں، یہ معاہدہ صرف مہاراشٹر کے لیے ہی نہیں، پورے ہندستان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔

بھونسلہ: نانا فرنویس اس معاہدہ کو ہندستان کی تباہی کا پیش خیمہ سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس بارے میں ہم لوگوں کی رائے ان سے قطعی مختلف ہے۔

سندھیا: ہم لوگ مہاراشٹر کی بھلائی کے خواہاں ہیں، انگریز جیسی عظیم اور طاقتور قوم کے ساتھ جنگ کر کے ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی، پیشوا کے نمائندہ نانا فرنویس اگر اس معاہدہ کے حق میں نہیں ہیں تو پھر......

(دکھتے کہتے رک جاتا ہے)

نانا فرنویس: تو کیا ہوگا؟

سندھیا: پھر ہمیں مجبوراً پیشوا کی حمایت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

نانا فرنویس: آپ لوگ پیشوا کی حمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں، بہت خوب! لیکن کیوں؟ کیا مہاراشٹر کے لیڈروں سے میں اس کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں؟

بھونسلہ: وہ اس لیے کہ ہم لوگ انفرادی طور پر......

نانا فرنویس: (بات کاٹ کر) انفرادی طور پر؟

سندھیا: ہاں، انفرادی طور پر انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر چکے ہیں۔

نانا فرنویس: (حیرت سے) انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر چکے ہیں؟ آپ نے؟ سندھیا نے؟

سندھیا: ہاں میں نے!

نانا فرنویس: اور بھونسلے؟

بھونسلہ : ہاں میں نے بھی اور صرف میں ہی نہیں (ہات سے اشارہ کرکے) میرے علاوہ ان سبھوں نے بھی معاہدہ کر لیا ہے۔

نانا فرنویس : (حیرت اور مایوسی سے) سبھی معاہدہ کر چکے ہیں؟ تو پھر!

(اتنے میں ایک پہرے دار آتا ہے)

پہرے دار : حیدر علی خاں کے فرانسیسی سپہ سالار موسیو لالی پیشوا سے ملنا چاہتے ہیں!

نانا فرنویس : کہاں ہیں وہ؟

پہرے دار : پونا کے قلعہ میں انتظار کر رہے ہیں، انھوں نے پیشوا کے نمائندہ کے نام یہ خط دیا ہے۔

(پہرے دار ایک لفافہ نانا فرنویس کو دیتا ہے)

نانا فرنویس : جاؤ اور ان کا پُر تپاک خیر مقدم کرکے یہاں لے آؤ۔

(پہرے دار چلا جاتا ہے اور نانا فرنویس لفافہ چاک کرکے پڑھتا ہے)

ہوں! تو آخر نظام نے بھی.....

(کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

بھونسلہ : کیا ہوا؟

نانا فرنویس : نظام بھی آپ ہی لوگوں کے دوست نکلے۔

سندھیا : (حیرت سے) ہمارے دوست؟

نانا فرنویس : ہاں، حیدر علی خاں لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے گنٹور ضلع نظام حیدرآباد کو دے دیا ہے، اسی لیے نظام اپنی پوری فوج کے ساتھ میدان جنگ سے لوٹ آئے ہیں۔

سندھیا : پھر اب آپ کو کیا عذر ہے نانا فرنویس؟ تین طاقتوں کا اتحاد ٹوٹ ہی چکا ہے۔

بھونسلہ : ٹھیک ہی تو ہے، حیدر علی بھی مسلمان ہیں اور نظام بھی مسلمان ہیں، لیکن نظام نے مسلمان ہوتے ہوئے حیدر علی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

نانا فرنویس : آپ کے خیال میں نظام نے بہت بُرا کیا، کیوں؟

بھونسلہ : وہ تو......

نانا فرنویس : (بات کاٹ کر) آپ لوگ بھی تو ہندو ہیں، مرہٹہ ہیں، پیشوا بھی ہندو ہے، مرہٹہ ہے، اگر آپ لوگ ہندو مرہٹہ ہو کر اپنے انگریز دوست کی خاطر ہندو مرہٹہ پیشوا کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں تو پھر اس سفید فام دوست کی خاطر مسلمان نظام نے مسلمان حیدر علی کا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا بُرا کیا ہے بھونسلہ راجہ؟

سندھیا : سنیے نانا فرنویس، ہم ایک بار پھر کہتے ہیں، اگر آپ انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر لیں تو پھر ہم لوگ پیشوا کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

نانا فرنویس : میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ معاہدہ نہیں ہو سکتا، میں حیدر علی سے وعدہ کر چکا ہوں۔

سندھیا : اچھی بات ہے، اگر آپ ان تمام اعلیٰ ذات کے ہندو دوستوں سے زیادہ مسلمان حیدر علی کو.......

نانا فرنویس : (بات کاٹ کر) ہاں، آپ جیسے ہندوؤں سے جنھیں گوری چمڑی کے لوگ پسند ہوں، میں عوام کے محبوب مسلمان حیدر علی کی دوستی کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

سندھیا : تو پھر ہم لوگ بھی مجبور ہیں نانا فرنویس، ہم لوگ ہمیشہ کے لیے پیشوا کا ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

(سندھیا اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

نانا فرنویس : میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اگر مجھے حیدر علی یا فتح علی ٹیپو جیسا ایک بھی مسلمان دوست مل گیا تو مجھے آپ جیسے سیکڑوں غدار ہندوؤں کے ساتھ چھوڑ دینے کا کوئی افسوس نہ ہو گا۔

سندھیا : ٹھیک ہے، پھر پیشوا کو آپ کی اس شیخی کا بہت جلد خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

(سندھیا جانے لگتا ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے تمام مرہٹہ لیڈر اپنی اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اتنے میں کرشنا بائی کمرے میں داخل ہوتی ہے)

کرشنا بائی : ٹھہریئے! مہاراشٹر کے نیتاؤ، ٹھہریئے!

سندھیا : (حیرت سے کرشنا بائی کی طرف دیکھتا ہے، کون؟ پیشوا کی ماں؟ کرشنا بائی؟

کرشنا بائی : کیا آپ لوگ پیشوا کا ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں؟

سندھیا : کیا کریں مجبوری ہے، ہم لوگ انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر چکے ہیں، اگر پیشوا انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھائیں گے تو ہم لوگوں کو مجبوراً پیشوا کا ساتھ چھوڑنا ہی پڑے گا!

کرشنا بائی : لیکن انگریزوں کے ساتھ ہماری دوستی کس طرح ہو سکتی ہے؟ آپ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ وہ میرے لڑکے کو پیشوا بنانا نہیں چاہتے بلکہ وہ لوگ میرے پتی کے قاتل رگھوبا کے طرفدار ہیں!

سندھیا : لیکن اب وہ لوگ آپ کے لڑکے کو گدی پر بٹھانے کے لیے تیار ہیں۔

کرشنا بائی : (حیرت سے) کیا یہ ممکن ہے؟ کیا انگریز میرے لڑکے کو پیشوا کی حیثیت سے تسلیم کریں گے؟

سندھیا : ہاں، ہاں کیوں نہیں، اور صرف یہی نہیں، وہ لوگ رگھوبا کا مطالبہ رد کر دیں گے اور سالسیٹا کے علاوہ باقی تمام مقبوضہ ریاست پیشوا کو واپس کر دیں گے۔ (عہد نامہ دکھاتے ہوئے) یہ دیکھئے ان کا عہد نامہ بھی میرے پاس ہے۔

(سندھیا عہد نامہ کرشنا بائی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

کرشنا بائی : (نانا فرنویس سے) پیشوا کے نمائندہ!

نانا فرنویس : میں یہ عہد نامہ دیکھ چکا ہوں، اُسے سندھیا کو لوٹا دو۔

کرشنا بائی : (حیرت سے) لوٹا دوں؟ نہیں، کوئی ہے، قلمدان لاؤ۔

(خادمہ قلمدان لا کر دیتی ہے)

(خادمہ قلمدان لا کر دیتی ہے)

لیجئے! آپ اس عہد نامہ پر دستخط کر دیجئے۔

نانا فرنویس: نہیں، میں اس عہد نامہ پر دستخط نہیں کر سکتا۔

کرشنا بائی: کیوں؟

نانا فرنویس: اس لیے کہ انگریزوں کے ساتھ میرا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔

کرشنا بائی: (حیرت سے) معاہدہ نہیں ہو سکتا؟ لیکن کیوں؟

نانا فرنویس: اس لیے کہ یہ معاہدہ صرف مہاراشٹر کے لیے ہی نہیں، پورے ہندستان کے لیے تباہی کا باعث ہوگا۔

کرشنا بائی: آپ مہاراشٹر اور ہندستان کی بات چھوڑیئے، میں پیشوا کی ماں ہوں، میں صرف اپنے بیٹے کی بھلائی چاہتی ہوں، میں انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہتی ہوں۔

نانا فرنویس: اگر تم معاہدہ کرنا چاہتی ہو تو سنو، جب تک نانا فرنویس پیشوا کا نمائندہ ہے، اس وقت تک یہ معاہدہ نہیں ہو سکتا، میں یہ معاہدہ نہیں ہونے دوں گا۔

کرشنا بائی: (حیرت سے) آپ یہ معاہدہ نہیں ہونے دیں گے؟

نانا فرنویس: نہیں، ہم آخری دم تک انگریزوں کے خلاف جنگ کریں گے۔

کرشنا بائی: اور اس جنگ کے نتیجے میں اگر میرا لڑکا گدی سے بے دخل کر دیا گیا!

نانا فرنویس: غیر ملکیوں کے قدموں تلے رہ کر گدی حاصل کرنے سے بے دخل ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔

کرشنا بائی: اگر میرے لڑکے کو زندگی سے ہات دھونا پڑا!

نانا فرنویس: تو بھی کوئی بات نہیں، آزادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔

کرشنا بائی: (طنزیہ لہجہ میں) آپ ٹھیک کہتے ہیں، آزادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے، مگر وہ میرے بچے کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتی اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ وہ ایک بے سہارا اور بیوہ ماں کے نابالغ لڑکے کی زندگی ہو، کیا یہ درست نہیں؟

نانا فرنویس: مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کرو کرشنا بائی!

کرشنا بائی: نہیں، اب میں آپ کو غلط نہیں سمجھ سکتی بلکہ اتنے دنوں تک جو غلط سمجھتی رہی ہوں آج سے اس غلطی کی پرایشچت کروں گی۔

نانا فرنویس: کون سی غلطی کرتی رہی ہو اب تک؟

کرشنا بائی: یہی کہ اتنے دنوں تک میں نے اپنے لڑکے کے سرہانے ایک کالے سانپ کو بٹھا رکھا تھا۔

نانا فرنویس: کالا سانپ؟

کرشنا بائی: انگریزوں کے ساتھ آپ کیوں معاہدہ کرنا نہیں چاہتے، کیا میں اس کی وجہ نہیں سمجھتی نانا فرنویس!

نانا فرنویس: تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

کرشنا بائی: اس کی وجہ یہی ہے کہ اگر آج معاہدہ ہو جاتا ہے تو میرے لڑکے کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے انگریزوں کی طاقتور

حکومت کی حمایت حاصل ہوجاتی ہے اور نانا فرنویس اتنی بڑی طاقت کو میرے لڑکے کی حمایت میں لانا نہیں چاہتے، وہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں سے جنگ ہو اور اس کے نتیجے میں میرے لڑکے کی گدی چھن جائے اور اس کے بعد وہ انگریزوں سے نیا معاہدہ کریں اور معاہدہ کی رو سے پیشوا کی خالی گدی پر خود بیٹھ جائیں۔

نانا فرنویس: کرشنا بائی! میں تمہیں اپنی لڑکی کے برابر سمجھتا ہوں، تمہارا لڑکا صرف تمہارے جگر کا ٹکڑا ہی نہیں، میری آنکھوں کی روشنی بھی ہے لیکن تمہارے منہ سے.... تمہاری زبان سے یہ میں کیا سن رہا ہوں، کرشنا بائی!

کرشنا بائی: نہیں، میں کرشنا بائی نہیں ہوں، میں پیشوا کی ماں ہوں اور آپ! آپ تنخواہ پانے والے پیشوا کے ملازم ہیں۔

(نانا فرنویس کا چہرہ غم غصہ سے سرخ ہو جاتا ہے)

نانا فرنویس: میں پیشوا کا تنخواہ پانے والا ملازم ہوں! بہت بہتر! مجھے عہد نامہ دیجئے پیشوا کی والدہ محترمہ! تمہارے لڑکے کا یہ تنخواہ دار ملازم عہد نامہ پر دستخط کرنے کو تیار ہے۔

(نانا فرنویس، کرشنا بائی کے ہاتھ سے عہد نامہ لے لیتا ہے اور اس پر دستخط کرکے سندھیا کو دے دیتا ہے)

لیجئے سندھیا مہاراج! آپ کی آرزو پوری ہو گئی۔ اب آپ اسے انگریزی حکومت کے حوالے کرکے ان کی خوشنودی حاصل کرسکتے ہیں!

(موسیولالی کمرے میں داخل ہوتا ہے)

موسیولالی: Just wait a little Sindhya Maharaja. Tarry please !

سندھیا: (مڑکر دروازہ کی طرف دیکھتا ہے) کون، موسیولالی!

موسیولالی: ہاں، آپ کے ہات میں کیا ہے!

سندھیا: یہ عہد نامہ ہے۔

موسیولالی: عہڈ نامہ! کس کا عہڈ نامہ!

سندھیا: انگریزوں کا!

موسیولالی: کس کے ساتھ!

سندھیا: پیشوا کی طرف سے ہم لوگ انگریزوں سے معاہدہ کر رہے ہیں۔

موسیولالی: Is it ? Peshwa making treaty with the English
پیشوا انگریز کا ساتھ معاہڈہ کریں گا!
No, no, impossible, absurd آپ لوگ تماشا کرتا ہیں، ایں، ہا ہا ہا!

سندھیا: موسیولالی! حیدرعلی کے سپہ سالار کے ساتھ سندھیا مہاراج مذاق کرنا پسند نہیں کرتے۔

موسیولالی: مہاراج سندھیا کیا پسند کرتا ہیں، انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنے بھائی لوگوں کے گلے پر چھری چلانا پسند کرتا ہیں! ایں——!

کرشنا بائی: موسیو لالی!
موسیو لالی: آپ کون ہیں!
سندھیا: پیشوا کی ماں!
موسیو لالی: میڈا پیشوا!

(کورنش بجا لاتا ہے)

ہم آپ کو ناہیں دیکھا تھا، اکس کیوزمی پیر داما دام!

کرشنا بائی: سنو صاحب! تم اپنے سلطان حیدر علی خاں سے جاکر کہہ دو کہ پیشوا نے انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے۔

موسیو لالی: (حیرت سے) You say so ! میڈ بولتا ہیں، انگریز کے ساتھ معاہدہ ہوئیں گا! نو، نو مادام، معاہدہ ناہیں ہوئیں گا، معاہدہ ناہیں ہونے سکتا ہیں۔

کرشنا بائی: کیوں؟ معاہدہ کیوں نہیں ہو سکتا؟

موسیو لالی: کیوں؟ معاہدہ ہوئیں گا تو حیدر علی بہادر کے پاس نانا فرنویس کس واسطے گیا، حیدر علی کے ساتھ کس واسطے معاہدہ کیا، حیدر علی نظام کا دوستی پر، نانا فرنویس کا دوستی پر بھروسہ کرکے کس واسطے انگریز کا ساتھ لڑائی کیا؟ بولو نانا فرنویس! آپ کیوں ناہیں بولتا ہیں، آپ بولو، آپ میڈ کو بولو، کس واسطے معاہدہ ناہیں ہونے سکتا ہیں۔

نانا فرنویس: موسیو لالی!

کرشنا بائی: اس معاہدہ میں رکاوٹ ڈالنے کا نانا فرنویس کو کوئی حق نہیں ہے، میں یہ معاہدہ کروں گی، میں اپنے لڑکے کی بھلائی کے لیے انگریزوں کے ساتھ ضرور معاہدہ کروں گی!

موسیو لالی: Listen میڈ، حیدر علی کرناٹ سے انگریز کو ہٹا دیا ہیں، ٹیپو سلطان مالوہ میں انگریز کو Defeat دیا ہیں اور ادھر آپ کا مرہٹہ Soldiers اگر لڑائی کریں گا تو پھر انگریز ایک ہی دن بھی ہندستان میں ناہیں رہنے سکیں گا۔

They will have to die or to leave India for ever !

ان لوگوں کو مرنا ہوئیں گا یا ہندستان کو سلام کرکے چلا جانا ہوئیں گا ———

Mother. Peshwa is not thy only son !

صرف پیشوا آپ کا لڑکا ناہیں ہیں، ہندستان ہیں لاکھوں کروڑوں آپ کا لڑکا ہیں، ہندو، مسلمان سب آپ کا لڑکا ہیں، وہ لوگ آپ کا طرف دیکھ رہا ہیں، ہم دوسرا ملک کا آدمی ہیں، لیکن ہم بھی آپ کا پاس درخواست کرتا ہیں کہ آپ اپنا ملک انگریز کا ہات میں مت دو۔

(موسیو لالی جھک کر کرشنا بائی کا پاؤں پکڑ لیتا ہے)

اٹھو، فرانسیسی بیر! انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم انگریزوں کی غلامی قبول کر رہے ہیں، اگر ضرورت پڑی تو پیشوا بھی انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے کبھی نہ چوکے گا، لیکن ہم حیدر علی کے ساتھ مل کر بلا وجہ

انگریزوں کو اپنا دشمن بنانا نہیں چاہتے، اس لیے ہم نے معاہدہ کر لیا ہے۔

موسیو لالی: (غصہ اور حیرت سے) معاہدہ ہو گیا ؟ انگریز کا ساتھ معاہدہ ہو گیا ؟ آپ کا بات پر بھروسہ کر کے حیدر علی لڑائی شروع کیا ہیں۔ An old man of eighty اتی برس کا بوڑھا! Severely wounded ابھی تک آپ کے بھروسہ میں ہیں، آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہیں اور آپ اس کا دشمن کا ساتھ معاہدہ کریں گا اور بوڑھا حیدر علی آپ کا واسطے جان دے گا۔ Ah ! Beautiful ! is this your Indian chivalry ! جو لوگ سات سمندر تیرہ ندی پار سے آیا اس کا ساتھ دوستی ہوئیں گا اور جس دیس کا آدمی ہندو مسلمان ہیں، دونوں ایک دوسرے کا گلا دبا کر ماریں گا۔

سندھیا: موسیو لالی!

موسیو لالی: (غضب ناک ہو کر) No, no, it can't be ! تم معاہدہ نہیں کر سکتا ہیں۔ ہم نہیں ماننے سکتا ہیں۔ I cannot tolerate دھوکہ باز کو ہم اپنا ہاتھ سے Punishment دیں گا۔ ہمارا سولجر انگریز کا ساتھ لڑائی چھوڑ کر تمہارا ساتھ لڑائی کریں گا۔ Listen, you Maratha people, I take vow ! I promise ! I declare . . . . from this very moment. جو زبان جھوٹا ہیں اس کو ہم منہ سے کھینچ کر باہر نکال لیں گا۔

(موسیو لالی پیر پٹکتا ہوا جانے لگتا ہے)

نانا فرنویس: موسیو لالی!

موسیو لالی: (رک کر) تم نانا فرنویس! You traitor ! دھوکہ باز!

نانا فرنویس: (دھیرے سے مسکراتا ہے) دھوکہ باز! شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں دھوکہ باز ہی ہوں، لیکن تم ہمارا ملک کے خلاف اپنے دل سے نفرت نکال دو، غصہ تھوک دو، میں اپنی غداری اور دھوکہ بازی کی سزا پانے کے لیے خود ہی تمہارے ساتھ حیدر علی کے پاس جاؤں گا۔

موسیو لالی: (حیرت سے) ! Will you

نانا فرنویس: ہاں میں جاؤں گا۔

کرشنا بائی: میں یہ پسند نہیں کرتی کہ پیشوا کا قائم مقام حیدر علی سے ملاقات کرنے جائے۔

نانا فرنویس: نانا فرنویس اب پیشوا کا قائم مقام نہیں رہا۔ یہ ذمہ داری اب خود پیشوا کی ماں سنبھالیں گی۔

(موسیو لالی سے) آؤ صاحب! آج سے میں حیدر علی کا طرف دار ہوں۔

(موسیو لالی اور نانا فرنویس چلے جاتے ہیں اور تمام لوگ
خاموش انھیں جاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں ——)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

ایک میدان۔ چاروں طرف فوجی خیمے لگے ہوئے ہیں اور ادھر اُدھر چند مسلح فوجی پہرہ دیتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ خیموں کی قطاروں سے پرے ایک سڑک حدِ نظر تک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے، اسی سڑک پر آگے آگے صوفیہ اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے پیچھے پیچھے اندھا جیوتشی خیمے کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

باپوجی :۔ صوفیہ!

صوفیہ :۔ باپوجی!

باپوجی :۔ اور کتنی دور رہ گیا ہے صوفیہ؟

صوفیہ :۔ بس اب ہم لوگ پہنچ گئے ہیں باپوجی! وہ سامنے ہی تو قطار در قطار خیمے نظر آ رہے ہیں۔

باپوجی :۔ خیمہ نظر آ رہا ہے؟ ذرا ٹھیک سے دیکھ تو بیٹی، ان خیموں پر جو جھنڈا لہرا رہا ہے وہ کیسا ہے؟ اس میں کیسی تصویر بنی ہوئی ہے؟

صوفیہ :۔ جھنڈے میں شیر کی تصویر بنی ہے باپوجی!

باپوجی :۔ شیر کی تصویر! ٹھیک ہے۔ میں نے سُنا ہے میسور کے جھنڈے میں شیر ہی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم لوگ حیدر علی کے خیمے کے قریب آ گئے ہیں۔ آج ہم لوگوں کا طویل سفر ختم ہو جائے گا بیٹی۔

صوفیہ :۔ سفر ختم ہو جائے گا؟ تو کیا تم دور دراز سرنگا پٹم سے ارکوٹ حیدر علی سے ملاقات کرنے آئے ہو؟

باپوجی :۔ نہیں۔ میں یہاں سورج غروب ہونے کا منظر دیکھنے آیا ہوں۔

صوفیہ :۔ (حیرت سے) سورج غروب ہونے کا منظر؟

باپوجی :۔ ہاں! میسور کی راجدھانی سرنگا پٹم میں جو سورج طلوع ہوا تھا اور جس نے پورے ہندستان کو روشن کرنا چاہا تھا، وہی سورج ارکوٹ کے افق پر سیاہ ہو گیا ہے! سورج شاید غروب ہو گیا ہے بیٹی! لیکن کہاں، سویا ہندستان تو اب تک نہیں جاگا۔

صوفیہ :۔ کیوں نہیں جاگا باپوجی؟ ایک عظیم سورج طلوع ہو کر غروب بھی ہو گیا لیکن ہندستان جو پہلے ہی سے اندھیرا تھا، پھر بھی اندھیرے میں ڈوبا رہا۔ ہائے رے ہندستان، کیا تو کبھی نہیں جاگے گا؟

باپوجی :۔ جاگے گا بیٹی! ہندستان جاگے گا مگر کیسے جاگے گا جانتی ہو؟

صوفیہ :۔ کیسے؟

باپوجی :۔ ہندستان کی صدیوں پرانی اس نیند کو توڑنے کے لیے ایک عظیم انقلاب کی ضرورت ہے، ایک عظیم طاقت کی ضرورت ہے، بہت دنوں سے جو جھوٹ کا بازار گرم ہے، سازش کا جال پھیلا ہوا ہے، وہ کسی غضب ناک طوفان

کا منظر ہے، جو اپنے ناچ سے سارے ہندستان کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دے اور پھر اس غضب ناک دیوتا کے ناچ کے تال پر ہندستان کے آسمان پر اصلی سونے کی تحریر جیسی روشنی پھیل جائے گی، نئی صبح کا پیغام سنایا جائے گا۔ لیکن تم کہاں ہو سورج دیوتا؟ اترآؤ، اب تو زمین پر اترآؤ، اب بھی اپنا ڈمرو بجا دو۔۔۔۔!

(صوفیہ اور رباپوچی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ان دونوں کے جانے کے بعد اسی سڑک پر کریم شاہ اور جیوتشک نظر آتے ہیں)

جیوتشک :۔ سنئے شہزادے! ذرا میری پیش گوئی سنئے۔

کریم شاہ :۔ کیا سنوں؟ تمھاری پیشین گوئی درست نہیں ہے۔

جیوتشک :۔ درست نہیں ہے؟

کریم شاہ :۔ نہیں، بالکل غلط ہے۔ شہزادہ ٹیپو علم نجوم پر یقین رکھتے ہیں، مسلمان ہوتے ہوئے ہندو جیوتشی کو انعام و اکرام دیتے رہتے ہیں اسی لیے میں نے بھی تمھاری خاطر و مدارات کی تھی۔ سوچا تھا ٹیپو کی طرح اگر میرے اندر دوسری صفات نہیں ہیں تو نہ سہی اسی معاملے میں ہم دونوں کے مزاج کی یکسانیت دیکھ کر ممکن ہے ابا حضور کا دل پسیج جائے اور شاید اسی طرح میں کسی دن تخت پر بیٹھ سکوں۔

جیوتشک :۔ تخت پر تو آپ کو ایک نہ ایک دن بیٹھنا ہی ہے شہزادے! سرنگا پٹم کا تخت صرف آپ ہی کے لیے ہے۔

کریم شاہ :۔ یہ تم نے کیسے جانا؟

جیوتشک :۔ یہ دیکھئے نا! آپ کے کرکٹ میں مرکٹ کا سایہ ہے۔

کریم شاہ :۔ (حیرت سے) کرکٹ میں مرکٹ کا سایہ ہے؟

جیوتشک :۔ ہاں!

کریم شاہ :۔ کرکٹ کے کیا معنی ہیں؟

جیوتشک :۔ (قدرے پریشان ہو کر) معنی؟ کرکٹ کے معنی؟ یوں سمجھئے دونوں کے معنی ایک ہیں۔

کریم شاہ :۔ دونوں کے معنی ایک ہیں!

جیوتشک :۔ جی ہاں! جی ہاں! مرکٹ آپ کے بالکل قریب ہے۔

کریم شاہ :۔ (حیران ہو کر) مرکٹ میرے بالکل قریب ہے! لیکن کہاں، میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہوں، تمھارا حساب غلط ہے۔

جیوتشک :۔ جی نہیں۔ میرا حساب غلط کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کے قریب کیا کچھ بھی نہیں ہے؟ کوئی بھی نہیں ہے؟

کریم شاہ :۔ میرے قریب تو صرف تم ہو، تو کیا تم ہی مرکٹ ہو؟

جیوتشک :۔ ۔۔۔۔۔۔

کریم شاہ :۔ (بات کاٹ کر) اچھا! کرکٹ میں مرکٹ کا سایہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟

جیونشک:- اسے ارکوٹ آنا پڑتا ہے، آپ ارکوٹ آئے ہیں یا نہیں؟ بتائیے۔

کریم شاہ:- ہاں! یہاں تو آگیا ہوں مگر یہاں آ کر مجھے کیا فائدہ ہوگا، بتا سکتے ہو؟

جیونشک:- بتاتا ہوں۔ آپکے ستارہ میں اتبب سنکرانتی ہے۔

کریم شاہ:- اتبب سنکرانتی کیا ہوتا ہے؟

جیونشک:- اتبب سنکرانتی آپ نہیں جانتے؟ اتبب سنکرانتی کے اوپر میگھ راشی کا سایہ ہے اس لیے آپ کا ستارہ پوس سنکرانتی کے گھیرے میں ہے۔

کریم شاہ:- پوس سنکرانتی؟

جیونشک:- جی ہاں! آپ کا ستارہ پوس سنکرانتی کے گھیرے میں ہے اور اس کی پیٹھ پر بوجھ سوار ہے۔

کریم شاہ:- پیٹھ پر بوجھ سوار ہے! میری پیٹھ پر تو کوڑے کے نشان ہیں۔ ابا نے ایک روز بگڑ کر مجھے کوڑے سے پٹوایا تھا۔

جیونشک:- بس بس ٹھیک ہے۔ میرا حساب بالکل ٹھیک ہے، بتا کی زندگی میں پیٹھ پر کوڑے کی مار کھانا اور پتا کے مرنے کے بعد گدی پر بیٹھ کر کھیر کھانا آپ کی قسمت میں ہی لکھا ہے۔

کریم شاہ:- لیکن ابا حضور ابھی تھوڑے ہی مر رہے ہیں؟ اسی برس کی عمر میں جبکہ ان کا تمام جسم زخموں سے چور ہے، پھر بھی وہ کس بے جگری سے جنگ لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے پورے کرناٹ سے انگریزوں کو نکال بھگایا ہے، ادھر شہزادہ ٹیپو نے بھی مالوہ فتح کر لیا ہے۔ نہیں نہیں، میرا آن دیکھا آسمان ہر لمحہ اور بھی زیادہ تاریک ہوتا جا رہا ہے۔

جیونشک:- آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے شہزادے۔ میں آپکے آن دیکھے آسمان کی تمام تاریکیوں کو دور کر کے جلدی صاف اور روشن بنا دوں گا اور آپ نقارے بجا کر تخت پر بیٹھ سکیں گے۔

کریم شاہ:- (پیچھے کی طرف دیکھ کر) چپ رہو۔ میدان جنگ سے ابا جی لوٹ رہے ہیں چلو ہم لوگ یہاں سے کھسک جائیں۔

جیونشک:- چلئے چلئے! پچاس گز دور کھسک جائیں۔ جو لوگ اپنی زندگی کی بازی لگا کر جنگ لڑتے ہوں ایسے لوگوں سے پچاس گز دور ہی رہنا چاہیے۔ چلئے آئیے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد حیدر علی اور دیوان پورنیہ دکھائی دیتے ہیں)

حیدر علی:- پورے کرناٹ کو ہم نے کسی خوفناک آندھی کی طرح اپنی لپیٹ میں لے کر تہ و بالا کر ڈالا ہے اور ساتھ بیلی صاحب کی جو عظیم فوج مدراسی لشکر کی کمک بن کر آئی تھی اسے بھی ہم مکمل طور پر تباہ کر چکے ہیں۔

پورنیہ:- (متفکرانہ لہجہ میں) لیکن میں نے تو سنا ہے کہ بکسر کا فاتح مونرو اپنی فوج کے ساتھ ہم لوگوں کے خلاف جنگ کرنے آ رہا ہے۔

حیدر علی:- بکسر کا فاتح مونرو! (قہقہہ لگاتے ہوئے) ہا ہا ہا ہا۔ شاید تم نے ابھی تک اس کی بہادری کے قصے نہیں سنے دیوان پورنیہ!

پورنیہ :- وہ کیا عالی جناب!

حیدر علی :- (مسکراتے ہوئے) مونرو اپنی فوج کے ساتھ کانجی ورام تک آیا تھا لیکن بیلی کی درگت کا حال سن کر کانجی ورام کی ایک ندی میں اپنی بندوقیں، توپیں اور گولے بارود پھینک کر مارے خوف کے مدراس بھاگ گیا ہے۔

پورنیہ :- اس جنگ میں تو ہم لوگوں کو مکمل طور پر فتح حاصل ہو چکی ہے سلطانِ معظم! اب کیوں نہ ہم لوگ اپنی مرضی کے مطابق شرائط رکھ کر ان سے معاہدہ کر لیں اور سرنگاپٹم واپس لوٹ جائیں۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ کی صحت دن پر دن گرتی جا رہی ہے۔

حیدر علی :- تم ٹھیک کہتے ہو! میری صحت واقعی گر رہی ہے، واقعی میں بہت کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں۔ اب تو کچھ ایسی حالت ہے کہ کسی بھی لمحہ میری موت واقع ہو سکتی ہے۔ پھر بھی ...... پھر بھی بات کیا ہے جانتے ہو دیوان پورنیہ! جو لوگ معاہدہ کرنے کے بعد بھی موقع ملتے ہی معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ذرا نہ ہچکچاتے ہوں، ایسے لوگوں سے معاہدہ کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔

پورنیہ :- جہاں پناہ!

حیدر علی :- نظام غداری کر کے ہم سے الگ ہو گیا، مجھے اس کا افسوس نہیں لیکن ایسے وقت میں اگر مرہٹے بھی میرا ساتھ دیتے تو شاید مرنے سے قبل میں اپنے ملک کو غیر ملکیوں کے پنجے سے آزاد دیکھ سکتا، کیا ایسا نہیں ہو سکتا پورنیہ؟ مرنے سے پہلے میں ایک بار اور صرف ایک بار آزاد ہندستان کی صورت نہیں دیکھ سکتا؟

پورنیہ :- ضرور دیکھیں گے جہاں پناہ! مرہٹے جلد ہی آپ کے پاس آئیں گے۔ سپہ سالار موسیو لالی انھیں عزت کے ساتھ بلانے کے لیے پونا دربار گئے ہیں۔

حیدر علی :- پھر لالی کی واپسی میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ تمھارے راماین میں لکھا ہے کہ راون نے سورگ تک سیڑھی بنانا چاہا تھا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ میں بھی مریض اور ناتواں جسم کو لیے ہر لمحہ موت کی سمت بڑھ رہا ہوں اسی لیے مجھے ڈر لگتا ہے پورنیہ! شاید میری یہ خواہش پوری نہ ہوگی۔ مرہٹے شاید نہیں آئیں گے۔

(اتنے میں موسیو لالی اور نانا فرنویس دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں سلطان کے قریب آتے ہیں)

نانا فرنویس :- مرہٹوں کا سلام قبول کیجیے سلطانِ معظم!

حیدر علی :- (مڑ کر دیکھتے ہیں) کون! نانا فرنویس! تم آ گئے بھائی! آ گئے میرے دوست! اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ اب میرے مریض اور ناتواں جسم میں پھر سے سوگنا طاقت آ گئی ہے۔ مرہٹوں کا شیر میسور کے شیر ببر کے پاس آ گیا ہے۔ اب ان کے دھاڑنے کی آواز جنوب سے لے کر بحیرۂ عرب تک گونج کر فضا میں ارتعاش پیدا کر دے گی۔ آؤ میرے بہادر دوست آؤ، ہم متحد ہو کر آج اور اسی لمحہ اپنی اپنی فوجیں لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑیں، آؤ۔

نانا فرنویس :- (افسردگی سے) لیکن میرے پاس تو کوئی فوج نہیں ہے سلطانِ معظم! میں اکیلا ہوں۔ سارا مہاراشٹر آج انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کے بندھن میں جکڑا ہوا ہے۔

حیدر علی :- (حیرت سے) سارا مہاراشٹر انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کے بندھن میں جکڑ گیا ہے۔ سندھیا، بھونسلہ اور گائیکواڑ؟

نانا فرنویس :- ہاں! اور صرف یہی نہیں، پیشوا تک اس بندھن میں جکڑے جا چکے ہیں۔

حیدر علی :- (غمگین ہو جاتے ہیں) تو .... تو آخر کار تم لوگوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا! معاہدہ کر لیا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب فتح یقینی تھی، اُف .... پورنیہ ......

(حیدر علی بے ہوش ہو کر گرنے لگتے ہیں۔ نانا فرنویس انھیں
اپنے بازوؤں میں تھام لیتا ہے)

نانا فرنویس :- سلطان معظم! سلطان معظم!

پورنیہ :- ان کے سارے بدن میں کپکپی ہو رہی ہے۔ تمام جسم سرد پڑ گیا ہے۔ (آواز دیتا ہے) سلطان معظم!

حیدر علی :- (کمزور آواز میں) مجھے نیند آ رہی ہے، میں سونا چاہتا ہوں، مجھے لے چلو لیکن ...... لیکن تم لوگ مجھے کہاں لے جاؤ گے، مجھے کہاں سلاؤ گے؟ ہندوستان کی زمین کے نیچے تو میں آرام کی نیند نہ سو سکوں گا۔ میری نیند ٹوٹ جائے گی! کیا تم نہیں دیکھتے کہ سارا ہندوستان ناقابلِ برداشت درد کی شدت سے تڑپ رہا ہے، ہندوستان کی مٹی برف کی طرح سرد ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں آرام کی نیند میں کیسے سو سکتا ہوں۔

(خاموش ہو جاتے ہیں اور نانا فرنویس کو دیکھتے ہیں)

کتنے افسوس کی بات ہے نانا فرنویس! ہندوستان کی دھرتی کی چیخ سن کر تو آج لاکھوں برس کے مُردے بھی جاگ پڑے ہوں گے لیکن پھر بھی زندہ انسانوں کی نیند ابھی تک نہیں ٹوٹی، مُردے جاگ اٹھے ہیں لیکن زندہ انسان پھر بھی نہ جاگ سکا ..... نہ جاگ سکا۔

(پورنیہ اور نانا فرنویس، حیدر علی کو سہارا دیتے ہوئے خیمے کی طرف
لے جاتے ہیں، اس کے بعد جیو تشنک اور کریم شاہ نظر آتے ہیں)

کریم شاہ :- (گھبراتے ہوئے لہجہ میں) موسیو لالی آ رہا ہے، موسیو لالی!

موسیو لالی :- Who's there! (قریب آ کر) Prince Karim Saha

کریم شاہ :- سلطان کی حالت بہت نازک ہے کیا؟

موسیو لالی :- ہاں!

کریم شاہ :- اس مرتبہ ان کا بچنا مشکل نظر آتا ہے؟

موسیو لالی :- ہاں!

کریم شاہ :- موسیو لالی! تمھاری ماتحتی میں کتنی فوج ہے؟

موسیو لالی :- Twenty thousand بیس ہزار!

کریم شاہ :- بیس ہزار؟ کوئی پروا نہیں، میں تمھیں پچاس ہزار فوجوں کا سپہ سالار مقرر کروں گا، ٹیپو غدار کو برطرف کر کے تمھیں

سپہ سالارِ اعظم بنا دوں گا، بشرطیکہ تم میری چھوٹی سی مدد کرو۔

موسیو لالی : What help ! کیسا مدد؟

کریم شاہ :- سلطان تو...... جلد ہی ختم ہو رہے ہیں، ٹیپو بھی یہاں سے بہت دور مالوہ میں ہے، اگر تم مجھے اپنے ساتھ لے جا کر سرنگاپٹم میں تخت پر بٹھا دو تو......

موسیو لالی :- I see, I see !

کریم شاہ :- کیا خیال ہے، مجھے لے جاؤ گے؟

جیو لشک :- لالی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں! کیوں نہیں لے جائیں گے، لے جاؤ گے نا صاحب؟

موسیو لالی :- ہاں! ہاں! کیوں نہیں لے جائیں گا، ضرور لے جائیں گا۔

(موسیو لالی سپاہیوں کو اشارہ سے گرفتار کرنے کا حکم دیتا ہے)

جیو لشک :- (گھبرا کر) او فرنگی بابا! یہ سب کیا ہے صاحب؟

موسیو لالی :- These are Prince's bodyguards. یہ لوگ شہزادہ کا باڈی گارڈ ہیں۔

کریم شاہ :- او، تب ٹھیک ہے، چلو۔

(کریم شاہ آگے بڑھتا ہے)

موسیو لالی :- No, no, not that way, please (ہاتھ سے اشارہ کر کے) ادھر چلئے۔

کریم شاہ :- (حیرت سے) لیکن سرنگاپٹم تو اس طرف ہے؟

موسیو لالی :- ہم کو معلوم ہیں۔ لیکن حیدر علی خان بہادر or شہزادہ فتح علی ٹیپو کا حکم نہیں ملنے سے ہم سرنگاپٹم کا راستہ نہیں پہچانتا ہیں۔ ہم صرف prison کا way جیل کا راستہ جانتا ہیں اور وہ اس طرف ہیں (اشارہ کرتا ہے) آئیے! شہزادہ کریم شاہ!

کریم شاہ :- تم مجھے گرفتار کر رہے ہو موسیو لالی......

موسیو لالی :- (بات کاٹ کر) Not a word more, please !

(سپاہی شہزادہ کریم شاہ کو گرفتار کر کے لے جاتے ہیں۔ جیو لشک آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر موسیو لالی اس کا ارادہ بھانپ کر پکڑ لیتا ہے)

Now you my friend.

جیو لشک :- ارے، ارے! تم مجھے کیوں پکڑ رہے ہو، میں تو بالکل معمولی آدمی ہوں، اپنے رام کو چھوڑ دو۔

موسیو لالی :- You are a real Ram !

Mysore tiger, me think, shall not roar any more. The tiger will sleep the eternal sleep !

میسور کا شیر اب نا ہیں گرجے گا، اب بھی ٹائم ہیں، تم انگریز کا پاس چلا جاؤ، تمھارا مانک بہت Ram
ادھر میں ہیں، انگریز لوگ بھیڑی کو بہت Like کرتا ہیں اور چابک مار کر گھاس کھلاتا ہیں۔ جاؤ۔
(جیو تشک تھوڑی دور تک جانے کے بعد سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا
ہے اور رو سیو لالی اسے بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہنستا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

مالوہ میں ٹیپو سلطان کا خیمہ۔ ٹیپو سلطان خیمے کے اندر گدی پر بیٹھا ہوا ہے،
اس کے قریب ہی ایک طرف سپہ سالارِ اعظم سید غفار بیٹھا ہے، مسلح
محافظِ جان خیمے کے دروازوں پر کھڑے ہیں۔

ٹیپو سلطان:۔ سید غفار!
سید غفار:۔ فرمائیے شہزادے!
ٹیپو سلطان:۔ قیدی انگریز سپہ سالار کپتان بریتھ ویٹ کو حاضر کرو۔
(سید غفار خیمے سے باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد بریتھ ویٹ
کو لے کر خیمے میں داخل ہوتا ہے)
سید غفار:۔ قیدی سپہ سالار! شہزادے کو کورنش بجا لاؤ۔
بریتھ ویٹ:۔ نو، ہم لوگ کورنش کرنا ناہیں جانتا ہیں۔
ٹیپو سلطان:۔ تم کورنش کرنا نہیں جانتے بریتھ ویٹ لیکن ضرورت کے وقت تمھارے گورنر جنرل تک کو کورنش کرنا آجاتا
ہے، اگر تم اس کا ثبوت چاہو گے تو اس کی بھی کمی نہیں ہے، میسور کی پہلی جنگ میں جب ہم لوگوں نے مدراس
تک قبضہ کر لیا تھا تو تمھارے گورنر جنرل نے گھٹنے ٹیک کر ہم لوگوں سے صلح کر لینے کی بھیک مانگی تھی شاید
تمھیں بھی یاد ہوگا۔

بریتھ ویٹ:۔ No, I don't remember
ٹیپو سلطان:۔ اچھا تو اب تمھیں یہ بھی یاد نہیں رہا۔ میں جانتا ہوں، تم لوگ حالات کے ساتھ تمام باتیں بھول جانے کے عادی
ہو اسی لیے گھٹنے ٹیک کر بھیک مانگتے ہوئے تمھارے گورنر جنرل کی وہ یادگار تصویر یہ مدراس میں سینٹ جارج قلعہ
کے دروازے پر چسپاں کر آیا ہوں، اگر خوش قسمتی سے تمھیں واپس جانا نصیب ہو گیا تو اس تصویر کو اچھی طرح دیکھ
لینا بریتھ ویٹ! پھر تمھیں تمام باتیں یاد آجائیں گی۔

برتھ ویٹ: ہم کو تصویر دیکھنے کا درکار ناہیں ہیں۔ I am your prisoner ہم تمھارا قیدی ہیں، ہم کو کیا سزا دیں گا ؟ سزا دو!

ٹیپو سلطان: کیا تم بتا سکتے ہو تمھیں کیسی سزا دی جائے گی؟

برتھ ویٹ: I know! I know we the English soldiers are regarded by the natives as ferocious beasts who could be only subdued by mainforce.

تم لوگ انگریز کو جانور کا مافک سزا دینا مانگتا ہیں ۔

ٹیپو سلطان: تمھارا خیال صحیح ہے۔ میں واقعی تمھیں جانوروں کی طرح سزا دینا چاہتا ہوں اور وہ اس لیے کہ میرے خیال میں انگریز درندوں سے کم نہیں ہیں۔

برتھ ویٹ: Shahjada !

ٹیپو سلطان: ہاں! میں تم لوگوں کو درندہ ہی سمجھتا ہوں اسی لیے تمھیں جانوروں کی طرح سزا دینا چاہتا ہوں ورنہ بہادر اور جیالے قیدیوں کی عزت کرنا بھی میں جانتا ہوں۔

برتھ ویٹ: ہو! تم لوگ بہادر کا عزت کریں گا! جو لوگ اپنا بھائی، اپنا لڑکا کو کوڑا مارنے میں شرم ناہیں کرتا۔

ٹیپو سلطان: برتھ ویٹ!

برتھ ویٹ: ہاں! ہم جھوٹ ناہیں بولتا، ہم جانتا ہیں حیدر علی خاں اپنا لڑکا اور تمھارا بھائی کریم شاہ کو کوڑا سے مار کھلایا ہیں۔

ٹیپو سلطان: کریم شاہ چونکہ غیر ملکیوں کے جوتے ڈھونا چاہتا تھا اس لیے اگر حیدر علی خاں نے اپنے اس غدار بیٹے کو کوڑے سے پٹوایا تو یہ ان کا جرم ہے، شرم کی بات ہے لیکن ان ہی دنوں جب فیض آباد کی بیگمات نے اپنے ملک کو تباہی سے بچانے کے لیے تم لوگوں کے قبضہ میں دینے سے انکار کر دیا تو اس جرم کی پاداش میں تمھارے گورنر ہیسٹنگز نے ان بیگمات کو جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان پر مظالم ڈھائے اور حرم کے خواجہ خادموں کو کوڑے سے پٹوایا تو گویا تم نے اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دیا؟

برتھ ویٹ: Shahjada !

ٹیپو سلطان: میں حیران ہوں کہ جس کا کردار خود داغدار ہو اس کی یہ جرأت کہ وہ سلطان حیدر علی کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کرے! میرے سامنے کھڑے ہوتے اعتراض کرتے ہوئے تمھیں ذرا بھی خوف نہیں آیا؟

برتھ ویٹ: No, we are English men ہم لوگ خوف کس کو بولتا ناہیں جانتا۔

ٹیپو سلطان: ہاں، ہاں! کیوں نہیں، وہ تو ہے ہی۔ جو لوگ سلطان حیدر علی اور فتح علی ٹیپو کا نام سن کر ندی کے پانی میں گولہ بارود اور بندوقیں پھینک کر بھاگ کھڑے ہوں، وہ بھلا خوف کا نام کیا جانیں۔

برتھ ویٹ: Shahjada !

ٹیپو سلطان: سید غفار! اس کو سرنگا پٹم بھیج دو۔

برتھ ویٹ: To Sringa Pattan ?

ٹیپو سلطان:۔ میں دیکھتا ہوں، جنگ میں شکست کھانے کے بعد بھی اب تک تمہاری اکڑ نہیں گئی ہے، اب جاؤ سرنگاپٹم کے نہ خانے میں بیٹھ کر اپنی بہادری اور اپنے تہذیبی کارنامے بیان کرتے رہنا، جاؤ۔

(سید غفار کے ساتھ برتھ وہیٹ خیمے سے باہر چلا جاتا ہے۔

ان دونوں کے جانے کے بعد خیمے کے باہر سے آواز آتی ہے)

آواز :۔ شہزادہ ٹیپو! شہزادہ ٹیپو سلطان!

ٹیپو سلطان:۔ (چونک کر) کون! کون بول رہا ہے؟

(دیوان پورنیہ خیمے میں داخل ہوتا ہے)

او، تم ہو دیوان پورنیہ!

پورنیہ :۔ ہاں شہزادہ، میں ہی ہوں۔ سلطان حیدر علی خان بہادر۔۔۔۔۔۔

ٹیپو سلطان:۔ چپ کیوں ہو گئے، کیا ہوا؟ حیدر علی خان بہادر۔۔۔۔۔۔

پورنیہ :۔ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

ٹیپو سلطان:۔ (پریشان ہو کر) نہیں ہیں؟ سلطان حیدر علی خان بہادر اس دنیا میں نہیں ہیں۔ (روہانسی آواز میں) ابا حضور اس دنیا میں نہیں ہیں۔

پورنیہ :۔ یہ موقع سوگ منانے کا نہیں ہے شہزادہ سلطان! سوگ منانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ آپ فوراً سرنگاپٹم روانہ ہو جائیں۔

ٹیپو سلطان:۔ لیکن میں اس سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ابا حضور کی موت کس طرح واقع ہوئی، کون سی چیز ان کی جان لینے کا باعث ہوئی؟

پورنیہ :۔ مرہٹوں کی غداری ان کی موت کا باعث ہے شہزادے!

ٹیپو سلطان:۔ مرہٹوں کی غداری!

پورنیہ :۔ پیشوا کی طرف سے نانا فرنویس نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا ہے۔ یہ خبر جب سلطان کو معلوم ہوئی۔۔۔۔۔۔

ٹیپو سلطان:۔ (بات کاٹ کر) نانا فرنویس؟ نانا فرنویس؟ دیوان پورنیہ! سید غفار! تم میں سے کون ہے جو اس مرہٹہ برہمن کو ایک بار میرے پاس پکڑ کر لا سکے؟

(نانا فرنویس خیمے میں داخل ہوتا ہے)

نانا فرنویس:۔ نانا فرنویس کو پکڑ کر لانے کی ضرورت نہیں ہے سلطان! وہ خود ہی حاضر ہو گیا ہے۔

ٹیپو سلطان:۔ نانا فرنویس! غدار مرہٹہ! جب میں نے جنگ سے قبل تمہیں انگریز کے ساتھ معاہدہ کر لینے کو کہا تھا تو تم نے میری تجویز ماننے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ تم کو معلوم تھا کہ دشمن کے روپ میں آ کر تم حیدر علی کے سینے میں چھرا نہیں گھونپ سکتے یہ طاقت نہ تمہارے اندر تھی اور نہ ہی انگریز کے اندر۔ تم جانتے تھے کہ تلوار سے انھیں قتل نہیں کر سکتے، اسی لیے

تم دوست کی شکل میں آئے تھے تاکہ ان کے دل کو صدمہ پہنچا کر ان کی جان لے سکو۔ فریبی، دھوکہ باز مرہٹے! تیار ہو جاؤ جو ضرب تم نے لگائی ہے اس کی سزا پانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

نانا فرنویس :۔ میں تیار ہو کر آیا ہوں سلطان! میں تیار ہو کر آیا ہوں تاکہ اپنے کیے کی سزا پا سکوں۔ پیشوا کی نمائندگی سے استعفیٰ دے کر، عزیز و اقارب کو چھوڑ کر، اپنی جنم بھومی مہاراشٹر کو تیاگ کر اس دور دراز مقام پر مالوہ میں اسی لیے تو دوڑا ہوا آپ کے پاس آیا ہوں، تاکہ میں اس ضرب کے بدلے ضرب قبول کر سکوں۔ وعدہ خلاف برہمن کے اس ننگے جسم پر کوڑے برسا کر لہولہان کر ڈالیے۔ اس کے کھلے ہوئے سینے میں اپنے تیز کرپان کی نوک گھونپ دیجئے۔ آپ کیا سوچنے لگے؟ میرے جسم پر ضرب لگائیے سلطان!

ٹیپو سلطان :۔ ضرب لگاؤں؟ نہیں۔ حیدر علی کے لڑکے کا انتقام اتنا معمولی نہیں ہو سکتا برہمن! اس کا انتقام یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے والد کی جان لینے والے دشمن کی آنکھوں سے نکلے ہوئے پچھتاوے کے آنسو سے اس کا بھیگا ہوا سینہ دیکھ کر اسے بھائی کی طرح گلے لگا لیا جائے۔

نانا فرنویس :۔ سلطان! آپ عظیم انسان ہیں سلطان!

ٹیپو سلطان :۔ جاؤ برہمن! مہاراشٹر لوٹ جاؤ، مہاراشٹر کے ہر شہر، ہر گاؤں میں نیند کے ماتے لوگوں کو بیدار کرو۔ ایک ایک مرہٹے کے پاس جاؤ اور اس سے رو رو کر، گڑگڑا کر کہو کہ خواہ ٹیپو سلطان ہو، پیشوا ہو یا جو کوئی بھی ہندو یا مسلمان ہو، جنھیں وہ ہندستان کا نجات دہندہ تسلیم کریں، اس کے جھنڈے کے نیچے آ کر بغیر کسی تاخیر کے جمع ہو جائیں! جاؤ، انھیں سمجھاؤ، انھیں سمجھا کر کہو کہ اس تاریک اور مصیبت کی گھڑی میں وہ لوگ یہ بات ہرگز نہ بھولیں کہ یہ ملک انگریزوں کا نہیں ہے، فرانسیسیوں کا نہیں ہے، ولندیزیوں کا نہیں ہے، پرتگالیوں کا نہیں ہے۔ ہندستان صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے، ہندستانیوں کا ہے اور ہم ہندو مسلمان ایک ہی دھرتی ماتا کی دو اولادیں ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

(ڈراپ سین)

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

نظام حیدر آباد کا رنگ محل، سامنے گدی پر نظام اور جیونشاک بیٹھے ہوئے ہیں اور رقاصائیں ناچتی ہوئی گا رہی ہیں۔

چھیل چھبیلا آیا ہے اک پیت نگر میں سانجھ سکارے

اُجلی رنگت، سندر مکھڑا، نینوں میں مدہک کی جوتی

لعل ہیں اس کے مدھر رسیلے مسکاہٹ تو جھلکا موتی

جس گوری کو پیار سے دیکھے، اس پر اپنا تن من وارے
چھیل چھبیلا آیا ہے اک بیت نگر میں سانجھ سکارے

من ہے اس کا سندر، کومل، چال سے جیسے مستی چھلکے
تیز چھری کی دھار کے جیسا ان کا انگ سجیلا جھلکے

کتنوں کو جیون دیتا ہے، کتنوں کو وہ پیار سے مارے
چھیل چھبیلا آیا ہے اک بیت نگر میں سانجھ سکارے

گھوم رہا ہے گلی گلی میں آج لٹیرا وہ دل والا
آج نہ جانے کس کے جلتے روپ کو لوٹے گا متوالا

آج بھی کوئی البیلی نکلے گی گھر سے روپ سنوارے
چھیل چھبیلا آیا ہے اک بیت نگر میں سانجھ سکارے

(مترجم)

(گانا ختم ہونے کے بعد رقاصائیں کورنش بجا لاتی
ہیں اور پھر ایک طرف بیٹھ جاتی ہیں)

نظام :- کہو گانے میں کچھ مزہ آیا جیونشنگ؟

جیونشنگ :- جی ہاں! بڑی مزے دار مٹھائی تھی۔

نظام :- تم نے میرے یہاں کی مٹھائی کھالی؟ تم تو ہندو برہمن ہو، اس سے تمہارا دھرم نشٹ نہیں ہوا؟

جیونشنگ :- جی نہیں، بلکہ خوبصورت چہرے کی رس بھری مٹھائی کھا کر میرا رتبہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔

نظام :- میں سمجھتا ہوں لال صاحب بڑا ہی غیر دلچسپ آدمی ہے ورنہ تمہارے جیسے دلچسپ آدمی کو چھوڑ کر کریم شاہ کو سرنگا پٹم میں قید کر کے نہ رکھتا۔

جیونشنگ :- نہیں، نہیں، وہ تو کریم شاہ سے بھی زیادہ مجھ سے پیار کرتے تھے لیکن وہ بے چارے کرتے تو کیا کرتے - میں میش راشی جو ہوں یعنی بھیڑی کی ذات ہوں۔

نظام :- (حیرت سے) بھیڑی کی ذات؟

جیونشنگ :- جی ہاں! انھوں نے کہا سرنگا پٹم شیروں کا ملک ہے، ایسی حالت میں بھیڑی کی ذات کے لوگوں کو وہاں رہنے دینا خطرہ سے خالی نہیں تھا، اسی لیے انھوں نے مجھے انگریزوں کے خیمے میں چلے جانے کا حکم دے کر چھوڑ دیا۔

نظام :- تو پھر تم انگریزوں کے خیمے میں کیوں نہ گئے؟

جیونشنگ :- کیسے جاتا؟ آپ ہی بتلائیے انگریز بھی اپنے کو برطانیہ کا شیر کہتے ہیں اور بھیڑی غریب کے لیے شیر ہو یا چیتا دونوں ہی برابر ہیں، اسی لیے مارے خوف کے حضور کے پاس بھاگ آیا ہوں۔

نظام :- میرے پاس نہیں ڈر نہیں لگتا ؟

جیونشنک :- نہیں، آپ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، آپ تو کنیا راشی ہیں۔

نظام :- کنیا راشی ؟ کیا مطلب !

جیونشنک :- آپ کنیا راشی نہیں سمجھتے ؟ کنیا راشی اس آدمی کو کہتے ہیں جسے رات دن بے شمار لڑکیاں ہر وقت گھیرے رہتی ہیں۔

نظام :- (مسکراتا ہے) اچھا، اچھا، اب سمجھا، کنیا بمعنی لڑکی لیکن راشی کس کو کہتے ہیں ؟

جیونشنک :- راشی کے معنی ہیں بے شمار، چونکہ آپ اکیلے بے شمار لڑکیوں کے محبوب ہیں اس لیے آپ اکیلے بے شمار لڑکیوں کے برابر ہیں۔

نظام :- اور تم نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ تم میش راشی ہو، اس کے کیا معنی ہوتے ؟

جیونشنک :- یعنی میں اکیلا بے شمار بھیڑوں کے برابر ہوں۔

نظام :- اچھا ! کیا تم بتا سکتے ہو کریم شاہ کون راشی ہیں ؟

جیونشنک :- وہ ...... وہ .....

نظام :- ہاں ! ہاں ! بتاؤ !

جیونشنک :- کریم شاہ بی بھیشن راشی ہیں۔

نظام :- بی بھیشن کے معنی میری سمجھ میں نہیں آئے۔

جیونشنک :- بی بھیشن کے معنی آپ نہیں سمجھے ؟ وہ.......

نظام :- ٹھہرو ! اس قسم کی سیاسی باتیں ان رقاصاؤں کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔

(رقاصاؤں کو اشارے سے چلے جانے کا حکم دیتا

ہے اور وہ سب باہر چلی جاتی ہیں)

ہاں ! اب تم مجھے بی بھیشن کے معنی بتاؤ۔

جیونشنک :- بی بھیشن نے اکیلے رام چندر کا ساتھ دیا تھا اور کریم شاہ سرنگا پٹم سے بھاگ کر حضور کا ساتھ دینا چاہتے ہیں، مرہٹے اور انگریزوں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اس لیے وہ اکیلے ہی بی بھیشن راشی یعنی اکیلے ہی بے شمار بی بھیشن ہیں۔

نظام :- ہوں ! لیکن تمہارے بی بھیشن جیل سے بھاگ کر ہمارا ساتھ دینے کب آرہے ہیں ؟

جیونشنک :- آپ کیوں فکر کرتے ہیں نظام بہادر ! وہ ایک نہ ایک دن ضرور بھاگ کر آئیں گے۔

نظام :- خیر ! کریم شاہ نہیں بھی آئے تو کوئی حرج نہیں، سپہ سالار تہور جنگ اور مرہٹہ ہری پنتھ ٹراونکور کے راستے ٹیپو سلطان کی فوج پر حملہ کر کے انھیں تباہ و برباد کرنے کے لیے جا چکے ہیں۔ نظام شاہی اور مرہٹوں کی متحدہ فوجیں ایک طرف ہیں اور زبردست انگریز دوسری طرف ! تم زائچہ کھینچ کر بتاؤ تو سہی اس مرتبہ شکست ہو گی یا فتح ؟

جیونشنک :- مرہٹہ، نظام شاہی اور انگریز، ان تینوں شکتی ہیں جب ایکا ہو چکا ہے تو پھر زائچہ کھینچ کر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے ؟

فتح تو یقینی ہے۔

نظام :۔ کس کی ؟ ہماری یا ٹیپو کی ؟

جیونشنگ :۔ یہ سوال کرکے آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ یہ بات تو اٹل ہے کہ دونوں میں سے ایک کی فتح یقینی ہے۔

نظام :۔ اس وقت مذاق رہنے دو۔ جاؤ، اچھی طرح زائچہ بنا کر لے آؤ۔

(جیونشنگ اٹھ کر جانے لگتا ہے)

سنو جیونشنگ! اس مرتبہ اگر تمھارا زائچہ غلط ہوا تو پھر تمھیں پریوں کے ملک سے شہروں کے ملک میں بھیج دیا جائے گا۔

جیونشنگ :۔ سرنگاپٹم! ارے باپ رے۔ اچھی بات ہے، اب کے میں صحیح زائچہ بنا کر ہی لاؤں گا۔

(جیونشنگ چلا جاتا ہے، اس کے جانے کے بعد

ایک پہرے دار آتا ہے)

پہریدار :۔ مرہٹہ ہری پنتھ شرف باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔

نظام :۔ ہری پنتھ! آنے دو۔

(پہرے دار چلا جاتا ہے)

ہری پنتھ اتنی جلد واپس آگیا، تو کیا جنگ میں فتح ....

(ہری پنتھ آتا ہے)

ہری پنتھ :۔ فتح کرکے نہیں، شکست کھا کر آیا ہوں۔

نظام :۔ (چہرہ فق ہو جاتا ہے) شکست کھا کر؟ بے شرم بزدل مرہٹہ!

ہری پنتھ :۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھئے نظام علی خاں! مرہٹہ سپہ سالار ہری پنتھ آپ کا ماتحت یا ملازم نہیں ہے، اس کی شان اور اس کے مرتبہ کا خیال رکھتے ہوئے بات کیجئے۔ ہم لوگ بے شرم اور بزدل ہیں؟ (غصہ سے چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے) جیسے آپ کی نظام شاہی فوج نے بڑی بہادری دکھائی ہے۔

نظام :۔ جس وقت نظام شاہی فوج کے ساتھ سپہ سالار تہور جنگ ایک فاتح کی حیثیت سے حیدرآباد لوٹ کر آئے گا، اس وقت تمھارے اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا ہری پنتھ!

(پہریدار پھر آتا ہے)

پہریدار :۔ سپہ سالار تہور جنگ بہادر اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

نظام :۔ (خوش ہو کر) تہور جنگ! وہ فاتح سپہ سالار واپس آگیا؟ آنے دو۔

(پہریدار چلا جاتا ہے اور تہور جنگ داخل ہوتا ہے)

تہور جنگ :۔ جنگ میں ہم لوگوں کو شکست ہوگئی شہنشاہ! (سر جھکا لیتا ہے) اور ہمارے نصف سپاہی جنگ میں کام آگئے۔

نظام :۔ (چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے) کیا؟

تہور جنگ :- ساور انور، دھارلوال اور آدونی کے قلعے پر بھی ان لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

نظام :- (چیخ کر) تہور جنگ!

تہور جنگ :- آپ خفا نہ ہوں اعلیٰ حضرت! اس میں ہماری کوئی خطا نہیں۔ ٹیپو سلطان کی فوجی تنظیم دیکھ کر میں خود حیران ہو گیا ہوں۔ ان کے اندر اتنی یکجہتی ہے کہ نظام شاہی فوج زیادہ دیر تک ان کے مقابل کھڑی نہ رہ سکی اور مجبوراً مجھے شکست کی بدنامی کا داغ لے کر بھاگ آنا پڑا۔

نظام :- ہوں! (کچھ سوچتا ہے) اچھی بات ہے، اس وقت جا کر تم آرام کرو۔

(تہور جنگ چلا جاتا ہے)

ہری پنتھ!

ہری پنتھ :- اب مجھ سے اور کیا کہنا چاہتے ہیں نظام علی خان! ہم لوگ تو بے شرم اور بزدل مرہٹے ہیں اسی لیے شکست کھا کر بھاگ آئے ہیں لیکن آپ کی طاقتور نظام شاہی فوج کو لے کر تہور جنگ نے میسور کے کن کن صوبوں پر قبضہ کیا ہے۔ انھیں بلا کر پوچھ تو لیجئے۔

نظام :- خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہری پنتھ! میں اپنی سخت کلامی پر واقعی شرمندہ ہوں۔

ہری پنتھ :- نظام علی خان!

نظام :- سنو ہری پنتھ! اگر ابھی سے ہم لوگ ہشیار نہ ہوئے تو میرا یہ حیدرآباد اور تمھارا مہاراشٹر ٹیپو سلطان کے مظالم کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جائے گا۔

ہری پنتھ :- میں سب سمجھتا ہوں نظام علی خان! لیکن ہشیار ہو کر بھی ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں، بتائیے! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ٹیپو سلطان کو شکست دینا ناممکن ہے۔

(جیونشک داخل ہوتا ہے)

جیونشک :- ٹیپو سلطان ہار گیا، ٹیپو سلطان لڑائی میں ہار گیا۔

نظام :- ٹیپو ہار گیا؟

جیونشک :- جی ہاں! اور ہم لوگ جیت گئے۔

نظام :- (حیرت سے) جیت گئے؟ کہاں؟ کب؟

جیونشک :- ابھی اور یہاں حضورِ عالی!

نظام :- مذاق مت کرو جیونشک!

جیونشک :- میں مذاق نہیں کر رہا ہوں نظام بہادر! اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں، اپنی جیت کا جھنڈا دیکھنا چاہتے ہیں آپ؟ ابھی لے کر آ رہا ہوں۔

(جیونشک چلا جاتا ہے اور چند لمحوں کے بعد کریم شاہ کے ساتھ آتا ہے)

یہ دیکھیے۔ یہ رہا آپ کی فتح کا جھنڈا۔

نظام :۔ (حیرت سے) یہ کیا، شہزادہ کریم شاہ! آپ خلافِ توقع یہاں؟

کریم شاہ :۔ ہاں! میں سرنگاپٹم کے جیل خانے سے بھاگ کر آیا ہوں، اسی لیے آپ مجھے خلافِ توقع یہاں دیکھ رہے ہیں نظام علی خان!

ہری پنتھ :۔ لیکن آپ بھاگے کس طرح؟

کریم شاہ :۔ پشاوری بیگم کی مہربانی سے!

ہری پنتھ :۔ سلطان کی پشاوری بیگم؟

کریم شاہ :۔ ہاں! انھوں نے ہی مجھ پر رحم کھا کر چند محافظوں کے ساتھ مجھے نظام علی خان کی ریاست کی سرحد تک پہنچوا دیا ہے، ورنہ ٹیپو سلطان نے اتنا سخت پہرہ بٹھا دیا تھا کہ وہاں ایک قدم بھی آگے بڑھنا کسی زندہ آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔

نظام :۔ شہزادہ کریم شاہ!

کریم شاہ :۔ میں آپ کے پاس کس مقصد سے آیا ہوں، آپ جانتے ہیں نظام علی خاں؟

نظام :۔ وہ کیا؟

کریم شاہ :۔ میں ٹیپو سلطان کی تباہی کے لیے آپ کی ہر ممکن مدد کرنے آیا ہوں۔

ہری پنتھ :۔ شہزادہ کریم شاہ!

کریم شاہ :۔ آپ میرا یقین کیجیے، مجھ پر بھروسہ رکھیے ہری پنتھ جی! میرے اندر ابھی اتنی طاقت موجود ہے

نظام :۔ لیکن آج وہ طاقت نظام اور مرہٹہ کی متحدہ فوجوں میں بھی نہیں ہے۔

کریم شاہ :۔ طاقت ضرور ہے مگر حوصلہ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنوبی اور مغربی ہندوستان میں آپ لوگ دن بدن ٹیپو سلطان کے ساتھ جنگ کر کے مایوس ہو چکے ہیں۔

نظام :۔ صرف ہم لوگ ہی مایوس نہیں ہوئے ہیں کریم شاہ! ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کرنے کے لیے اتنی زیادہ فوجیں اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی تمام ریاستوں کی فوجوں کو ملا کر بھی اتنی تعداد پوری نہیں کر سکتے، اب تو انگریز بھی مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔

کریم شاہ :۔ انگریزوں کی مایوسی ختم ہو سکتی ہے اگر۔۔۔ ۔۔۔

نظام :۔ اگر؟

کریم شاہ :۔ اگر آپ لوگ سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔

ہری پنتھ :۔ کیسا سنہری موقع؟

کریم شاہ :۔ اس وقت سلطان ٹیپو سرنگاپٹم سے بہت دور بڑا و تکور میں ہے۔ اس کی فوج بھی جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقے فتح کرنے میں مصروف ہے، اگر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریز، مرہٹہ اور نظام شاہی فوج اس کے دارالحکومت سرنگاپٹم

پر اپنی پوری طاقت سے حملہ کر دے تو پھر فتح یقینی ہے۔

نظام :- کریم شاہ!

کریم شاہ :- میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں، سرنگا پٹم اس وقت بالکل غیر محفوظ ہے، اس کے علاوہ سرنگا پٹم کا ہر راستہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں سرنگا پٹم فتح کرنے کے لیے آپ کی ہر مدد کرنے کو تیار رہوں۔

نظام :- اگر ایسا ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سرنگا پٹم کے تخت پر آپ ہی کو بٹھاؤں گا، کیوں ہری پنتھ؟

ہری پنتھ :- ضرور، ضرور! سرنگا پٹم کے تخت پر بیٹھنے کی خواہش ہم میں سے کسی کو بھی نہیں ہے کریم شاہ! ہم صرف ٹیپو سلطان کی تباہی چاہتے ہیں۔

کریم شاہ :- آپ بے فکر رہیں، اگر آپ لوگوں نے میرے مشورے پر عمل کیا تو ٹیپو کی تباہی یقینی ہے۔

جیونشنک :- جے ہو! بی بھیشن کی جے ہو!

کریم شاہ :- بی بھیشن کیا؟

جیونشنک :- بتانے کی ضرورت نہیں (نظام سے مخاطب ہو کر) نظام علی خاں بہادر! جب لنکا کی تقسیم ہو چکی نواب.....

کریم شاہ :- نواب کیا؟

نظام :- ہاں، ہاں کہو، نواب؟

جیونشنک :- اس مرتبہ میں بڑی ترشی تھی اس لیے اب مٹا تو منہ جا، یعنی بی بھیشن جی کو مٹھائی کھلائیے۔

نظام :- (جیونشنک کی طرف دیکھ کر) او، سمجھا! تم ٹھیک کہتے ہو جیونشنک (قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا ہا!

(کریم شاہ کے ساتھ نظام پھر گدی پر بیٹھ جاتا ہے، ہری پنتھ اور جیونشنک بھی ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں، نظام تالی بجاتا ہے۔ تالی کی آواز سن کر ایک غلام آتا ہے اور سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

رقاصہ!

(غلام چلا جاتا ہے، تھوڑی دیر بعد ایک نوعمر رقاصہ آتی ہے اور رقص کرتے ہوئے گاتی ہے)

آج مجھے بانہوں میں لے لے

کوئل کوکی، ساون آیا
مجھ کو ساون کبھی نہ بھایا

کاری بدری آئی برسی!
جگ جگ تیرے پیار کو ترسی
میں نے جیون بھر دکھ جھیلے
آج مجھے بانہوں میں لے لے

پیار کا سندر گیت سُنا جا — آج مرے آنگن میں آ کے
بے کل من کو دھیر بندھا جا — انگ کی ہیرے سہاس جگا کے
کب تک کوئی آس سے کھیلے
آج مجھے باہنوں میں لے لے

نیل گگن پر چمکے تارا — میرے من میں بیٹھا جوتی
سپنے جب دیکھے جگ سارا — میرے نین لٹا ئیں موتی
میں ہوں اور رہیں دکھ کے میلے
آج مجھے باہنوں میں لے لے

(مترجم)

(رقاصہ ناچتی ہوئی آتی ہے اور نظام کے قریب بیٹھ کر اپنے
جسم کو لہرا کر نظام کے اوپر گر پڑتی ہے اور نظام اسے
اپنے بازوؤں میں تھام لیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دُوسرا منظر

سرنگا پٹم میں شاہی محل کا برآمدہ، رونی بیگم برآمدہ پر کھڑی ہے
اتنے میں دیوان پورنیہ آتا ہے اور ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے

پورنیہ:۔ کیا حکم ہے بیگم صاحبہ؟

رونی بیگم:۔ آپ آ گئے دیوان پورنیہ!

پورنیہ:۔ آپ نے مجھے کس لیے یاد فرمایا ہے بیگم صاحبہ؟

رونی بیگم:۔ میں نے سُنا ہے انگریز سرنگا پٹم پر حملہ کرنے آ رہے ہیں؟

پورنیہ:۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کی فوج سرنگا پٹم کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ سرنگا پٹم پر حملہ کرنے کی ہمت کرے گی کیونکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ سرنگا پٹم کا قلعہ ہندستان کی بڑی سے بڑی طاقت بھی فتح نہیں کر سکتی۔

رونی بیگم:۔ کیا یہ حقیقت ہے؟

پورنیہ:۔ بیگم صاحبہ!

رونی بیگم:۔ چالیس ہزار فوج لے کر سلطان ٹراونکور جا چکے ہیں، اور ان گنت فوجوں کے ساتھ سپہ سالار سید غفار اور ربان الدین

بھی دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے میں مصروف ہیں، صرف ایک فرانسیسی سپہ سالار موسیولالی اور اس کی ماتحت افواج سرنگا پٹم کی حفاظت کے لیے رہ گئی ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں انگریز، مرہٹہ اور نظام شاہی فوجوں کے مقابلہ میں یہ فوجیں کافی ہیں؟ کیا آپ پھر بھی کہہ سکتے ہیں دیوان پورنیہ کہ سرنگا پٹم کسی خطرہ سے دو چار نہیں ہے؟

پورنیہ :- انھیں کیا معلوم ہے بیگم صاحبہ کہ ہمارے قلعہ کے اندر کتنی فوجیں ہیں؟

روشنی بیگم :- اگر کوئی غدار یہ خبر ان تک پہنچا دے؟

پورنیہ :- کوئی بھی اتنی بڑی غداری کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا بیگم صاحبہ! صرف ایک ہی آدمی ایسا ہے جو مشکوک ہے لیکن وہ...... وہ تو قید خانے میں ہے۔

روشنی بیگم :- قید خانے میں ہے؟ کون ہے وہ؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟ کون ہے وہ غدار؟

پورنیہ :- ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے بیگم صاحبہ! اگر اس کی عقل پر پردہ بھی پڑ گیا تو بھی وہ ایسے قید خانے میں ہے جہاں سے اس کا نکلنا محال ہے۔

(قاصد آتا ہے اور دیوان پورنیہ کے قریب مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے)

کیا خبر لائے ہو؟

قاصد :- محمد درویش خاں نے آپ کے نام یہ خط بھیجا ہے۔

(قاصد ایک خط دیوان پورنیہ کی طرف بڑھا دیتا ہے پورنیہ خط لے کر پڑھتا ہے)

روشنی بیگم :- درویش خاں! مجھے ایسا جان پڑتا ہے جیسے یہ نام میں سلطان کی زبان سے بھی سن چکی ہوں۔ (سوچتے ہوئے) درویش خاں!

پورنیہ :- (خط پڑھتے ہوئے قاصد سے) ان سے کہو میں آ رہا ہوں۔

(قاصد چلا جاتا ہے)

روشنی بیگم :- یہ درویش خاں کون ہے دیوان پورنیہ؟

پورنیہ :- ہمارا قاصد جسے فرانس بھیجا گیا تھا۔

روشنی بیگم :- اچھا ــــ! وہ ہیں؟

پورنیہ :- ہاں! محمد درویش خاں، موزیر اکبر علی خاں اور ذی ہوش عثمان علی خاں کو سلطان نے فرانس کے دارالسلطنت پیرس میں فرانس کے بادشاہ لوئس شانزدہم کے پاس بھیجا تھا تا کہ ہندستان سے انگریزوں کا اقتدار ختم کرنے میں فرانس ہمارا ساتھ دے، اسی امید کے ساتھ ان قاصدوں کو بھیجا گیا تھا، وہی تینوں پیرس سے سرنگا پٹم واپس آ گئے ہیں۔

روشنی بیگم :- کیا فرانس ہم لوگوں کا ساتھ دے گا؟

پورنیہ :۔ اس کے متعلق انھوں نے اس خط میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے، ملاقات ہونے پر بتائیں گے۔ میں جا رہا ہوں، ذرا ان سے مل کر حالات معلوم کروں۔

(دیوان پورنیہ چلا جاتا ہے اور کوٹ پتلون پہنے ہوئے ٹائی باندھے ہوئے عبدالخالق اور معاذالدین آتے ہیں)

معاذالدین :۔ امی!

روشنی بیگم :۔ کون؟ (حیرت سے دیکھ کر) یہ کیا؟

عبدالخالق :۔ آپ بھی نہ پہچان سکیں امی! (معاذالدین سے) کیوں معاذالدین! میں نے کیا کہا تھا؟ کہا تھا نا کہ اس لباس میں دیکھ کر امی بھی ہمیں نہ پہچان سکیں گی۔

روشنی بیگم :۔ عبدالخالق!

عبدالخالق : No, Mammy rather say Mr. Abdul Khaliq or Prince Abdul Khaliq

روشنی بیگم :۔ تم کیا بک رہے ہو عبدالخالق!

عبدالخالق :۔ آپ دیکھتی نہیں ہیں ہم لوگ انگریز بنے ہوئے ہیں، ہم سے انگریزی میں باتیں کیجئے۔

معاذالدین :۔ آپ کو ذرا بھی عقل نہیں ہے بھائی جان! امی انگریزی جانتی ہیں جو آپ سے انگریزی میں باتیں کریں گی؟

عبدالخالق :۔ ارے ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو، تب تو امی کے لیے آج ہی ایک First Book کتاب خریدنی ہوگی۔ (روشنی بیگم سے) آپ کچھ خیال نہ کریں امی! میں آپ کو انگریزی پڑھا دوں گا۔ I am a very good private tutor ! آپ مجھے کیا تنخواہ دیں گی؟

روشنی بیگم :۔ (حیرت سے) تنخواہ؟

عبدالخالق :۔ جی ہاں تنخواہ! لیکن سوچتا ہوں میں آپ سے کیا تنخواہ لوں؟

معاذالدین :۔ صرف ہم دونوں کو گلے سے لگا کر پیار کر لیجئے، بس، ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔

روشنی بیگم :۔ میرے بچے! میرے پیارے بچے!

(دونوں ہاتھ بڑھا کر معاذالدین اور عبدالخالق کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے، اتنے میں ٹیپو سلطان آتا ہے)

ٹیپو سلطان :۔ بہت خوب پشاوری بیگم! تم نے تو بچوں کو خالص فرنگی بنا دیا ہے، اس لباس میں اپنے بچوں کو دیکھ کر تمہیں فخر اور خوشی محسوس ہو رہی ہے نا پشاوری بیگم!

روشنی بیگم :۔ جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان :۔ عبدالخالق! معاذالدین! ادھر آؤ۔

(دونوں خوفزدہ ہو کر ٹیپو کو دیکھنے لگتے ہیں)

میں کہتا ہوں میرے قریب آؤ

(دونوں ٹیپو سلطان کے قریب جاتے ہیں)

تمھیں یہ پوشاک کس نے پہنائی ہے؟

عبدالخالق: قید خانے میں جو انگریز قید ہے کپتان چیرس، اسی نے۔

ٹیپو سلطان:- ہوں! تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ پشاوری بیگم نے ان دنوں اپنے بچوں کو قیدیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی کھلی آزادی دے رکھی ہے؟

روفی بیگم:- صاحب ان لوگوں سے بہت پیار کرتا ہے، اسی لیے ......

ٹیپو سلطان:- (بات کاٹ کر) پیار کرتا ہے، صاحب ان لوگوں سے پیار کرتا ہے ——— اگر تمھارے بچوں کو دیکھ کر شدتِ پیار سے بے تاب ہو کر کوئی سانپ پھن اٹھا کر ناچنے لگے تو کیا تم اپنے بچوں کو پھن اٹھاتے ہوئے اس سانپ سے کھیلنے کی اجازت دے دوگی؟

روفی بیگم:- اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان:- کپتان چیرس کی اتنی جرأت؟ میری قید میں رہ کر میرے ہی بچوں کے عادات و اطوار خراب کر کے انھیں انگریزوں کا سلام بنانا چاہتا ہے۔ میں ابھی چیرس کی مزاج پرسی کرتا ہوں۔

(ٹیپو سلطان جانے لگتا ہے)

عبدالخالق:- اس میں صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے ابا حضور! ہم دونوں خود ہی یہ لباس پہننا چاہتے تھے۔

ٹیپو سلطان:- تم خود یہ لباس پہننا چاہتے تھے، کیوں؟ کیا تم انگریز کے بچے ہو یا انگریز کے تنخواہ دار ملازم ہو جو انگریزوں کا لباس پہننا چاہتے تھے؟

عبدالخالق:- ہمیں اچھا معلوم ہوتا تھا اسی لیے......

ٹیپو سلطان:- اچھا معلوم ہوا تھا؟

عبدالحق:- تو کیا یہ دیکھنے میں اچھا معلوم نہیں ہوتا ابا حضور؟

ٹیپو سلطان:- ہاں! اچھا معلوم ہوتا ہے۔

عبدالخالق:- پھر آپ کیوں خفا ہوتے ہیں؟

ٹیپو سلطان:- میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا لیکن ہاں! آئندہ تم ہندوؤں کی یہ کہاوت ضرور یاد رکھو کہ غیر ملکی دیوتا سے اپنے ملک کا کتا بھی زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

عبدالخالق:- ابا حضور!

ٹیپو سلطان:- مور کی دم کوّے کو اچھی نہیں معلوم ہوتی، جاؤ اور اس لباس کو اتار پھینکو۔ آئندہ اگر کبھی میں نے تمھیں اس لباس میں دیکھا تو یاد رکھو کہ نہ یہ لباس باقی رہے گا اور نہ تمھاری پیٹھ کی کھال! جاؤ میرے سامنے سے چلے جاؤ۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

پشاوری بیگم!

رونی بیگم :- جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان :- کریم شاہ کہاں ہے پشاوری بیگم؟

رونی بیگم :- میں کیا جانوں وہ کہاں ہے؟

ٹیپو سلطان :- تم نے خود ہی اسے قید خانے سے رہا کر دیا اور تم ہی نہیں جانتیں کہ وہ کہاں ہے؟

رونی بیگم :- (پریشان ہوکر) میں نے اسے رہا کر دیا ہے؟ یہ آپ سے کس نے کہا؟

ٹیپو سلطان :- اگر تم اسے رہا نہ کرتیں تو زندہ انسانوں کی تو خیر کیا مجال تھی آسمان سے فرشتے بھی آکر اسے اس اندھے تہ خانے سے آزاد نہیں کرا سکتے تھے۔

رونی بیگم :- (پشیمان ہوکر) آپ خفا نہ ہوں اعلیٰ حضرت! میں مجبور تھی، مجھ سے کریم شاہ کی مسلسل گریہ وزاری دیکھی نہ گئی، میری جگہ اگر کوئی پتھر بھی ہوتا تو وہ بھی اس کی فریاد سن کر پگھل جاتا، میں پھر بھی ایک انسان ہوں، مجھ سے اس کی آہ و بکا سُنی نہ گئی۔ میں نے بے چین ہوکر اس پر ترس کھا کر اسے ......

ٹیپو سلطان :- (بات کاٹ کر) ترس کھا کر اسے رہا کر دیا! لیکن تمھاری اسی مہربانی کے سمندر میں یکایک اتنے زور کی طغیانی آئی ہے کہ مجھے ٹراونکور کی جیتی ہوئی لڑائی ختم کرکے میسور کی حفاظت کے لیے سرنگا پٹم آنا پڑا ہے۔

رونی بیگم :- سلطانِ عالی!

ٹیپو سلطان :- کریم شاہ میرا کتنا بڑا دشمن ہے کیا تم نہیں جانتیں؟ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ وہ میرا سب سے زبردست مخالف ہے؟

رونی بیگم :- اسے دشمن نہ کہئے سلطانِ عالی! وہ آپ کا بھائی ہے، سگا بھائی ہے۔

ٹیپو سلطان :- میرا کون دشمن ہے اور کون سگا بھائی ہے، کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا؟ کیا پشاوری بیگم کو یہ بات بھی مجھے بتانی پڑے گی؟

رونی بیگم :- اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان :- میں اپنے قاتل کو بھائی کہہ کر معاف کر سکتا ہوں لیکن میں اس بھائی کو کبھی معاف نہیں کر سکتا جو میری جنم بھومی کو، مادرِ وطن کو غیر ملکیوں کے ہاتوں فروخت کر دینا چاہتا ہو۔

رونی بیگم :- اگر میں نے اسے رہا کرکے کوئی جرم کیا ہے تو آپ مجھے اس کی سزا دے سکتے ہیں جہاں پناہ! آپ مجھے سزا دیجئے میں ہر سزا خوشی کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہوں۔

ٹیپو سلطان :- سزا! نہیں رونی بیگم، میں تمھیں سزا نہیں دوں گا۔ میں تمھیں سزا نہیں دے سکتا۔ آج جبکہ اس دنیا میں میں بالکل تنہا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میرا اپنا نہیں ہے، میں بالکل اکیلا ہوں، بالکل اکیلا۔ ایسے لمحے

جب لوگوں کی فریب دہی اور وطن سے غداری کرنے کی وجہ سے میرا دل غم و غصہ کی آگ میں جلنے لگتا ہے، میں تمھارے پیار کا سہارا لے کر اپنے دل کو سمجھا لیا کرتا ہوں اس احساس کو دبا دیا کرتا ہوں، ایسے لمحوں میں تمھاری پناہ میں آ کر مجھے سکون مل جاتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں بالکل تنہا نہیں ہوں۔ مجھ سے محبت کرنے والا بھی کوئی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ تمھیں سزا دے کر میں اپنا یہ آخری سہارا، اپنی آخری پناہ گاہ کیسے ختم کر سکتا ہوں، کیسے توڑ سکتا ہوں؟ نہیں، رونی بیگم نہیں، تمھیں سزا دینا تو میری موت کے برابر ہے۔

رونی بیگم :- جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان :- رونی بیگم!

رونی بیگم :- میں آپ کے دل کی کیفیت سمجھ رہی ہوں جہاں پناہ! غیر ملکیوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہندستان کو آزاد کرانے کا جو خواب آپ نے دیکھا ہے وہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس خواب کو آپ کے ہم وطن خود ہی قدم قدم پر مسلسل ٹھوکر لگا کر چور چور کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے ہم وطنوں کے پاؤں میں غلامی کی زنجیر ڈال دینا چاہتے ہیں! یہ مصیبت کی گھڑی کیا کبھی ختم نہ ہوگی میرے مالک! ہندستانیوں کی زندگی میں جو گھنی تاریکی چھائی ہوئی ہے کیا یہ کبھی ختم نہ ہوگی؟

ٹیپو سلطان :- شاید ختم ہو جائے، مگر کب ختم ہوگی، کتنی صدیوں کے بعد ختم ہوگی، کون جانے!

رونی بیگم :- جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان :- آج بار بار مجھے صوفیہ کی وہ زہر بھری باتیں یاد آ رہی ہیں۔ حیدر علی اپنا خون دے کر، ٹیپو اپنے سینے کا خون بہا کر بھی مشرق کا آسمان سرخ نہ کر سکیں گے۔ پوری قوم کی خطاؤں، ہندو مسلمانوں کے عظیم گناہوں نے آج ہندستان کے آسمان پر اتنی گھنی، اتنی دبیز سیاہی پوت دی ہے کہ حیدر علی اور فتح علی خاں کے خون سے بھی وہ سیاہی نہ دھل سکے گی تیس کروڑ انسانوں کے گناہوں کا کفارہ تیس کروڑ انسانوں کو ہی ادا کرنا ہوگا، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے اس دنیا سے صرف ناکامی اور مایوسی کا بوجھ لے کر رخصت ہونا پڑے گا۔ درد و غم کی تصویر بن کر کوچ کرنا ہوگا۔

رونی بیگم :- بس کیجئے اعلیٰ حضرت! اس سے زیادہ میں نہیں سن سکتی۔ آپ کی زندگی کی ناکامیوں کی کہانی میں نہیں سن سکتی۔ مجھے ایسی باتوں سے خوف آتا ہے۔ خوف کے مارے میرے جسم کا خون سرد ہونے لگتا ہے!

ٹیپو سلطان :- ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے رونی بیگم، تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کس بات کا خوف؟ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر جو کچھ بھی کہا ہے وہ میری بات نہیں ہے۔ میں تو ناقابل تسخیر ہوں۔ میں ساری دنیا کے لیے ایک زبردست خطرہ ہوں۔ میرا نام ٹیپو سلطان ہے رونی بیگم!

رونی بیگم :- ہاں، میرا بھی یہ ایمان ہے کہ آپ کی قوت ناقابل تسخیر ہے، ناقابل شکست ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خواہ مرہٹے نظام آئے یا انگریز آئے کوئی بھی آپ کے مقابل کھڑا نہیں رہ سکتا۔

:- تم مجھ پر پورا پورا بھروسہ رکھو روشنی بیگم! میں انھیں متعدد بار شکست دے چکا ہوں۔ آج بھی ٹنا ڈنکور سے واپس لوٹتے ہوئے لارڈ کارنوالس کی فوج کو ایسا سبق دے کر آیا ہوں کہ لارڈ کارنوالس کو اپنے تمام آتشیں اسلحہ جات، گولہ، بارود دریا میں ڈبو دینا پڑا اور تمام باربردار گاڑیوں کو چھوڑ کر بنگلور بھاگنا پڑا۔ بھاگتے وقت وہ اتنا حواس باختہ تھا کہ بمبئی دستہ کے اٹھارہ انگریز مریضوں کو بھی ہسپتال میں چھوڑ گیا ہے۔

روشنی بیگم :- تو کیا اب سرنگاپٹم پر ان کے حملہ کا کوئی خطرہ نہیں ہے اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان :- نہیں، فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے اور اگر انھوں نے حملہ بھی کیا تو تمھیں کس بات کا خوف ہے روشنی بیگم، ٹیپو سلطان تو آج سرنگاپٹم میں موجود ہے۔

روشنی بیگم :- اچھی بات ہے ——— سنا ہے کہ قاصد فرانس سے لوٹ کر سرنگاپٹم آ گئے ہیں؟

ٹیپو سلطان :- واپس آ گئے ہیں؟ کہاں ہیں؟ مجھے تو ابھی تک کسی نے بھی نہیں بتایا۔ محمد درویش خاں نے بھی مجھ سے اب تک ملاقات نہیں کی۔

(پہرے دار آتا ہے)

پہریدار :- سپہ سالار موسیو لالی جہاں پناہ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ٹیپو سلطان :- آنے دو۔

(پہرے دار چلا جاتا ہے)

روشنی بیگم!

روشنی بیگم :- میں اندر چلی جاتی ہوں اعلیٰ حضرت!

(روشنی بیگم محل کے اندر چلی جاتی ہے، موسیو لالی آتا ہے)

ٹیپو سلطان - کیا خبر ہے موسیو لالی؟ تم اتنے بے چین کیوں ہو؟ کیا ہوا ہے؟

موسیو لالی : I have come to know from a massenger that English are coming to attack Sringa Pattan.

انگریز لوگ سرنگاپٹم پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔

ٹیپو سلطان :- اچھا! انگریزوں کی اتنی ہمت؟

موسیو لالی :- اس کا ساتھ نظام کا جنرل تہور جنگ اور مرہٹہ ہری پنتھ اور پرشو رام بھی آ رہے ہیں

With their combined artilaries and troops. Lord Cornawallis himself leading the army

کارنوالس خود اس فوج کا سپہ سالار ہیں اور اس کے ساتھ......

(کہتے کہتے رک جاتا ہے)

ٹیپو سلطان :- تم چپ کیوں ہو گئے، بتاؤ اس کے ساتھ کون ہے؟
موسیو لالی :- اس کا نام لینے میں ہم کو ڈر معلوم ہوتا سلطان اعظم!
ٹیپو سلطان :- (حیرت سے) ڈر معلوم ہوتا ہے؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو موسیو لالی! تمھیں اور جان کا خوف؟
موسیو لالی :- ہاں سلطان اعظم! ہم کو ڈر معلوم ہوتا، بہت ڈر معلوم ہوتا۔

Lely is a born soldier ! I alone can fight against twenty of my enemies. This sword may draw from the scaddard.

ہم اکیلا بیس دشمن کا سر کاٹنے سکتا ہیں، اس کو ہم کو ڈرنا ہی لگتا لیکن اس آدمی کا نام بتانے میں ہم کو بہت ڈر معلوم ہوتا سلطان جو دشمن کا ساتھ دوستی کرتا۔

And who comes to fight against his own brother !

ٹیپو سلطان :- تو کیا..... تو کیا وہ نامراد ناعاقبت اندیش کریم شاہ؟
موسیو لالی :- Yes, Sultan لارڈ کارنوالس کو سرنگاپٹم کا راستہ بتایا اور اس کا ساتھ حملہ کرنے آیا۔
ٹیپو سلطان :- ہوں ـــــ اکیلی ہے؟ رونی بیگم! رونی بیگم!........ نہیں، رہنے دو۔ اس نے دشمنوں کے خیمے میں پناہ لی تھی۔ یہ خبر مجھے معلوم تھی موسیو لالی لیکن وہ خود اپنے دشمنوں کی رہنمائی کرتا ہوا انھیں یہاں تک لے آئے گا اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا، میں اس کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔
موسیو لالی :- سلطان!
ٹیپو سلطان :- خیر اس ذکر کو ابھی رہنے دو، کیا تمھیں معلوم ہے موسیو لالی! درویش خاں کیا خبر لے کر آئے ہیں؟

(موسیو لالی سر جھکا لیتا ہے)

:- تم نے اپنا سر کیوں جھکا لیا، کیا بات ہے؟ درویش نے اب تک مجھ سے ملاقات کیوں نہیں کی؟
موسیو لالی :- اس کا ہمت نہیں ہوتا اس واسطے نہیں آیا۔
ٹیپو سلطان :- مجھ سے ملاقات کرنے کی اس کی ہمت نہیں پڑتی، بات کیا ہے لالی؟ چپ مت رہو، مجھے بتاؤ تمھارے بادشاہ نے کیا جواب دیا۔ کیا تمھارا بادشاہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہے؟
موسیو لالی :- 'I don't know what should I say ہم آپ کو کیا جواب دیں گے سلطان! ہمارا بادشاہ آپ کا کچھ بھی مدد نہیں کرنے سکتا ہیں۔
ٹیپو سلطان :- کوئی مدد نہیں کر سکتا؟
موسیو لالی :- فرانس ابھی National debt قومی قرضہ کے بھارے سے دبا ہوا ہے........ ہمارے ملک میں ابھی ہر گھر میں Revolution یعنی انقلاب کا آگ جلتا ہیں اس واسطے ہمارا بادشاہ بہت دکھ I mean, in France. But as soon as the flame of revolution is extinguished کا ساتھ سلطان سے معافی مانگتا ہیں

ٹیپو سلطان:- گویا فرانس سے مدد کی درخواست بھی رائگاں گئی، اب کیا ہوگا؟ میری مدد کرنے کے لیے نہ گھر والے تیار ہیں نہ باہر والے، کوئی ایک بھی تو دوست یا مددگار نظر نہیں آتا۔

ہمارا بادشاہ Luise XVI سلطان کا مدد کریں گا مگر ابھی سلطان کا مدد نا ہی کرنے سکتا ہیں۔

(ٹیپو سلطان نیام سے تلوار نکال لیتا ہے اور ننگی تلوار کو غور سے دیکھتا ہے)

اب صرف تم باقی رہ گئی ہو! میری ہمدم! میری دوست!! اب میں صرف تمھیں ہی اپنا دوست کہہ سکتا ہوں جب تک تم ہو اسی وقت تک ٹیپو سلطان بھی ہے، اسی وقت تک ٹیپو سلطان کی زندگی بھی ہے، اس کے وطن کی عزت، وقار اور آزادی بھی ہے لیکن جب تم نہ ہوگی! اے میری آخری دوست! اس وقت کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

(ٹیپو سلطان آگے بڑھنے لگتا ہے)

موسیو لالی:- سلطان! سلطان عالی!

ٹیپو سلطان:- (مڑکر) جب سبھی لوگ میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں تو پھر تم میری بدقسمتی میں حصہ دار بننے کے لیے کیوں رہ گئے موسیو لالی!

موسیو لالی:- سب لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیا مگر موسیو لالی آپ کا ساتھ نا ہی چھوڑنے سکتا۔ ہم کسی کا نمک نہیں کھایا لیکن جس کا نمک کھایا I can't leave him till the last moment of my life جب تک ہمارا بدن میں خون کا ایک Drop بھی باقی ہیں ہم آپ کا ساتھ دیں گا۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گا سلطان! ہم نمک حرامی نا ہی کرنے سکتا آپ کا واسطے ہم جان دینے سکتا لیکن آپ کا ساتھ نا ہی چھوڑنے سکتا۔

My flesh and blood, everything is for you my Sultan.

آپ حکم دیجئے، ہم ابھی قلعہ کا گیٹ پر جاتا ہیں۔

And I promise, they cannot enter into the fort till I am alive there.

Please order

آپ حکم دیجئے سلطان عالی!

ٹیپو سلطان:- چلو میرے بہادر دوست! اگر تمھیں جان ہی دینی ہے تو ہم دونوں ایک ساتھ اپنی جانیں دیں گے لیکن اس سے پہلے جو لوگ سرنگا پٹم پر قبضہ کرنے آئے ہیں انھیں ہم ایسا سبق دیں گا کہ آج سے سو سال بعد بھی اس واقعہ کو یاد کر کے غداروں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

(پردہ)

تیسرا منظر

میسور کا میدان، دریائے کاویری کے کنارے بہت سارے خیمے لگے ہوئے ہیں،
مسلح مرہٹہ سپاہی جگہ جگہ دکھائی دے رہے ہیں، ایک خیمہ کے سامنے نانا فرنویس
اور کرشنا بائی کھڑے ہیں۔

نانا فرنویس: پونا جانے کے باوجود پیشوا جننی سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ میسور میں دریائے کاویری کے کنارے، اس طرح خلاف توقع آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔

کرشنا بائی: میں تیرتھ کرنے رامیشور گئی تھی، راستے میں معلوم ہوا کہ میسور پر حملہ کرنے کے لیے انگریزوں کے ساتھ مرہٹہ فوج بھی آئی ہوئی ہے، رن بھومی دیکھنے کے لیے میرا لڑکا مادھو راؤ نارائن بھی ہری پنتھ کے ساتھ آیا ہوا ہے، اسی لیے مادھو راؤ کو دیکھنے میں یہاں چلی آئی۔ مجھے بھی کیا معلوم تھا کہ یہاں صرف اپنے لڑکے ہی سے میری ملاقات نہ ہو گی۔ بلکہ اپنے پتا سمان نانا فرنویس سے بھی ملاقات ہو جائے گی —— اب جبکہ آپ سے ملاقات ہو ہی گئی ہے، میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی، اب آپ کو میرے ساتھ ہی پونا چلنا ہو گا۔

نانا فرنویس: پیشوا جننی!

کرشنا بائی: نہیں، مجھے پیشوا جننی نہ کہیے، کرشنا بائی کہیے، کرشنا کہیے آپ کے نہ رہنے کی وجہ سے پورے مہاراشٹر میں ابتری پھیل گئی ہے، ذی ہوش نانا فرنویس کے چلے آنے کے بعد اب پیشوا کے حقوق کی حفاظت کرنے والا دور دور تک کوئی نہیں ہے، آپ میرے ساتھ چلیے نانا فرنویس، اپنے پیشوا، اپنے عزیز پیشوا کی حفاظت کیجیے، یہ آپ کی لڑکی کی التجا ہے، آپ کی لڑکی کی دست بستہ التماس ہے۔

نانا فرنویس: کرشنا بائی! میں پونا واپس جانے کے لیے تیار ہوں، میں اپنا پرانا عہدہ بھی قبول کر سکتا ہوں، مگر.....

کرشنا بائی: مگر کیا؟

نانا فرنویس: مگر میرا راستہ تم لوگوں سے مختلف ہے، تم لوگ جس راستے پر چل رہی ہو، میں اس راستہ پر نہیں چل سکتا اور جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ تم لوگ نہیں چاہتیں!

کرشنا بائی: میں آپ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کو تیار ہوں، اب آپ جو چاہیں گے وہی ہو گا۔

نانا فرنویس: اگر ایسی بات ہے تو پھر سنو، میں چاہتا ہوں کہ اسی وقت، اسی لمحہ پیشوا کی تمام فوج ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کرنا بند کر دے، کیا یہ ممکن ہے! تم ایسا کر سکو گی؟ بولو۔ تم ان فوجوں کو جنگ کرنے سے باز رکھ سکتی ہو؟

کرشنا بائی: اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں پیشوا کی بھلائی ہے تو میں ابھی اور اسی وقت سیناپتی ہری پنتھ کو حکم دوں گی۔

(ہری پنتھ آتا ہے)

ہری پنتھ: کیا حکم دیں گی پیشوا جننی؟

شنا بائی : ہری پنتھ، جنگ بند کر دو، ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ری پنتھ : یہ ضرور نانا فرنویس کی نصیحت ہوگی!

شنا بائی : یہ صرف نانا فرنویس کی نصیحت ہی نہیں، میں بھی یہ جنگ پسند نہیں کرتی۔

ری پنتھ : فوجوں کو اسلحوں سے لیس کرکے، اتنی دور میسور کے میدان جنگ میں دشمنوں کے مقابل کھڑا کرکے اب پیشوا جی کے حکم کے مطابق پونا واپس لے جانا ممکن نہیں ہے۔

رشنا بائی : ہری پنتھ!

ہری پنتھ : میں مجبور ہوں پیشوا جی اور اس کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔

نانا فرنویس : ہری پنتھ! میری بات مانو ہری پنتھ!

ہری پنتھ :۔ اس وقت میرے اوپر ایک بڑی جنگ کی ذمہ داری ہے، فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے نانا فرنویس، آپ پیشوا جی کو لے کر پونا واپس لوٹ جائیں۔

نانا فرنویس : تو گویا جنگ کسی طرح بھی نہیں رک سکتی؟

ہری پنتھ : نہیں۔

نانا فرنویس : اگر سپاہی لڑنے سے انکار کر دیں؟

ہری پنتھ : وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

نانا فرنویس : وہ ایسا چاہتے ہیں یا نہیں، میں ایک بار خود ان سے مل کر معلوم کرنا چاہتا ہوں، میں پیشوا جی کو ساتھ لیکر جاتا ہوں، دیکھوں کہ وہ میری درخواست کس طرح ٹھکرا دیتے ہیں، آؤ کرشنا بائی۔

(دونوں آگے بڑھتے ہیں)

ہری پنتھ : ٹھہریے نانا فرنویس! (دونوں کو روک دیتا ہے) آپ سپاہیوں سے نہیں مل سکتے۔

نانا فرنویس : کیوں؟

ہری پنتھ : کیونکہ اس جنگ میں فوجوں کا سالار میں ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے سپاہیوں سے ملاقات کریں۔

کرشنا بائی : تم مجھے روک رہے ہو ہری پنتھ! تمہاری اتنی ہمت! تمہاری یہ مجال!

ہری پنتھ : کیا میں امید رکھوں کہ پیشوا جی مجھے کوئی نامناسب کارروائی کرنے پر مجبور نہ کریں گی، جائیے، عزت کے ساتھ پونا واپس لوٹ جائیے، اس وقت میں بہت مصروف ہوں، آپ لوگوں کی مجھ سے دوبارہ ملاقات بھی نہیں ہو سکتی۔

(ہری پنتھ چلا جاتا ہے)

کرشنا بائی : نانا فرنویس! اب کیا ہوگا نانا فرنویس!

نانا فرنویس : تم نے اپنے ہاتھوں سے جو زہر کا پیالہ اٹھا کر پی لیا ہے، وہ زہر تو اپنا کام کرے گا ہی ——— جب یہ جنگ ہم نہیں رکوا سکتے تو پھر یہاں رہ کر کیا کریں گے، چلو ہم لوگ پونا واپس لوٹ چلیں، اپنی قوم کی آزادی سلب کرنے

کے لیے اپنی ہی قوم کا یہ سنگرام مجھ سے دیکھا نہ جائے گا، آؤ ——!

(دونوں چلے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد اسی خیمہ کے سامنے تہور جنگ، ہری پنتھ اور لارڈ کارنوالس آ کر کھڑے ہوتے ہیں)

ہری پنتھ :- گورنر صاحب کا ہم لوگوں پر خفا ہونا بیکار ہے!

کارنوالس :- Why ?

ہری پنتھ :- اس لیے کہ اس میں ہم لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔

کارنوالس :- قصور نا ہی ہیں؟ 'You made treaty with us تم لوگ ہمارا ساتھ معاہدہ کیا that Maratha and Nizamshahi troops will fight against Tipu Sultan. جب انگلش سولجر ٹیپو سلطان پہ attack کریں گا، تم لوگ بھی ساتھ ساتھ attack کریں گا۔

ہری پنتھ :- مجھے معلوم ہے گورنر صاحب، ہم لوگ تو اسی لیے آئے ہی ہیں!

کارنوالس :- آیا ہیں، لیکن اُدھر بنگلور میں جب ہم ٹیپو سلطان پہ attack کیا تو تمہارا Maratha force کدھر تھا؟ نظام شاہی فوج کدھر تھا؟

ہری پنتھ :- گورنر صاحب ہم لوگ تو آپ کا ساتھ دینے کے لیے ہی آئے تھے، مگر راستے میں ٹیپو سلطان کی فوج نہ جانے کدھر سے ٹڈیوں کی طرح آ کر ہم لوگوں پر چھا گئی، ایسے میں اگر ہم پیچھے نہ ہٹتے تو دشمنوں کی گولہ باری سے تباہ و برباد ہو جاتے، اس لیے آپ تک پہنچنے میں دیر ہو گئی۔

کارنوالس :- Is it ?

تہور جنگ :- ایک بار جب ہم لوگ یہاں آ گئے ہیں اور سب لوگ ایک ساتھ مل بیٹھے ہیں تو پھر اب کسی بات کی فکر نہیں ہے صاحب! آئیے اب ہم لوگ ذرا بھی دیر کئے بغیر سرنگا پٹم پر حملہ کر دیں۔

کارنوالس :- حملہ کریں گا؟ اور جب قلعہ کا اندر سے ٹیپو سلطان توپ کا گولہ برسائیں گا تو سپاہی کو لے کر پیچھے ہٹ جائیں گا، ایں!

تہور جنگ :- کیوں پیچھے کیوں ہٹیں گے؟

کارنوالس :- To save your life, understand ? You said you have been informed that there is no preparation of war in the fort. اس واسطے ہم ادھر attack کرنے کو آیا، مگر تم ٹیپو سلطان کا ونڈرفل تیاری دیکھا؟ Have you seen Tipu's wonderful preparation ? ٹیپو سلطان کس ماننک توپ سجایا ہیں، دیکھا ہیں! He is a great general indeed and I think ! it will be very difficult for us to storm this invincible fort.

ہمارے واسطے اس فورٹ کو دخل کرنا بہت مشکل ہیں۔

ہیری مینتھ :۔ تو پھر.... اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں صاحب ؟

کارنوالس :۔ Let the tiger sleep میسور کا شیر کو ابھی سونے دو، اس کو ابھی مت جگاؤ، جگانے سے بہت مشکل ہوئیں گا۔ Let be more soldiers and more arm and ammunitions جب ہمارا پاس بہت سولجر بہت گولہ بارود ہوئیں گا، تب ہم لڑائی شروع کریں گا 'Let us retreat now ! اب ہم لوگ واپس جائیں گا And we shall wait for a golden opportunity at Banglore.

(تینوں جانے کے لیے مڑتے ہیں اتنے میں کریم شاہ آتا ہے)

کریم شاہ :۔ آپ کہاں جا رہے ہیں گورنر صاحب ؟

کارنوالس : To Banglore

کریم شاہ :۔ کیوں ؟ کیا ٹیپو کے پنجے سے میسور کو آپ آزاد نہیں کرائیں گے ؟

کارنوالس :۔ Not at present.

کریم شاہ :۔ لیکن میسور کی غریب رعایا جو ٹیپو کے مظالم کا شکار ہو رہی ہے، اس کا کیا ہوگا ؟

کارنوالس :۔ No, I know it well that Tipu Sultan never ill treated his subjects. ٹیپو سلطان کبھی رعایا پر ظلم نا ہی کیا۔

کریم شاہ :۔ یہ آپ کیا کہتے ہیں ؟ اس کے ظلم سے تو میسور تباہ ہو گیا ہے !

کارنوالس :۔ You, Tipu Sultan's brother, say like this, but I Lord Cornwallis, his enemy and being an English speaking that there is such a prosperity, such a progress within the Tipu's state which is not to be met within the British India.

بس، ہمارا برٹش انڈیا میں بھی ٹیپو سلطان کا اسٹیٹ کا مافک ترقی اور خوشحالی نا ہی ہیں۔

کریم شاہ :۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایسی ترقی یافتہ اور خوشحال ریاست پر آپ کیوں قبضہ کرنا نہیں چاہتے ؟

کارنوالس :۔ That's it ! Be frank my friend ! تم سچ بات بولا ہیں، ہم بھی سچ بات بولیں گا، ہم لوگ میسور دخل کرنا ضرور چاہتا ہیں، مگر ہم ابھی دخل نا ہی کرنے سکتا ہیں It is beyond my power at present

کریم شاہ :۔ کیوں ؟ آپ کی طاقت سے بعید کیوں ہے ؟

کارنوالس : Because he is well prepared ٹیپو کا پاس ہم سے زیادہ لڑائی کا سامان ہیں۔

کریم شاہ :۔ لیکن اگر میں آپ کو ایک ایسی ترکیب بتا دوں جس سے آپ کی فتح یقینی ہو جائے ؟

کارنوالس : Then I have no objection to attack اگر دوسرا مافک کام بننے سکتا ہیں تو ہم اس موقع

سے ضرور فائدہ اٹھائیں گا۔

What do you say Tahawwar Jang Sahib and Shri Hari Panth Ji ?

دونوں :۔ ضرور، ضرور!

کریم شاہ :۔ اچھا تو پھر آپ لوگ خیمے کے اندر چلئے میں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہوگا۔

کارنوالس : All right. Proceed !

(جانے لگتا ہے)

کریم شاہ :۔ لیکن ہاں، ایک بات ہے صاحب۔

کارنوالس :۔ What ?

کریم شاہ :۔ اگر میری بتائی ہوئی ترکیب سے آپ کو فتح ہو جائے تو سرنگاپٹم کے تخت پر میں بیٹھوں گا!

کارنوالس :۔ Of course ! If the tiger is shot dead the throne is for the silly fox.

میسور کا شیر مر جائیں گا تو چالاک لومڑی کو تخت ضرور ملیں گا، مگر تم کو ہشیار رہنا مانگتا۔

کریم شاہ :۔ کیوں؟ ہشیار رہنے کی کون سی بات ہے؟

When our bulldogs will bark don't fly away, don't run away from the throne my dear silly fox.

کریم شاہ :۔ جی!

کارنوالس : Nothing, come along.

(چاروں خیمے کے اندر چلے جاتے ہیں)

چوتھا منظر

(سرنگاپٹم میں ٹیپو سلطان کے محل کا بیرونی حصہ، لان میں ہری بھری دوب ہے اور کنارے پھولوں کی کیاریاں ہیں، رونی بیگم لان کے کنارے کھڑی ہوئی کسی سوچ میں گم ہے:

معاذالدین اور عبدالخالق کیاریوں سے پھول توڑنے میں مصروف ہیں، یکایک عبدالخالق کی نظر رونی بیگم کے چہرہ پر پڑتی ہے وہ اسے سوچ میں گم دیکھ کر قریب آتا ہے)

عبدالخالق :۔ آپ ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہیں امی! میں نے تو آپ سے کہہ دیا ہے کہ اس جنگ میں انگریز کسی طرح بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے، آج کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہے جو سرنگاپٹم کے قلعہ پر قبضہ کر سکے۔

رونی بیگم :۔ تم ابھی ناسمجھ ہو بیٹے ہو عبدالخالق، تم نہیں سمجھ سکتے کہ انگریز، مرہٹہ اور نظام کتنی بڑی فوج لے کر ہمارے مقابلے میں آ رہے ہیں

کے ساتھ سرنگا پٹم کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔

عبدالخالق: محاصرہ کیے ہوئے ہے تو کیا ہوا! اب ہی دیکھیے، کئی روز سے مسلسل لڑائی ہو رہی ہے، دشمن توپ داغ رہے ہیں مگر پھر بھی ہمارے قلعہ کا ایک پتھر بھی توڑنے میں ابھی تک کامیاب نہ ہو سکے۔

معاذ الدین: توپ داغ رہے ہیں تو داغتے رہیں، ان کے توپ داغنے سے ہوتا ہی کیا ہے، وہ لوگ ایک توپ داغتے ہیں جو اس کے جواب میں ابا، موسیو لالی اور سید غفار دس توپیں داغ دیتے ہیں۔

عبدالخالق: اس کی آواز سن کر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، بدن کا خون خشک ہونے لگتا ہے، ہم لوگ ٹیپو سلطان جیسے بہادر انسان کے بیٹے ہیں، میرا تو دل چاہتا ہے کہ ابا کے ساتھ میں بھی قلعے کے برج پر چڑھ جاؤں اور ابا کے ساتھ مل کر میں بھی توپ چلاؤں اور اس کے گولے سے مرہٹہ، نظام اور انگریزوں کے پرخچے اڑا دوں۔

معاذ الدین: پھر تو بڑا مزہ آئے گا بھائی جان، دشمنوں کو کچھ بھی دکھائی نہ دے گا، صرف آگ اور دھواں، دھواں اور آگ! چلئے بھائی جان، آج رات ہوتے ہی ہم لوگ برج پر چڑھ جائیں۔

روشنی بیگم: تم انگریزوں کے ساتھ لڑو گے معاذ الدین۔ لیکن توپ کون چلائے گا!

عبدالخالق: کیوں! آج ہی رات ہم موسیو لالی سے توپ چلانا سیکھ لیں گے، چلو معاذ الدین ہم لوگ موسیو لالی کے پاس چلیں۔

(دونوں جانے لگتے ہیں)

روشنی بیگم: عبدالخالق! معاذ الدین!

عبدالخالق: (رک جاتا ہے) ہم لوگ نیک کام میں جا رہے ہیں، آپ ہم لوگوں کو مت روکیے امی!

معاذ الدین: اگر ہم لوگ جنگ کرنے جا رہے ہیں تو کیا ہوا! آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

عبدالخالق: جس وقت ابا محل سے باہر جانے لگتے ہیں، اس وقت جس طرح گردن جھکا کر ان کے پالتو شیر انھیں کورنش کرتے ہیں نا امی! آج کل وہ تمام شیر ہم دونوں بھائیوں کو بھی اسی طرح کورنش کرنے لگے ہیں، جن کو دیکھ کر خون پینے والے درندے بھی سر جھکا دیتے ہوں، ان کے سامنے بزدل انسانوں کو سر جھکاتے کتنی دیر لگے گی امی؟

(دونوں چلے جاتے ہیں)

روشنی بیگم: (آسمان کی طرف دیکھ کر) یا اللہ، کاش ایسا ہی ہو، ان دونوں بھائیوں نے جو کچھ کہا ہے، وہی سچ ہو، سلطان کا اونچا سر ہمیشہ بلند رہے، ہمیشہ سر بلند رہے۔

(کریم شاہ فقیر کا بہروپ بھر کر آتا ہے)

کریم شاہ: ایسا ہی ہوگا بیگم صاحبہ، سلطان کا سر ہمیشہ سربلند رہے گا۔

روشنی بیگم: (چونک کر) یہ کس کی آواز ہے، یہ غیب سے کس کی آواز آئی! (کریم شاہ کو دیکھ کر) کون! آپ کون ہیں؟

کریم شاہ: میں ایک تارک الدنیا فقیر ہوں۔

روشنی بیگم: لیکن آپ کا چہرہ، آپ کی آواز جیسے پہچانی ہوئی معلوم ہو رہی ہے! ایسا جان پڑتا ہے جیسے میں نے آپ کو کہیں

دیکھا ہے، لیکن یہ یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے۔

کریم شاہ :- میں جانتا ہوں، آپ نے مجھے کہاں دیکھا ہے بیگم صاحبہ!

روبی بیگم :- کہاں دیکھا ہے؟

کریم شاہ :- آپ بھی سلطان کی سلامتی کی خواہاں ہیں، میں بھی سلطان کی سلامتی چاہتا ہوں، آپ بھی سلطان کی فتح چاہتی ہیں، میں بھی سلطان کی فتح کے لیے دعائیں مانگتا رہا ہوں، ہم دونوں کے خیالات ایک ہیں، ہم دونوں کی آرزو ایک ہے، اس لیے آپ نے مجھے دن میں، رات میں، سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، ہر وقت، ہر گھڑی، ہر لمحہ اپنے ذہن میں دیکھا ہے، اپنے خیالوں میں دیکھا ہے، میں غیر شعوری طور پر آپ کے دماغ میں پہلے ہی سے موجود تھا، اسی لیے میری صورت آپ کو پہچانی ہوئی معلوم ہو رہی ہے، میری آواز پر آپ کو کسی پہچانے ہوئے آدمی کا دھوکہ ہو رہا ہے۔

روبی بیگم :- کیا آپ بھی سلطان کی سلامتی کے خواہاں ہیں، سلطان کی فتح چاہتے ہیں۔

کریم شاہ :- ہندستان کی کوئی ایسی درگاہ نہیں چھوڑی جہاں میں نے سلطان کی سلامتی اور فتح مندی کے لیے دعائیں نہ مانگی ہوں، لیکن یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے سلطان پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ جیسے سلطان کسی بہت ہی خطرناک جنگ میں پھنس گئے ہوں، اسی لیے مجبوراً مجھے سرنگا پٹم آجانا پڑا۔

روبی بیگم :- آپ کی باتیں سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی بہت بڑی روحانی طاقت کے مالک ہیں۔ مجھے بتائیے، درویش صاحب! اس جنگ میں سلطان کی فتح ہوگی تو؟

کریم شاہ :- سلطان ضرور فتحیاب ہوں گے، لیکن ......

روبی بیگم :- لیکن کیا؟

کریم شاہ :- سلطان کی فتح کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔

روبی بیگم :- کیسی رکاوٹ! کونسی رکاوٹ؟

کریم شاہ :- بتاتا ہوں، مگر اس سے پہلے مجھے یہ بتائیے بیگم صاحبہ، کیا سلطان حیدر علی کی قبرگاہ لال باغ میں ٹیپو سلطان نے لاتعداد فوج جمع کر رکھی ہے؟

روبی بیگم :- صرف لال باغ میں ہی کیوں؟ میں نے تو سنا ہے سرنگا پٹم میں کوئی جگہ ایسی باقی نہیں ہے جہاں سلطان نے فوج یا جنگی سامان جمع نہ کر رکھا ہو۔

کریم شاہ :- ہوں — ! تو گویا میرا خواب غلط نہیں تھا۔

روبی بیگم :- کونسا خواب؟

کریم شاہ :- نہیں، اُسے خواب نہیں کہا جا سکتا، نصیحت کہیے، حیدر علی شاہ کی روح کی نصیحت کہیے۔

روبی بیگم :- کیسی نصیحت، کیا کہا انھوں نے؟

کریم شاہ :- حیدر علی شاہ نے صاف لفظوں میں مجھ سے کہا کہ سرنگاپٹم کا قلعہ میں نے اتنا مضبوط بنوایا ہے کہ دشمنوں کی مجال نہیں کہ وہ اس کے اندر داخل ہو سکیں، پھر بھی بیوقوف ٹیپو سلطان نے میری قبرگاہ، لال باغ میں اتنی بڑی فوج جمع کر رکھی ہے کہ ان کے قدموں کی چاپ سے بار بار میری نیند ٹوٹ جاتی ہے، اب میں آرام سے سو بھی نہیں سکتا، اگر اس نے مجھے آرام سے سونے نہ دیا تو میری بد دعائیں اُسے تباہ کر دیں گی۔

روشنی بیگم :- بس، بس، اب آپ خاموش ہو جائیے، اس سے زیادہ میں نہیں سُن سکتی۔

کریم شاہ :- بیگم صاحبہ!

روشنی بیگم :- مجھے بتائیے، مجھے بتائیے کہ سلطان مرحوم کی روح کو کس طرح سکون مل سکتا ہے، کس طرح آرام مل سکتا ہے، مجھے بتائیے، میں وہی کروں گی۔

کریم شاہ :- پھر ابھی اور اسی وقت لال باغ سے تمام فوجوں کو دور ہٹانے کا انتظام کیجئے۔

روشنی بیگم :- بہت اچھا، میں سلطان سے کہہ کر ابھی اس کا انتظام کرتی ہوں۔

کریم شاہ :- لیکن دیکھیے بیگم صاحبہ، خواب کی جو باتیں میں نے آپ کو بتائی ہیں، سلطان سے مت کہیے گا۔

روشنی بیگم :- کیوں؟

کریم شاہ :- اس لیے کہ اس وقت سلطان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں ہیں، بہت ممکن ہے کسی فقیر کا نام سُن کر وہ اسے سچ ماننے سے انکار کر دیں اور لال باغ سے فوج ہٹانے پر تیار نہ ہوں۔

روشنی بیگم :- پھر میں کیا کروں؟

کریم شاہ :- سلطان سے کہیے یہ خواب آپ نے خود دیکھا ہے اور یہ نصیحت حیدر علی شاہ نے آپ کو کی ہے۔

روشنی بیگم :- یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں سلطان سے جھوٹ بولوں؟ نہیں، نہیں، یہ مجھ سے نہ ہو گا!

کریم شاہ :- میں خدا پرست فقیر ہوں، جب میں آپ کو جھوٹ بولنے کا حکم دے رہا ہوں تو پھر آپ کو کہنے میں کیا حرج ہے بیگم صاحبہ۔

روشنی بیگم :- لیکن پھر بھی میں ......

کریم شاہ :- (بات کاٹ کر) ٹھیک ہے، پھر میں کیا کر سکتا ہوں! جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس جنگ میں سلطان کو شکست فاش ہو گی، شاید ٹیپو سلطان کی قسمت میں یہی لکھا ہے!

روشنی بیگم :- نہیں، نہیں، آپ خفا نہ ہوں فقیر صاحب، میں آپ کا حکم ضرور مانوں گی۔ میں آپ کے کہنے کے مطابق کروں گی پھر تو سلطان کی فتح ہو گی؟ پھر تو سلطان فتحیاب ہوں گے نا؟

کریم شاہ :- ضرور، ضرور، پھر تو سلطان کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فتح ہو جائے گی، جائیے اور ان سے اسی وقت لال باغ سے فوج ہٹا لینے کو کہیے۔

(روشنی بیگم چلی جاتی ہے)

کریم شاہ :- لال باغ! اگر میں اس راستے سے ٹیپو سلطان کی فوج ہٹانے میں کامیاب ہو گیا، تو پھر لال باغ کے قریب سے دریائے کاویری کی لہروں پر سے گزر کر اس کے پار آنا زیادہ مشکل نہ ہوگا، اگر میری چال کامیاب ہو گئی تو پھر پلک جھپکتے ہی سرنگا پٹم کے قلعہ پر.......

(موسیو لالی کو دیکھ کر چونک اٹھتا ہے)

غضب ہو گیا، موسیو لالی!

(کریم شاہ تیزی سے بھاگتا ہے، موسیو لالی شہزادہ عبدالخالق اور معاذ الدین کے ساتھ آتا ہے)

عبدالخالق :- چلو صاحب! مجھے ابھی میدان میں جا کر توپ چلانا سکھا دو۔

موسیو لالی :- Yes, yes, look here Shahzada ہم آپ کو سکھائیں گا، ضرور سکھائیں گا، ہم آپ کو ایسا مانک توپ چلانا سکھائیں گا کہ.......

(کریم شاہ کو بھاگتے دیکھ کر چونک اٹھتا ہے)

Who's there ?

عبدالخالق :- کہاں؟

موسیو لالی :- (اشارہ کرتے ہوئے) There !

عبدالخالق :- کوئی فقیر معلوم ہوتا ہے۔

موسیو لالی : Fakir ? But . . . . but

معاذ الدین :- کیا ہوا صاحب، تم بٹ بٹ کیا کرنے لگے، ابھی بٹ بٹ، پھٹ پھٹ کرنے کا وقت نہیں، گرما گرم دھرم دھرم کرنے کا وقت ہے۔

موسیو لالی :- Wait a bit please. Am just nov coming.

(تیزی سے کریم شاہ کا تعاقب کرتا ہے)

معاذ الدین :- ہم دھرم دھرام کرنے کو کہتے ہیں تو صاحب پرنگ پرنگ کرتا ہے بھائی جان۔ چلئے، صاحب سے ہم لوگوں کا کام نہیں ہوگا، چلئے، ہم لوگ خود توپ چلانا سیکھیں۔

(دونوں چلے جاتے ہیں، شام کا اندھیرا پھیل چکا ہے۔ محل کی طرف سے ٹیپو سلطان اور روشنی بیگم آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں)

ٹیپو سلطان :- بڑے حیرت کی بات ہے! تمہارا خواب بھی بڑا عجیب ہے، تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے یہی باتیں خواب میں بھی سنی ہیں؟

رونی بیگم :- جی ہاں، اعلیٰ حضرت، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

ٹیپو سلطان :- تمھیں یہ بھی یقین ہے کہ جسے تم نے خواب میں دیکھا ہے وہ ابا حضور ہی تھے، لال باغ سے فوجوں کو ہٹانے کے لیے انھوں نے ہی کہا ہے، انھوں نے ہی تمھیں خواب میں نصیحت کی ہے!

رونی بیگم :- جی ہاں، جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان :- بڑی عجیب بات ہے، بڑی عجیب نصیحت ہے۔

(جانے لگتا ہے)

رونی بیگم :- آپ کہاں جا رہے ہیں میرے آقا!

ٹیپو سلطان :- لال باغ! اگر یہ ابا حضور کی نصیحت ہے تو میں ابھی لال باغ سے فوج ہٹانے کا انتظام کرتا ہوں، میں اس عظیم الشان اس عظیم شخصیت، حیدر علی خان کی قبر پر دوزانو ہو کر ان سے معافی مانگوں گا، روؤں گا، گڑگڑاؤں گا اور التجا کروں گا کہ اسے عظیم طاقت اور بلند حوصلہ رکھنے والے بہادر انسان کی روح تو میری خطاؤں کو معاف کر دے اور میرے لیے خدا سے دعا کرنا کہ اس جنگ میں مجھے فتح نصیب ہو، مجھے شکست اور ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے، میرے وطن کی آزادی، میرے وطن کا وقار قائم رہے، میں انگریزوں کے فاتح حیدر علی شاہ کی اولاد ہونے کے ناطے اس عظیم ذمہ داری کو سنبھال سکوں، اپنے وطن کی عزت پر حرف نہ آنے دوں، اپنے وطن کی آزادی کی حفاظت کر سکوں۔

(ٹیپو سلطان چلا جاتا ہے اور رونی بیگم چند لمحوں تک ٹکٹکی
لگائے اُسے دیکھتی رہتی ہے، اتنے میں کسی کے درد بھرے
گانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

جیون کے اس پتھ پر راہی سنبھل سنبھل کر چل
آج سے بھی دشمن تیرا، دشمن ہے پچھن، پل
سوکھ گیا ہے تال کا پانی، پھول کی اڑ گئی باس
کوئی نہیں ہے میت رے اپنا، کون بندھائے آس
نینوں میں ہے دکھ کا ساگر، من تیرا بے کل
جیون کے اس پتھ پر راہی سنبھل سنبھل کر چل
بجھنے لگی ہے جوت آشا کی، سو گئے پیت کے راگ
کون بجھائے تیز ہوا میں آج دہکتی آگ
مچا ہوا کہرام ہے، چاروں اور ہے اک ہلچل
جیون کے اس پتھ پر راہی سنبھل سنبھل کر چل
اب بھی ہوش میں آ دیوانے، منزل کو پہچان
[illegible] کر قدم بڑھاتا چل

آج سے بھی دشمن تیرا، دشمن ہے چمن، چل
جیون کے اس پتھ پر راہی سنبھل سنبھل کر چل (مترجم)
(گانا ختم ہوتے ہی صوفیہ سامنے آجاتی ہے)

روپ نی بیگم :۔ صوفیہ!
صوفیہ :۔ بیگم صاحبہ، آداب!
روپ نی بیگم :۔ تم اتنا غمناک گیت کیوں گا رہی ہو صوفیہ؟
صوفیہ :۔ آج غم کے گیت گانے ہی کا وقت ہے بیگم صاحبہ!
روپ نی بیگم :۔ نہیں، ایسا غمناک گیت میں نہیں سن سکتی، میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی ہیں! تم جاؤ، چلی جاؤ، تم کیوں آئی ہو یہاں، اتنے دنوں بعد میرے محل میں کیوں آئی ہو، کیا یہی درد و غم سے بھری ہوئی ٹھنڈی سانس لینے کے لیے آئی ہو؟ آہیں بھرنے آئی ہو؟
صوفیہ :۔ یہ آہیں میں اپنے ساتھ نہیں لائی بیگم صاحبہ، یہ تو آپ کے محل میں پہلے ہی سے جمع ہیں، آپ دیکھتی نہیں، چاروں طرف کیسی پُرسکوت گھنی تاریکی پھیلی ہوئی ہے، میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوگا، میں یہاں آؤں گی، اسی لیے آج آگئی ہوں۔
روپ نی بیگم :۔ میرے محل میں اندھیرا پھیلا ہوا ہے؟ تو کیا یہ وہی اندھیری رات ہے!
صوفیہ :۔ سلطان نظر نہیں آتے بیگم صاحبہ، کہاں گئے ہیں؟
روپ نی بیگم :۔ لال باغ!
صوفیہ :۔ لال باغ! اتنی اندھیری رات میں وہ راہ تو نہ بھولیں گے؟ محل تک واپس آجائیں گے نو؟
روپ نی بیگم :۔ صوفیہ! صوفیہ!!
صوفیہ :۔ بہت ممکن ہے سلطان راستہ نہ بھولیں، مگر آپ کے دونوں شہزادے کہاں ہیں بیگم صاحبہ؟ وہ دونوں ابھی بچے ہیں، اندھیرے میں راہ بھول جائیں گے! انھیں تلاش کیجیے، انھیں اپنے کلیجے سے لگا کر رکھیے، اپنے سینے میں چھپا کر رکھیے!

(صوفیہ چلی جاتی ہے)

روپ نی بیگم :۔ صوفیہ! صوفیہ! یہ کس تباہی کا اشارہ کرکے جا رہی ہو تم ..... معاذالدین ..... عبدالخالق ..... معاذالدین ..... عبدالخالق .....

(معاذالدین اور عبدالخالق آتے ہیں)

دونوں :۔ امّی! امّی!
روپ نی بیگم :۔ آؤ میرے بچو، آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ، آؤ!

(دونوں کو سینے سے لگا لیتی ہے)

عبدالخالق :- کیا ہوا امّی؟ آپ کیوں کانپ رہی ہیں؟

روشنی بیگم :- (اپنے آپ سے) غضب ہو گیا، فقیر کی باتوں پر اعتبار کرکے میں نے بہت بُرا کیا۔ لال باغ! لال باغ!

(ٹیپو سلطان آتا ہے)

ٹیپو سلطان :- ہاں، لال باغ کے راستے ٹیپو کی تباہی آچکی ہے، ٹیپو سلطان کی شکست، ذلیل شکست ہو چکی ہے۔

روشنی بیگم :- شکست؟

ٹیپو سلطان :- ہاں! میں لال باغ سے اپنی فوجوں کو ہٹا کر ابّا حضور کی قبر پہ دوزانو بیٹھا ہوا معافی مانگ رہا تھا کہ یکایک میں نے دیکھا، دریائے کاویری کی لہروں کو چیر کر دشمنوں کی اَن گنت فوجیں اس پار آ رہی ہیں، ان کے راستے میں کسی نے بھی رکاوٹ نہیں ڈالی، ایک بندوق کی آواز بھی سنائی نہ دی اور وہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر سرنگاپٹم میں داخل ہو چکے ہیں۔

روشنی بیگم :- جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان :- مگر ایسا کیوں ہوا روشنی بیگم، ایسا کیوں ہوا؟ ابّا حضور نے خواب میں تمھیں ایسی نصیحت کیوں کی؟

روشنی بیگم :- لیکن ..... لیکن وہ خواب میں نے نہیں دیکھا تھا جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان :- وہ خواب تم نے نہیں دیکھا تھا؟ تب ..... تب پھر کس نے دیکھا تھا؟

روشنی بیگم :- ایک فقیر نے!

ٹیپو سلطان :- (چونک کر) فقیر نے؟ فقیر نے خواب دیکھا تھا، یہ بات تم نے پہلے کیوں نہ بتائی، مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا۔

روشنی بیگم :- فقیر نے منع کر دیا تھا، انھوں نے کہا تھا، اگر میں فقیر کا نام لوں گی تو آپ کو یقین نہیں آئے گا۔

ٹیپو سلطان :- یقین نہیں آئے گا؟ کیوں یقین نہیں آئے گا؟ اُف! روشنی بیگم تم نے غضب کر دیا، تم نے غضب کر دیا بیوقوف عورت! آج تیری ہی ناسمجھی کے باعث ٹیپو سلطان کو ذلیل شکست کھانی پڑی ہے، بدنامی اٹھانی پڑی ہے اور اپنی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگانا پڑا ہے!

روشنی بیگم :- اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان :- لیکن وہ فقیر کہاں ہے؟ ایکبار ..... صرف ایکبار وہ مجھے مل جاتا .....

(موسیو لالی، کریم شاہ کو لے کر آتا ہے، روشنی بیگم دونوں بچوں کے ساتھ چلی جاتی ہے)

موسیو لالی :- Here is the Fakir Sultan! Here is the Fakir.

ٹیپو سلطان :- تم ..... تم کریم شاہ!

موسیو لالی :- ہاں، سلطان، فقیر کا بھیس بدل کر قلعہ کا اندر آیا، ہم کو شبہ ہوا،

I stealthily followed him and when he got out from the fort to meet our enemies. I arrested him at once, snatched away his beard and lo ! Where is Fakir. He is our old friend Karim Shah.

(یکایک توپ کی آواز سنائی دیتی ہے)

ٹیپو سلطان :- (چونک کر) توپ کی آواز؟ شاید انگریزوں نے حملہ کر دیا، شاید سب کچھ ختم ہو گیا۔

موسیو لالی :- No, no Sultan, our soldiers shall not allow them to proceed towards the fort. They will resist.

ہمارا سولجر دشمن کو روکیں گا، ہم جاتا ہیں، ہم جان دیں گا مگر قلعہ دخل کرنے نا ہی دیں گا۔

(موسیو لالی چلا جاتا ہے)

ٹیپو سلطان :- کریم شاہ! تم نے آج میرے سامنے کتنی بڑی مصیبت لاکر کھڑی کر دی ہے، جانتے ہو؟

کریم شاہ :- جانتا ہوں سلطان، میں نے حیوانوں کا کام کیا ہے، آپ مجھے سزا دیجئے، سزا دیجئے سلطان میں اسی قابل ہوں مجھے عبرتناک سزا دیجئے۔

ٹیپو سلطان :- سزا دوں؟ تمھیں سزا دوں!

(پستول اٹھاتا ہے)

نہیں، تمھارے جسم میں بھی وہی خون ہے جو میرے جسم میں ہے، آج جبکہ میری شکست یقینی ہے، میری عزت، میرا مرتبہ...... وطن کی عزت، وطن کا وقار آج جب سبھی کچھ کھو رہا ہوں تو ایسے وقت میں تمہارا خون بہاکر میں اپنے گناہوں میں مزید اضافہ نہیں کر دوں گا۔

کریم شاہ :- اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان :- میں جانتا ہوں کریم شاہ! میرے خلاف تمہارے دل میں محض اس لیے غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی ہے محض اس لیے کہ میسور کے تخت پر میں بیٹھا ہوا ہوں اور تم اس تخت کو حاصل کرنے کے لالچ میں اپنے ہوش حواس گنوا بیٹھے ہو، اب تمھیں جائز اور ناجائز، بھلے اور برے کی تمیز بھی باقی نہیں رہی ہے، اچھی بات ہے لو بھائی، تم ہی اس تخت پر بیٹھ جاؤ، میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوشی کے ساتھ اس تخت سے دستبردار ہو جاتا ہوں، میں اس ریاست کی تمام ذمہ داری تمہارے ہاتھوں میں سونپ دیتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی تم سے میری ایک گزارش ہے، ایک التجا ہے، میں تمہارا بڑا بھائی ہوں، تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم تخت پر بیٹھو تو حیدر علی کے بیٹے کی طرح اپنا سر بلند کرکے بیٹھو، غیر ملکی تاجر کمپنی کے غلام بن کر مت بیٹھو، غلام بن کر مت بیٹھو۔

کریم شاہ :- سلطان! سلطان اعظم! میں بھی حیدر علی خاں کا بیٹا ہوں، آپ کا سگا بھائی ہوں، پھر بھی میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا، میرے اندر کا سویا ہوا درندہ جاگ اٹھا تھا اور میں نے اپنے اندر کے اس درندہ صفت انسان کی بات

مان کر آپ کے لیے تباہی لائی ہے۔ لیکن اب جبکہ آپ اس درندہ صفت انسان کو مارنا نہیں چاہتے، میں خود اسے قتل کر دوں گا، میں اپنے ہاتھوں سے اُسے قتل کروں گا، میں جا رہا ہوں انگریزوں کے ساتھ ہونے والی اس جنگ میں اپنے وطن کی خاک پر اس شیطان کی قربانی دینے جا رہا ہوں۔

(کریم شاہ چلا جاتا ہے)

۔ کریم شاہ! کریم شاہ! نہیں، ٹھیک ہے، جاؤ، اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرو، کفارہ ادا کرو۔

(توپ کی آواز سنائی ہے، رونی بیگم دونوں بچوں کے ساتھ پھر آتی ہے، اتنے میں بینڈ بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

عبدالخالق : یہ تو بینڈ بجنے کی آواز ہے؟

ٹیپو سلطان : ہاں، انگریزی باجے کی آواز ہے، معلوم ہوتا ہے، انگریز جنگ جیت گئے۔

معز الدین : ابا! ابا!

ٹیپو سلطان : آؤ، میرے بچو میرے قریب آؤ، تم لوگ شہزادے بن کر پیدا ہوئے تھے، لیکن میں نے تمھیں بھکاری بنا دیا ہے

(سید غفار آتا ہے)

سید غفار : اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان : کون؟ سید غفار! کیا خبر ہے سپہ سالار؟ سر جھکا کر کھڑے مت رہو، آج میں بُری سے بُری خبر سننے کو تیار ہوں، آج میں ہر غم سہنے کو آمادہ ہوں سید غفار، بولو بھائی، کیا خبر ہے؟ میر لال باغ.....

سید غفار : لال باغ دشمنوں کے قبضے میں ہے جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان : دشمنوں کے قبضے میں ہے؟ تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو، صلح کے لیے قاصد بھیجو، میں ہر شرط پر صلح کرنے کو تیار ہوں، جاؤ۔

(سید غفار چلا جاتا ہے)

رونی بیگم : آپ صلح نہ کیجیے جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان : تم خاموش رہو رونی بیگم، دل زیادہ گھبرائے تو چپکے چپکے رو لو، مگر خاموش رہو، صلح مجھے کرنا ہی ہو گی۔

(موسیو لالی آتا ہے اور رونی بیگم چلی جاتی ہے)

موسیو لالی : No, No, it can't be. صلح نا ہی ہونے سکتا، صلح نا ہی ہوئیں گا۔

ٹیپو سلطان : لالی!

موسیو لالی : ہمارا پانچ توپ تیار ہیں سلطان اعظم، اس میں بارود بھرتی ہیں۔

We are waiting for your order, you please order and then you will see that our five hundred cannons will roar like five thousand lions.

ہمارا پانچ سو توپ ایک ساتھ شہر کا مافک گرجیں گا۔

And our enemies will be reduced to ashes, am going to start.

ٹیپو سلطان: نہیں، نہیں، توپ داغنے کی ضرورت نہیں، لال باغ میں ابا حضور دفن ہیں، لال باغ ان کی قبر گاہ ہے، میں لال باغ تباہ نہیں کر سکتا، دشمنوں کو تباہ کرنے کے لیے لال باغ پر گولہ باری نہیں کر سکتا، میں ابا کی قبر منہدم نہیں کر سکتا، نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا لالی، تم خاموش کھڑے رہو، میں صلح کروں گا، صلح کروں گا۔

(سید غفار آتا ہے)

سید غفار: صلح کی شرط بڑی سخت ہے حضرت عالی، میں وہ شرط دہرا نہیں سکتا۔

ٹیپو سلطان: پھر بھی بتاؤ تو سہی، انگریز کیا چاہتے ہیں؟

سید غفار: وہ لوگ ضمانت کے طور پر......

ٹیپو سلطان: ہاں، ہاں کہو، رک کیوں گئے، کیا چاہتے ہیں؟

سید غفار: میسور کے عوام کی زندگی کی خوشی کا خزانہ اور آپ کے دونوں شہزادوں کو مانگتے ہیں۔

موسیو لالی: What! Did they dare to say so!

ٹیپو سلطان: اگر میں انھیں اپنے دونوں لڑکوں کو دے دوں تو کیا وہ لال باغ چھوڑ دیں گے!

سید غفار: جی ہاں سلطان معظم!

ٹیپو سلطان: یا خالق! معاذ الدین!

(دونوں ٹیپو سلطان کے قریب آتے ہیں اور ٹیپو سلطان انھیں سید غفار کے حوالے کر دیتا ہے)

موسیو لالی: Sultan!

ٹیپو سلطان: اس معاملے میں تم کچھ نہیں بول سکتے لالی، چپ چاپ کھڑے رہو۔

(روشنی بیگم دوڑ کر آتی ہے)

روشنی بیگم: میرے بچوں کو مجھ سے جدا نہ کیجیے میرے مالک، انھیں دوسروں کے حوالے نہ کیجیے میرے آقا!

ٹیپو سلطان: خاموش رہو روشنی بیگم، میں بھی ان بچوں کا باپ ہوں، کیا تم نہیں دیکھتیں کہ آنسو بھری آنکھوں سے وہ صرف تمہیں ہی نہیں، مجھے بھی دیکھ رہے ہیں۔

دونوں: ابا! ابا!

ٹیپو سلطان: میرے بچے!

(دونوں کو سینے سے لگا لیتا ہے)

نہیں، نہیں، تم جاؤ۔

(دونوں کو ہٹا دیتا ہے)

میری ریاست چھن جائے، میری دولت لٹ جائے، میرا سب کچھ مجھ سے چھن جائے مجھے اس کی پروا نہیں، میرے بچے مجھ سے چھن جائیں، مجھے اس کا کوئی غم نہیں، رو رو کر میری دونوں آنکھیں اندھی ہو جائیں، مجھے کوئی افسوس نہیں، لیکن پھر بھی...... پھر بھی میں ابا حضور کی قبرگاہ کو ناپاک نہ ہونے دوں گا، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا، لے جاؤ سید غفار تم انھیں لے جاؤ۔

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

پہلا منظر

نظام کا رنگ محل، محل کے ایک کونے میں گدی بچھی ہوئی ہے، گدی پر چاندی کا ایک جام اور دو گلاس رکھے ہوئے ہیں اور ایک نوعمر ساقی نظام کے قریب بیٹھی ہوئی ہے۔ پردہ اُٹھنے کے چند منٹ بعد نوعمر ساقی جام اُٹھا کر دونوں گلاس کو شراب سے پُر کر دیتی ہے۔ اتنے میں ہیرا منچھ آ کر نظام کے پاس بیٹھ جاتا ہے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، مسکراتے ہیں اور پھر دونوں گلاس اٹھا لیتے ہیں۔ گلاس سے گلاس ٹکراتے ہیں اور دوسرے ہی لمحہ دونوں اپنا اپنا گلاس خالی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ساقی دوبارہ گلاس کو شراب سے پُر کرنے لگتی ہے، اور اتنے میں بہت ساری رقاصائیں کمرے میں داخل ہو کر رقص شروع کر دیتی ہیں اور گاتی ہیں۔

حسین ہے شام
اُٹھا لے جام
لالہ فام! بے خطر
خودی کو غرقِ جام کر اُٹھا لے جام

چھلک رہی ہے مے یہاں ہر ایک چیز ہے جواں
ذوقِ دید عام کر تو خود کو شاد کام کر
یہ وقت پھر نہ آئے گا کہ پھر نہ آئے گی یہ شام
اُٹھا لے جام

ادھر چھلک رہا ہے جام آج تیرے ہات میں
اُدھر حسین شام ڈھل رہی ہے کالی رات میں
اگر یہ رات آگئی، اگر فضا پہ چھا گئی
نہ ہو گی پھر کبھی سحر
مگر تو کوئی غم نہ کر

اُدھر ہے رات کا فسوں
ادھر شراب لالہ گوں
ہے نیرگیٔ شب اُدھر
طلسم دخترِ رز ادھر
ہے جام مے
عجیب شے
اگر سرور آگیا، نشہ کہیں جو چھا گیا
نہ آئے ہوش عمر بھر
مگر تجھے نہیں خبر
یہ وقت پھر نہ آئے گا کہ پھر نہ آئے گی یہ شام
اُٹھا لے جام (مترجم)

(رقاصائیں گانا ختم ہونے کے بعد کورنش بجا لاتی ہیں اور نظام علی خاں زور زور سے تالیاں پیٹتا ہے)

نظام : بہت خوب! بہت خوب! واہ، وا، واہ وا، کیوں ہری پنتھ تمہیں مزہ آیا؟

ہری پنتھ : بڑا مزہ آیا، واقعی نظام بہادر کے رنگ محل میں جتنی ملکی اور غیر ملکی رقاصاؤں کو دیکھ رہا ہوں اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں رنگ روپ کے دیش میں آگیا ہوں۔

(رقاصائیں چلی جاتی ہیں)

نظام : (قہقہہ لگا کر) ہا، ہا، ہا، ہا! تم بھی بڑے دلچسپ آدمی ہو! ابھی تو میں نے بہت سارے نئے چہروں کو چھپا رکھا ہے نئے لاٹ آرتھر ویلسلی کے بھائی سر آرتھر ویلسلی آنے والے ہیں، وہ آجائیں پھر میں ان تمام نئے اور خوبصورت چہروں کو ان کا دل بہلانے کے لیے وقف کر دوں گا۔

ہری پنتھ : میں نے سنا ہے کہ نئے لاٹ صاحب کارنوالس سے بھی زیادہ سخت مزاج آدمی ہیں اور ان کے بھائی سر آرتھر ویلسلی

تو بات بات پر تلوار اور بندوق نکالنے لگتے ہیں، اب یہی دیکھیے، انھوں نے یکایک حکم بھجوا دیا کہ نظام کے رنگ محل میں مرہٹہ سیناپتی سے ملنا چاہتا ہوں، اب کون جانے وہ یہاں کس لیے آرہے ہیں اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں یہ تو وہی جانیں۔

(پہرے دار آتا ہے)

پہریدار : صاحب آرہے ہیں۔

نظام : (گھبرا کر) صاحب ؟ جاؤ، انھیں عزت کے ساتھ اندر لے آؤ۔

(پہرے دار چلا جاتا ہے)

لاٹ صاحب کے بھائی آگئے ہیں ہیری پنتھ ! کوئی ہے؟ رقاصاؤں کو بلاؤ۔

(موسیو لالی آتا ہے)

موسیو لالی : رقاصہ ! Dancing girl ہم ناچ دیکھنا نہیں مانگتا No dancing girl please ! جب لاٹ بہادر کا بھائی آئیں گا تو ہم ڈانس نہیں کا۔ جب نظام بہادر اور ہیری پنتھ، ہندو مسلمان ہاتھ میں ہاتھ دے کر ڈانس کریں گا تو ہم دیکھیں گا۔

(ہیری پنتھ کا ہاتھ پکڑ کر ناچتا ہے)

اور تم ایسا مانک ڈانس کریں گا Tarala ! Tarala ! Tarala ! Ha ! Ha ! Ha !

نظام : موسیو لالی، تم خلاف توقع یہاں ؟

موسیو لالی : دوستی، دوستی، ہم تمہارا ساتھ دوستی کرنے آیا ہیں !

ہیری پنتھ : کیا واقعی، تم ہمارے دوست بن کر آئے ہو ؟ تم ہمارا ساتھ دوگے ؟

موسیو لالی : of course ! ہم تمہارا دوست بن کر آیا، ہم تمہارا ساتھ دیں گا، ہم ہندو، مسلمان اور کرسچین سب مل کر ایک سمندر کا پانی پئیں گا،

Oceanic golden water which has got wonderful lable of scotch whiskey.

(جام اٹھاتا ہے اور تھوڑی سی شراب پیتا ہے)

Excuse me, without your permission please :

کیا کریں گا، ہمارا سلطان کا اسٹیٹ میں پانی نہیں چلتا، دو برس سے ہم کچھ نا ہی پیا۔

(ایک ہی سانس میں خالی کر دیتا ہے)

And now Ah ! Now we are all friends.

لال پانی پینے کا بعد اب ہم سب لوگ دوست ہیں۔

نظام : میں تمہاری دوستی قبول کرتا ہوں صاحب ! میں تمھیں چالیس ہزار گولہ انداز فوجوں کا سپہ سالار مقرر کرنے کو تیار

ہوں، بولو، نوکری کرو گے؟

موسیولالی: نوکری! (قہقہہ لگاتا ہے) ہا، ہا ہا! دوست بھی کبھی دوست کا پاس نوکری کرتا ہیں؟ دوست، دوست کا ساتھ شراب پینے سکتا، ناچ دیکھنے سکتا، عیش کرنے سکتا، تم بھی ہمارا ساتھ شراب کا دوستی کرنے سکتا، نوکری ہم سلطان کا کرتا ہیں؟

ہیری پلینتھ: تم سلطان کی نوکری کیوں کرنا چاہتے ہو؟

موسیولالی: Because Sultan does not allow me to drink. سلطان ہم کو شراب ناہی پینے دیتا، اُس واسطے ہم سلطان کا نوکری کریں گا، ہم سلطان کا نمک کھایا، اس واسطے سلطان کا نوکری کریں گا۔

نظام: لیکن وہ تو تمہاری قوم کا زبردست دشمن ہے!

موسیولالی: دشمن؟

نظام: ہاں، کیا تمھیں نہیں معلوم موسیولالی، ٹیپو سلطان نے مالابار سے تیس ہزار کرسچنوں کو سرنگا پٹم لاکر مسلمان بنادیا ہے؟

موسیولالی: That's good, well Portuguese missionaries of Malabar had also pressed thirty thousand of Muslims to change their religion and to become Christian.

سلطان اگر ان کو پھر مسلمان بنایا تو بہت اچھا کیا ہیں۔

پرتگیز مشنری جیسا زبردستی کیا، سلطان اس کو بہت اچھا جواب دیا ہیں، سلطان کوئی ظلم ناہی کیا۔

ہیری پلینتھ: ظلم کیا ہے یا نہیں کیا، اس کا فیصلہ اب نہ تو ہم کر سکتے ہیں اور نہ تم موسیولالی، اس کا فیصلہ اب انگریز کریں گے، کیونکہ انصاف کی کرسی پر آج وہی بیٹھے ہوئے ہیں۔

نظام: ان انگریزوں کے ساتھ جھگڑا کر کے آج تمہارا حاکم ٹیپو سلطان بھی مجبور و بے بس ہو کر رہ گیا ہے، اُسے بھی آخر میں اپنے دونوں لڑکوں کو انگریزوں کے حوالے کر کے صلح کی بھیک مانگنی پڑی ہے۔

موسیولالی: اچھا! اچھا! دیکھو، ہم نے سُنا ہے شاہزادہ عبدالخالق اور معاذالدین ابھی تمہارا محل میں ہیں؟

Those two Princes are at present in your palace

نظام: ہاں!

موسیولالی: May I see them? Ah! what a long time I could not see them.

ہم ان کو دیکھنے سکتا؟ ہم ان کو دیکھنے کا واسطے سلطان کا پرمیشن کا بغیر چلا آیا۔

Please allow me to see them for a while Nizam Bahadur.

نظام: میں ان دونوں سے تمہاری ملاقات کرا سکتا ہوں، مگر وعدہ کرو کہ تم میرے یہاں نوکری کرو گے؟

موسیولالی: نوکری! تمہارا نوکری؟ تو، تو جو آدمی دوسرا کا نوکر ہائیں، اس کا پاس ہم نوکری ناہی کرنے سکتا۔

نظام: میں نوکر ہوں؟

موسیو لالی: ہاں، ضرور! جو آدمی حیدر آباد کا گدی پر بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو سلام کرتا، وہ بھی نوکر ہیں، انگریز تم کو بادشاہ بولتا، راجہ بولتا، نواب بولتا، لیکن سارا دنیا جانتا تم نواب بہادر ناہی ہیں غلام ہیں۔

نظام : (بگڑ کر) نامراد فرانسیسی! تمہاری اتنی ہمت! تمہاری اس بدتمیزی کی کیا سزا دوں گا جانتے ہو؟

موسیو لالی: سزا؟ خو! تم ہم کو سزا ناہی دینے سکتا۔

نظام : میں تمھیں سزا نہیں دے سکتا!

موسیو لالی: No, look here Nizam Bahadur, you know تمہارا بوس ایسٹ انڈیا کمپنی کا چمڑا اُجلا ہیں، دیکھو (اپنی رنگت کی طرف اشارہ کرتا ہے) ہمارا چمڑا بھی اُجلا ہیں اور ہم جانتا جس کا چمڑا اُجلا ہوتا، اس کو تم سزا ناہی دینے سکتا، تم لوگ اس کو سر جھکا کر صرف سلام کرنے سکتا۔
Well Nizam Bahadur and you Maratha General! ہم کو سلام کرنا ناہی آتا، تم لوگ ہم کو سکھاؤ، تم لوگ کس مافک سلام کرتا۔

نظام : تم سلام کرنا نہیں جانتے؟ اچھا! میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں کہ کس طرح سلام کیا جاتا ہے۔ (زور سے) کوئی ہے؟

(پہریدار آتا ہے)

اس کو ہتھکڑی پہنا کر قید خانے میں ڈال دو۔

(پہریدار لالی کی طرف بڑھتا ہے)

موسیو لالی: Wait you wretch!

(پہریدار خوف کھا کر رُک جاتا ہے)

نظام بہادر ہم تمہارا ساتھ شراب پیا، دوستی کیا، اس واسطے تم سے ایک بات پوچھا، مگر تم ہم کو ناہی سکھلایا۔ مگر اب ہم تمہارا سلام دیکھ لیں گا، وہ دیکھو تمہارا بوس آتا Look there : Who comes there!

نظام : کون؟ کون آرہا ہے، سر آرتھر ویلسلی؟

(ویلسلی آتا ہے)

ویلسلی : Good evening my friends!

نظام }
ہیری پنتھ } : آیئے، آیئے، سر آرتھر ویلسلی!

(دونوں جھک کر ویلسلی کو سلام کرتے ہیں، لالی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگتا ہے۔
ویلسلی چونک کر لالی کی طرف دیکھتا ہے)

ویلسلی : Who is he?

ہیری پنتھ : موسیو لالی!

ولیسلی : Oh ! you are that brave General of Tipu Sultan ?

موسیولالی: Yes, General !

ولیسلی : Very glad to see you friend !

(دونوں مصافحہ کرتے ہیں)

موسیو لالی، اچھا ہوا ہمارا ملاقات ہو گیا، ہم کچھ بات کرنا چاہتا ہیں، نظام بہادر اور بہری بنفذ کو بھی سننے کا مدد گار ہیں، اس واسطے ہم اردو میں بات کریں گا۔ How do you like it ?

موسیولالی : All right. I mean very good idea

بہت اچھا خیال ہیں۔

نظام : آپ کھڑے کیوں ہیں حضور، تشریف رکھئے۔

ولیسلی : Don't worry Nizam Bahadur.

(موسیولالی سے) موسیو لالی، ہم تمہارا سلطان کا پاس Subsidiary Alliance یعنی ماتحتی کی دوستی کے بیے معاہدہ بنا کر بھیج دیا تھا۔

موسیولالی Subsidiary Alliance !

نظام : ماتحتی کی دوستی؟

ولیسلی : ہاں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ٹیپو سلطان کو صرف نام کا واسطے ہمارے ماتحت رہنا ہوئیں گا۔ اور اس کا بدلہ میں ہم لوگ اس کا دشمن سے اور تمام مصیبت سے بچائیں گا۔

نظام : یہ تو بڑی اچھی تجویز ہے۔

ولیسلی : ہاں، بہت اچھا تجویز ہائیں، مگر ٹیپو سلطان اس کا جواب کیوں نہیں دیتا موسیولالی؟

موسیولالی: Because Tipu Sultan hate to answer ٹیپو سلطان ایسا تجویز کا جواب دینا اپنا توہین سمجھتا ہیں، جب سلطان کو جواب دینا ہوئیں گا اس کا گولہ بارود جواب دیں گا۔

ولیسلی I see. I see اسی واسطے سلطان جزیرہ مریشش میں اپنا قاصد بھیجا؟

موسیولالی: Yes, not only in Mauritius ! our massenger had been to Zaman Shah the king of Afghanistan.

ولیسلی And even I know ہم کو معلوم ہائیں، نپولین بوناپارٹ کا پاس بھی سلطان Massenger بھیجا!! اس کا کیا مطلب ہیں؟

موسیولالی: Very easy to understand اس مرتبہ آخری لڑائی ہوئیں گا، ہندستان میں ٹیپو سلطان رہیں گا یا ایسٹ انڈیا کمپنی رہیں گا۔

ویلیلی : Then let there be war ! Let there be a last and decesive war ! The tiger of Mysore or the British Lion, one will survive and the other must die.

نظام بہادر——

نظام : فرمایئے سرآرتھر ویلیلی !

ویلیلی : Prince Abdul Khaliq and Moazuddin please :

نظام : کوئی ہے ؟

(پہریدار آتا ہے)

شہزادہ عبدالخالق اور معاذالدین کو حاضر کرو۔

(پہریدار چلا جاتا ہے اور دونوں شہزادوں کو لے کر آتا ہے)

عبدالخالق : (پہریدار سے) تم ہم دونوں کو کہاں لئے جا رہے ہو پہریدار ! (موسیو لالی کو دیکھ کر) ارے موسیو لالی تم یہاں ؟

ویلیلی : Come here, come here my little friends :

(دونوں ویلیلی کے قریب جاتے ہیں)

موسیو لالی تم کو لینے آیا، تم ابا کے پاس جاؤ گے ؟

معاذالدین : ہم کیسے جا سکتے ہیں صاحب، ہم دونوں تو قید میں ہیں۔

ویلیلی : No my little friends ! you are free from today :

(دونوں کو موسیو لالی کے حوالہ کر دیتا ہے)

موسیو لالی : Sir Arthur Wellesley, are you making Jokes ?

ویلیلی : No General, when Tipu Sultan doesn't want to make treaty with us, there will be a last and decesive war so, we do not like to retain these two boys in our custody, what's the use of it ? According to the Governor General's order Shahzada Abdul Khaliq and Moazuddin are honourably released.

عبدالخالق : صاحب !

ویلیلی : Wish you good luck my young friends ! good bye ! good bye General, very soon we shall meet again ! Is it not ?

موسیو لالی : That's right, that's right General ! In the fourth Mysore war. You under the British flag and myself under the flag of Fateh Ali Tipu Sultan.

(موسیو لالی، عبدالخالق اور معاذالدین کو ساتھ لیکر چلا جاتا ہے)

ولیسلی : نظام بہادر!

نظام : کیسے سر آرتھر ولیسلی!

ولیسلی : کیا بات ہے، نظام بہادر بہت پریشان معلوم ہوتا ہیں۔

نظام : میں سوچ رہا ہوں کہ ٹیپو سلطان نے آپ لوگوں کی اتنی بے عزتی کی، پھر بھی آپ نے اس کے دونوں لڑکوں کو آزاد کر دیا؟

ولیسلی : بے عزتی؟

نظام : بے عزتی نہیں کی؟ آپ کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا، معاہدہ کو ٹھکرا دیا اور جنگی تیاریاں شروع کر دیں، یہ سب کیا ہے؟

ولیسلی : دیکھئے نظام بہادر، ٹیپو سلطان بہت naughty بہت مغرور آدمی ہیں، وہ تو ہمارا دشمن ہیں، دشمن اگر Subsidiary Alliance . . . I mean ماتحتی کی دوستی قبول نہیں کیا تو اس میں ہمارے واسطے بے عزتی کا کوئی بات نہیں ہائیں، جو لوگ ہمارا دوست ہائیں، ٹیپو سلطان کا ساتھ تمام لڑائی میں ہمارا ساتھ دیا ہیں، ہمارا مدد کیا ہیں، وہ لوگ اگر اس معاہدہ پر دستخط ناہیں کریں گا تو اس میں ہم لوگوں کا ضرور بے عزتی ہوئیں گا، آپ بولئے، ہوئیں گا یا ناہی؟

نظام : وہ تو ٹھیک ہے۔

ولیسلی : very good نظام بہادر، انڈیا میں آپ ہمارا سب سے پیارا دوست ہیں، اسی واسطے گورنر جنرل کا خواہش ہے کہ سب سے پہلے ہماری غلامی نظام بہادر قبول کریں گا اور سب سے پہلے معاہدہ پر دستخط کریں گا۔

نظام : میں آپ کی غلامی قبول کر لوں؟

ولیسلی : ہاں، اس میں کوئی حرج ناہی ہیں، No harm

نظام : جی!

ولیسلی : In practice . . . I mean. ٹیپو سلطان کو چھوڑ کر آپ سب آدمی ہمارا غلام ہیں، اب اسی بات کا آپ زبان سے اقرار کریں گا، بس!

نظام : ہری پنتھ!

ولیسلی : ہری پنتھ کیا بولیں گا، مرہٹہ، راجپوت، سکھ، ہمارا تمام دوست کو One by one اس معاہدہ پر دستخط کرنا ہوئیں گا اور Seal مہر لگانا ہوئیں گا۔ تیجئے نظام بہادر، سب سے پہلے آپ اس پر دستخط کیجئے۔

نظام : لیکن......

ولیسلی : Ah! I can't wait any more Nizam Ali Khan ٹیپو سلطان اس ماتحت معاہدہ پر دستخط کرنے سے نفرت کر سکتا ہیں، لیکن آپ کا ماتحت آدمی کو اس بات پر فخر کرنا چاہئے، آپ کا واسطے یہ عزت

کا بات ہیں۔

نظام : مجھے کم از کم سوچنے کا موقع

ولیسلی : Not a minute more, say yes or no. If you are not willing to sign I am going.

(جانے لگتا ہے)

نظام : نہیں، نہیں، سر آرتھر ولیسلی، ٹھہریئے، لائیے معاہدہ دیجئے تاکہ میں اپنے ہی ہاتھوں سے غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لوں، وطن کے ساتھ اور قوم کے ساتھ میں نے جو غداری کی ہے اس کی تکمیل کر دوں، معاہدہ پر دستخط کر کے اس گناہ کو تکمیل تک پہنچا دوں.... کوئی ہے ؟ قلمدان لاؤ۔

(غلام قلمدان اور مہر لے کر آتا ہے اور نظام معاہدہ پر
دستخط کر کے مہر لگا دیتا ہے)

ولیسلی : Thank you Nizam Bahadur ! And now the Maratha General Hari Panth, who will sign on your behalf . . . . you ?

ہری پنتھ : نہیں، میں نہیں۔

ولیسلی : پھر کون کریں گا ؟

ہری پنتھ : کون کرے گا یہ میں نہیں جانتا، لیکن اتنی بات ضرور ہے سر آرتھر ولیسلی، ہمارا شاسترخواہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو گیا ہو، وہاں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، مگر ہم لوگوں نے نظام بہادر کی طرح اتنی جلدی غلامی کے معاہدہ پر دستخط کرنا نہیں سیکھا۔

ولیسلی : very good، دیکھا جائے گا، آپ لوگ بھی آہستہ آہستہ سیکھ جائے گا، نظام بہادر عقلمند آدمی ہے۔ اس واسطے سیکھ لیا ہیں، آپ لوگوں کا عقل تھوڑا موٹا معلوم ہوتا۔

ہری پنتھ : صاحب !

ولیسلی : غصہ کرنے کا بات ناہی ہیں، ہم جانتا آپ تمام آدمی کو پانی پینا ہوئیں گا، مگر دو ایک آدمی تھوڑا گندہ کر کے پئیں گا، ہاہاہاہا !

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

پونا میں پیشوا کا محل، وہی جو پہلے باب کے دوسرے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ گول میز کے گرد کرسیوں پر نانا فرنویس، کرشنا بائی، سندھیا، بھونسلہ اور دوسرے سردار بیٹھے ہیں

نانا فرنویس: بڑی اچھی خبر ہے! بڑی اچھی خبر سنانے کے لیے میں نے آپ لوگوں کو بلایا ہے، اب انگریزوں کے ساتھ ہمارا جھگڑا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا!

سندھیا: واقعی! کیا اب پیشوا اور انگریزوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہ ہوگا؟

نانا فرنویس: صرف پیشوا اور انگریزوں ہی کے درمیان نہیں بلکہ مستقبل قریب میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور آپ لوگوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے.... اگر....

سندھیا: اگر؟

نانا فرنویس: اگر آپ نے میرا کہا مانا۔ آپ لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خوف سے اپنے دل میں انھیں اپنا آقا تسلیم کر لیا ہے، لیکن اب آپ لوگوں کو ان کے نئے معاہدہ پر اس تحریر کے ساتھ دستخط کرنا ہوگا کہ آج سے ہم اپنی آزادی کے تمام حقوق واپس لیتے ہیں، ہمارے آباواجداد نے جو مرتبہ قائم کیا تھا، اس کا خیال کرتے ہوئے ان کی قائم کی ہوئی گدّی پر بیٹھ کر، ہم غیر ملکی تاجر کمپنی کی مرضی کے مطابق، ان کے حکم کے ماتحت رہ کر راجہ کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اگر آپ لوگوں نے ایسا کیا تو پھر انگریزوں کے ساتھ ہونے والے تمام جھگڑے ہمیشہ ہمیشہ کیلیے ختم ہو جائیں گے۔

کرشنا بائی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں نانا فرنویس؟ نیا معاہدہ.....

نانا فرنویس: ہاں، ہری پنتھ ابھی ابھی حیدر آباد سے واپس آیا ہے، اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر کا تیار کیا ہوا معاہدہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

سندھیا: ہری پنتھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ ان لوگوں نے پھر نیا معاہدہ تیار کیا ہے؟

نانا فرنویس: صرف معاہدہ ہی تیار نہیں کیا ہے سندھیا مہاراج بلکہ اسی درمیان معاہدہ پر دستخط بھی ہو چکا ہے۔

کرشنا بائی: دستخط ہو چکا ہے، کس نے دستخط کیا ہے؟

نانا فرنویس: انگریزوں کے سب سے بڑے غلام نظام حیدر آباد نے۔

کرشنا بائی: نظام علی خاں نے! اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ اب حیدر آباد کی خودمختاری بھی ختم ہو گئی؟

سندھیا: نظام علی خاں کے علاوہ اور کن لوگوں نے دستخط کیا ہے نانا فرنویس؟

نانا فرنویس: اس کے علاوہ ابھی تک کسی نے بھی دستخط نہیں کیا ہے، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے ٹیپو سلطان کے پاس میسور بھی یہ معاہدہ بھیجا تھا۔

کرشنا بائی: ٹیپو سلطان نے اس کا کیا جواب دیا؟

نانا فرنویس: انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے پاس جو معاہدہ بھیجا تھا اس کے ساتھ ایک تلوار بھی تھی، ٹیپو سلطان نے ان دونوں میں سے تلوار اٹھالی اور فخر کے ساتھ سینہ تان کر جواب دیا کہ انگریزوں کے اشاروں پر بھیڑ بکریوں کی طرح دو دو سو سال تک زندہ رہنے کی نسبت میں شیروں کی طرح دو دن زندہ رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں، سلطان کے اس جواب کے

ساتھ ہی میسور کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک طبل جنگ بج اٹھا ہے ! اپنے وطن کی آزادی کی حفاظت کیلئے ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا اعلان کیا ہے اور آج پوری میسور ریاست میں ٹیپو کی کامیابی کے لیے مندروں اور مسجدوں میں ہندو مسلمان متحد اور یک آواز ہو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔

سندھیا : نانا فرنویس !

نانا فرنویس : آج یہ جنگ صرف ٹیپو سلطان کے خلاف نہیں لڑی جا رہی ہے بلکہ آپ سبھی لوگوں کے خلاف، ہندستان کی ہر آزاد ریاست کے خلاف لڑی جا رہی ہے، یا تو آپ لوگوں کو انگریزوں کی محکومی قبول کر کے معاہدہ پر دستخط کرنا ہوگا، ورنہ پھر انگریزوں کے خلاف آپ لوگوں کی جنگ لازمی ہے، اب آپ بتائیے سندھیا مہاراج، بھونسلہ راجہ اور مرہٹہ سردار، آپ لوگ کیا چاہتے ہیں ؟ انگریزوں کی غلامی یا آزادی کی حفاظت کے لیے سنگرام ؟

سندھیا : چھترپتی شیواجی کی دعاؤں سے جو بھی مرہٹہ قوم باقی ہے، وہ اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے جان کی بازی لگا دے گی نانا فرنویس، زندگی کی بازی ! مگر ہم لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اس نفرت انگیز معاہدہ پر دستخط نہیں کرے گا۔

سب مل کر : ہاں، یہ ٹھیک ہے، ہم میں سے کوئی بھی اس معاہدہ پر دستخط نہیں کرے گا۔

نانا فرنویس : کیا یہ آپ کا اٹل فیصلہ ہے ؟

سندھیا : ضرور، آزادی کی حفاظت کے لیے جس وقت بھی ضرورت پیش آئی، ہم لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف جنگ کرنے کو تیار ہیں۔

نانا فرنویس : اور اگر اس کی ضرورت ابھی اور اسی لمحہ ہو تو ؟

سندھیا : اسی وقت ؟

نانا فرنویس : ہاں، اسی وقت، ولیسلی صاحب نے کہا ہے کہ آپ لوگوں کو انگریز کا دیا ہوا پانی پینا ہی ہوگا، پینے سے پہلے ممکن ہے کوئی اسے گندہ یا گدلا کر دے، لیکن پھر بھی اسے وہی پانی پینا پڑے گا، انگریز سپہ سالار کی اس شیخی، اس سے بھی کیا آپ اندازہ نہیں کر سکتے سندھیا مہاراج ! آج یہی غلامی قبول کرنے کے لیے مہاراشٹر کے ہر دروازہ پہ دعوت دی جا رہی ہے۔

سندھیا : میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں نانا فرنویس کہ انگریزوں کی اس دعوت کا مناسب جواب دینے کے لیے ہم لوگ ہر وقت تیار ہیں۔

نانا فرنویس : اگر آپ لوگ واقعی تیار ہیں، اگر یہ آپ لوگوں کا فیصلہ ہے کہ اپنے وطن کی آزادی مرتے دم تک قائم رکھیں گے تو پھر آئیے ہم سب لوگ پیشوا، سندھیا، بھونسلہ اور مہاراشٹر کی دوسری تمام طاقتیں ایک ساتھ مل کر میسور کے والی ٹیپو سلطان کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی اور نظام شاہی فوج کے خلاف حملہ کر دیں، انھیں ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کر کے ہندستان کی آزادی کی حفاظت کریں، اپنے قوم و وطن کی شان اور اس کے مرتبہ کی حفاظت کریں۔

سندھیا : قوم کے وقار اور قوم کی شان کی حفاظت کے لیے مہاراشٹر کی طاقت کافی ہے، پھر اس کے لیے ہم لوگ ٹیپو سلطان کا ساتھ کیوں دیں؟

نانا فرنویس : اس لیے کہ ہم دونوں کی ایک ہی آرزو ہے، ایک ہی منزل ہے، میسور کی طاقت کی ہم اس لیے مدد کرنا چاہتے ہیں کہ ہم دونوں کا ایک ہی دشمن ہے اور ٹیپو سلطان ہندستان کی آزادی کی لگن میں ہم سب سے آگے ہے اس لیے وہی ہمارا قومی نیتا ہے۔

بھونسلہ : لیکن ہم ٹیپو سلطان کو اپنا قومی نیتا تسلیم نہیں کرتے۔

سندھیا : ٹیپو ہماری قوم کا دشمن ہے۔

کرشنا بائی : بھونسلہ راجہ! سندھیا مہاراج!

سندھیا : ہاں پیشوا جننی، ٹیپو سلطان آج مہاراشٹر کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، اس کی ان گنت فوج کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ کا باعث ہو سکتی ہے۔

بھونسلہ : انگریزوں کے خلاف ہونے والی اس جنگ میں اگر ٹیپو مارا جائے، تو ہم ایک بہت بڑے دشمن سے نجات پا سکتے ہیں۔

نانا فرنویس : تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ سبھی لوگ ٹیپو کی موت چاہتے ہیں، لیکن ٹیپو کی موت کے بعد اس ملک کی کیا حالت ہوگی، یہ بھی جانتے ہیں، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی اس زمین سے ایک مٹھی دھول بھی اٹھانے کا آپ کو حق حاصل نہ ہوگا، یاد رکھیے، اپنے ہی دیش کی مٹی یا دھول ہاتھ میں اٹھانے سے پہلے آپ کو آقا کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو سلام کرنا ہوگا۔

کرشنا بائی : سندھیا! بھونسلہ، آپ سبھوں سے میری درخواست ہے کہ اس جنگ سے علیٰحدہ رہ کر اپنے ملک کو تباہ نہ کریں، آپ سب اسے بچائیے۔

سندھیا : نہیں، نہیں، پیشوا جننی، ہم لوگ ٹیپو کو اپنا نیتا کبھی نہیں مان سکتے، کسی قیمت پر نہیں مان سکتے،

کرشنا بائی : سندھیا، سندھیا مہاراج!

بھونسلہ : صرف سندھیا ہی نہیں، ہم میں سے کوئی بھی ٹیپو کو اپنا نیتا ماننے کے لیے تیار نہیں، ہم لوگ یہ بھی نہیں چاہتے کہ پیشوا بھی اس کی کسی قسم کی مدد کریں۔

(پیشوا آتا ہے)

پیشوا : پیشوا کو آپ لوگ کس بات سے منع کرنا چاہتے ہیں بھونسلہ راجہ؟

بھونسلہ : قابلِ تعظیم پیشوا!

(سبھی جھک کر سلام کرتے ہیں)

ہم نہیں چاہتے کہ آپ ٹیپو سلطان کی کوئی مدد کریں۔

پیشوا : تو آپ مجھے ٹیپو سلطان کی مدد کرنے کی اجازت دینا نہیں چاہتے ؟ تو کیا میں انگریزوں کو اپنا آقا مان لوں کیا آپ لوگ بھی چاہتے ہیں ؟

سندھیا : نہیں، اگر انگریز پیشوا پر حملہ کرے گا تو ہم لوگ پیشوا کی عزت، وقار اور مرتبہ کی حفاظت کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے، ہمارے بازوؤں میں اتنی طاقت .....

پیشوا : (بات کاٹ کر) آپ لوگ، اپنی اپنی ریاستوں میں جاکر اپنی غریب اور کمزور جنتا پر اپنے بازوؤں کی طاقت آزمائیں، رنگ محلوں میں جاکر ہیچ اور خوشامدی لوگوں کے سامنے اپنی طاقت کا پرچار کریں شیخی بگھاریں، آپ جیسے بانکے لوگوں کی مدد سے اگر پیشوا کو اپنے وقار کی حفاظت کرنی پڑے تو اس سے پہلے ہی اس وقار کو مٹی میں ملا دینا بہتر ہے۔

سندھیا : پیشوا !

پیشوا : ٹیپو سلطان کا ساتھ دینے میں آپ لوگوں کی بے عزتی ہوگی ؟ جو لوگ اپنے وطن، اپنے ملک کی حفاظت نہیں کر سکتے وہ انسان نہیں جانور ہیں، مگر جو لوگ دیش کی حفاظت کرنے کا آخری موقع بھی یہ کہہ کر کھو دینا چاہتے ہیں کہ ہم ہندو ہیں اور ٹیپو سلطان مسلمان ہے وہ جانور ہی نہیں، درندے اور شیطان ہیں، آپ لوگوں میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں۔

سب مل کر : خبردار ! خبردار ! زبان قابو میں رکھیے پیشوا !

پیشوا : پیشوا کو خبردار کرنے سے پہلے خود ہوشیار ہو جاؤ بیوقوف راجو، غیر ملکی انگریز ہمارے دشمن ہیں، مگر تم لوگ ہمارے گھر بھیدی دشمن ہو، میں تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر قید خانے میں بند کر دوں گا۔ سپاہی ——

کرشنا بائی : پیشوا ! پیشوا !

نانا فرنویس : پیشوا ! یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں، ان کی اتنی بڑی بے عزتی .....

پیشوا : مہمان ہیں ؟ یہ لوگ مہمان ہیں ! (کچھ سوچ کر) اچھی بات ہے نانا فرنویس، تمہاری موجودگی میں پیشوا مہمانوں کی بے عزتی نہیں کر سکتا، جائیے آپ لوگ آزاد ہیں۔

(سبھی اٹھ کر چلے جاتے ہیں)

کرشنا بائی : نانا فرنویس، معلوم ہوتا ہے مہاراشٹر کے شکتی مان نیتا آج ہمیشہ کے لیے پیشوا کو چھوڑ کر چلے جا رہے، اگر ایسے میں انگریزوں نے حملہ کر دیا تو یہ لوگ ہرگز پیشوا کی مدد نہیں کریں گے۔

پیشوا : ڈرنے کی بات نہیں ہے ماں، انگریز ہماری ریاست پر حملہ نہیں کرے گا، اس سے پہلے ہی ہم لوگ انگریزوں پر حملہ کر دیں گے۔

کرشنا بائی : ہم لوگ ؟

پیشوا : ہاں، ٹیپو سلطان کے ساتھ مل کر۔

نانا فرنویس : ٹیپو کا ساتھ دو گے ؟ مگر میرا خیال ہے کہ سیناپتی ہری پنتھ ان ذلیل مرہٹہ نیتاؤں کا ساتھ دے گا، وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوگا۔

پیشوا : اس کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے نانا فرنویس، ہری پنتھ اور پرسورام بھاؤ الگ ہو جائیں، سندھیا، بھونسلہ اور ہلکار ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں پھر بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نانا فرنویس، ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے ماں، اب پیشوا باجی راؤ کا وارث ہندستان کی اس جنگ آزادی میں ننگی تلوار لے کر ٹیپو سلطان کا ساتھ دے گا۔

(پردہ)

تیسرا منظر

ٹیپو سلطان اپنے محل کے بڑے آہنی دروازہ کے سامنے کھڑا ہوا کچھ سوچ رہا ہے
اس کا دایاں ہاتھ نیام میں پڑی ہوئی شمشیر کے دستہ پر ہے اور بایاں ہاتھ پشت
پر لٹکایا ہوا ہے، اس کے چہرہ کا رنگ ہر لحہ متغیر ہو رہا ہے، تھوڑی دیر تک
اس کی یہی کیفیت رہتی ہے، پھر وہ چونک کر قلعہ کی طرف دیکھتا ہے۔

ٹیپو سلطان : (اپنے آپ سے) سید غفار، برہان الدین سبھی ابدی نیند سو چکے ہیں، تھوڑی دیر پہلے موسیو لالی بھی دشمنوں کی گولی کا نشانہ بن کر ساتھ چھوڑ چکا ہے، پھر بھی ٹیپو سلطان ابھی زندہ ہے، ٹیپو سلطان ابھی زندہ ہے۔

(روشنی بیگم گھبرائی ہوئی آتی ہے)

روشنی بیگم : عالی جاہ !

ٹیپو سلطان : غم نہ کرو روشنی بیگم، ٹیپو سلطان ابھی زندہ ہے۔

روشنی بیگم : جہاں پناہ ! میں نے سنا ہے آج صبح وہ پھر آئی تھی ؟

ٹیپو سلطان : کون ؟

روشنی بیگم : وہی جادوگرنی نجومی لڑکی !

ٹیپو سلطان : او، صوفیہ، ہاں، آئی تھی۔

روشنی بیگم : اس نے کہا ہے کہ آج کی جنگ کا نتیجہ ہم لوگوں کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

ٹیپو سلطان : تم سے کس نے کہا ؟ یہ بات تمھیں کیسے معلوم ہوئی ؟

روشنی بیگم : بُری خبر کی رفتار ہوا سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے جہاں پناہ، جسے ہزار کوشش کے باوجود دبایا نہیں جا سکتا، آج یہ خبر پورے قلعہ میں پھیل چکی ہے اور سبھوں کے دل میں ایک انجانا خوف سمایا ہوا ہے۔

ٹیپو سلطان : نہیں، روشنی بیگم خوف کھانے کی کوئی بات نہیں، میں نے اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے مندروں میں پوجا کہنے

اور سجدوں میں دعائیں مانگنے کا انتظام کر دیا ہے، میسور کے خزانہ کا منہ غریبوں اور محتاجوں کے لیے کھول دیا گیا ہے، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، جاؤ، تنہائی میں بیٹھ کر تم بھی اپنے شوہر کی کامیابی اور فتحمندی کے لیے خدا سے دعا کرو، میں جا رہا ہوں، قلعہ کے بڑے دروازہ پر قمرالدین خاں اکیلا ہے۔

(جانے لگتا ہے)

روئی بیگم : اعلیٰ حضرت!

(رُک جاتا ہے)

جنگ پر جانے سے پہلے کنیز کی ایک عرض سُنتے جائیے!

ٹیپو سلطان : بولو، تم کیا چاہتی ہو؟

روئی بیگم : آپ نے آج صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا، ذرا سی دیر بھی آرام نہیں کیا، آج دن بھر آپ فوجوں کو نقل و حرکت کا حکم دیتے رہے ہیں، ایسی حالت میں ابھی میں آپ کو یوں نہیں جانے دوں گی۔ تھوڑی دیر کے لیے محل کے اندر چلیے، بڑی دیر سے کھانا تیار رکھا ہوا ہے۔

ٹیپو سلطان : مجھے افسوس ہے روئی بیگم، میں ابھی محل کے اندر نہیں جا سکتا۔

روئی بیگم : جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان : اگر ایسا ہی ہے تو کھانا یہیں لے آؤ، تمہاری خاطر میں یہیں پر کھا لوں گا۔

(روئی بیگم چلی جاتی ہے)

(مسکراتا ہے) ٹیپو سلطان کا کھانا، ٹیپو سلطان کا آرام ......

(عقب میں شور و غل اور توپ کی آواز اُبھرتی ہے)

یہ کیا؟ قلعہ کی فصیل کے نیچے اچانک یہ شور و غل کیسا ہے؟ کیا دشمنوں نے قلعہ کا دروازہ توڑ دیا؟ کیا بات ہے آخر ہوا کیا ہے؟

(چلا جاتا ہے)

(اس کے جانے کے بعد تہور جنگ اور ایک انگریز سپہ سالار آتا ہے)

سپہ سالار : جنرل، چلیے ہم لوگ قلعہ کے اندر چلیں۔

تہور جنگ : نہیں، ابھی نہیں، قلعہ کی فصیل کا ابھی بہت تھوڑا سا حصہ ٹوٹا ہے، قمرالدین حملہ روکنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہے، جب تک انگریز اور نظام شاہی فوج اُسے دھکیل کر یہاں نہ آجائے۔ ہم دونوں کا جانا ٹھیک نہیں، ورنہ قید کر لیے جائیں گے۔

سپہ سالار : جنرل!

تہور جنگ : چھپ کر انتظار کرو، جب تک قلعہ کی دیوار ڈھے نہ جائے اور ہماری فوجوں کی بڑی تعداد قلعہ میں داخل نہ ہو جائے، اس وقت تک چھپ کر انتظار کرو (اشارہ کرکے) اُدھر دیکھو، کوئی آرہا ہے۔

سپہ سالار : (چونک کر) Who is this ?

تہور جنگ : سبحان اللہ، یہ دونوں تو ٹیپو سلطان کے لڑکے ہیں، دوسروں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اگر ہم دونوں انھیں گرفتار کریں تو بہت بڑا انعام ملے گا، کھسک جاؤ، ادھر چلے آؤ۔

(دونوں چھپ جاتے ہیں، شہزادہ معاذ الدین اور عبدالخالق آتے ہیں)

عبدالخالق : کہاں ہیں ؟ ابّا تو یہاں نہیں ہیں !

معاذالدین : امی نے تو کہا تھا کہ ابّا کو قلعہ سے آنے دو، ایک ساتھ کھاؤ گے، بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے بھیا (رو کر) ہم لوگ کب کھائیں گے ؟

عبدالخالق : بُری بات، مت روؤ معاذ الدین، ابّا کو آجانے دو، پھر ہم لوگ ایک ساتھ کھائیں گے، آؤ انھیں تلاش کریں۔

(تہور جنگ سامنے آتا ہے)

تہور جنگ : شہزادے میرے ساتھ آؤ، تم دونوں کا کھانا تیار ہے۔

عبدالخالق : تم کون ہو ؟

تہور جنگ : میں .....

معاذالدین : اس کی شکل اور اس باتوں سے نہیں پہچانتے بھائی جان ؟ یہ ہم لوگوں کا خانساماں یا باورچی ہو گا۔ اے غلام تمہارا کیا نام ہے ؟

تہور جنگ : میں تمہارا غلام نہیں ہوں بدقسمت شہزادے، میں نظام شاہی فوج کا سالار ہوں تہور جنگ !

معاذالدین : اچھا تو مذاق ہو رہا ہے ان کتنے بڑے دلاور جنگ ہو وہ ابھی معلوم ہو جاتا ہے، بھیا، یہ نالائق ہمیں لوگوں سے بن رہا ہے، اس کی پیٹھ پر گن کر دس کوڑے لگائیے، تاکہ اس کا مزاج ٹھکانے آجائے۔

تہور جنگ : خاموش رہو (عبدالخالق سے) تم شہزادہ عبدالخالق ہو ؟

عبدالخالق : ہاں — !

تہور جنگ : اور یہ کون ہے ؟

عبدالخالق : یہ میرا چھوٹا بھائی شہزادہ معاذالدین ہے، لیکن تمہیں کیا ؟ تم ہمارے قلعہ کے اندر کیسے چلے آئے ؟

تہور جنگ : ٹوٹے ہوئے دروازے سے، میرے پیچھے انگریز اور نظام شاہی فوج بھی قلعے میں داخل ہو رہی ہے اور تم دونوں کو قید کرنے آرہی ہے۔

عبدالخالق : ہم دونوں کو قید کرنے ؟

تہور جنگ : ہاں، مگر سنو، ڈرنے کی کوئی بات نہیں، گورنر صاحب نے کہا ہے، تم دونوں کو کلکتہ کے ایک مقام ٹالی گنج کے نواب بنا دیئے جاؤ گے اور وہاں تمہیں ماہانہ وظیفہ ملے گا۔

عبدالخالق : انگریزوں کا وظیفہ

تہور جنگ : ہاں، وظیفہ ملے گا، بہت آرام سے رہو گے، آؤ شہزادے، میرے ساتھ آؤ۔

عبدالخالق : لیکن ہم دونوں کو ساتھ لے کر تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟

تہور جنگ : تم دونوں کو گرفتار کر لینے سے انگریزی حکومت مجھے بہت بڑا انعام دے گی۔

عبدالخالق : میرے ابا ٹیپو سلطان ابھی زندہ ہیں، تم ان کے لڑکوں کو انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتے ہو! اس گستاخی کی تمہیں کیا سزا ملے گی، جانتے ہو؟

تہور جنگ : مجھے انعام دینے کے لیے ٹیپو سلطان کے پاس کتنی طاقت ہے، میں دیکھ لوں گا (فرنگی سالار سے) انہیں ہتھکڑی پہنا کر لے چلو۔

(فرنگی سالار انہیں پکڑنے کو آگے بڑھتا ہے)

عبدالخالق : خبردار، شیطان، مردود خبردار!

تہور جنگ : پکڑ لو!

معاذالدین : (سہم کر) بھائی جان!

عبدالخالق : تم مجھے قید کرو گے؟ بے ایمان، نفر، اس سے پہلے ٹیپو سلطان کے لڑکے کے ہاتھ سے اپنا انعام لے لے،

(جوتا پھینک کر مارتا ہے)

تہور جنگ : جوتا! بدتمیز سنپولیے۔ میں نے سوچا تھا، تجھے زندہ گرفتار کروں گا۔ لیکن تیری یہ ہمت! میں ابھی تجھے اس بدتمیزی کا مزہ چکھاتا ہوں۔

(تہور جنگ تلوار لے کر آگے بڑھتا ہے، اتنے میں پیشوا آجاتا ہے)

پیشوا : اس سے پہلے میں تمہیں مزہ چکھاتا ہوں تہور جنگ!

(پیشوا پستول چلاتا ہے تہور جنگ زمین پر گر پڑتا ہے اور خاک و خون میں تڑپنے لگتا ہے، فرنگی سپہ سالار بھاگ جاتا ہے، اتنے میں ٹیپو سلطان آجاتا ہے)

ٹیپو سلطان : تہور جنگ، تہور جنگ، وہ غدار وطن، ننگ قوم بے ایمان کہاں ہے؟

عبدالخالق : وہ ہم لوگوں کو قتل کرنے آیا تھا، وہ دیکھیے زمین پر پڑا ہوا ہے۔

ٹیپو سلطان : یہ کیا! یہ شیطان تو مر چکا ہے، اس کو کس نے قتل کیا، کس نے؟

پیشوا : (سامنے آکر) میں نے، اپنے مسلمان بھائی کی جان بچانے کے لیے میں نے اسے قتل کیا ہے، مادھو راؤ نارائن نے!

ٹیپو سلطان : مادھو راؤ نارائن! مہاراشٹر کا عظیم پیشوا، میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں، حیرت ہے، مہاراشٹر کا عظیم پیشوا،

ہندو خاندان کے تاج، پیشوا باجی راؤ کا وارث اپنے مسلمان بھائی کے مکان! حیرت ہے تم نے ہندو برہمن ہو کر ایک ننگ قوم مسلمان کے ہاتھوں سے میرے بچوں کی جان بچائی!

پیشوا مادھو نارائن، آج قسمت کے ستائے ہوئے ٹیپو سلطان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو عقیدت کے طور پر پیش کر کے تمہاری عزت افزائی کرے۔

پیشوا : عزت افزائی کی ضرورت نہیں ہے سلطان اعظم! ہندوستان کی اس جنگ آزادی میں اتنے دنوں تک آپ کا ساتھ نہ دے کر میں نے جو گناہ عظیم کیا ہے، آج اسی کا پراسچت کرنے آیا ہوں مگر یہاں آ کر جب میرے سپہ سالار ہری پنتھ نے غداری کی اور تمام فوجوں کو لے کر دشمن کے ساتھ مل گیا تو میں اکیلا ہی آپ کے پاس چلا آیا۔

ٹیپو سلطان : پیشوا، جب تمہاری فوج تم سے غداری کر چکی ہے تو پھر اس سیاہ گھڑی میں اکیلے میرے پاس رہ کر کیا کرو گے؟

پیشوا : جب تک میری زندگی ہے، جنگ کروں گا، اتنی ہی دیر میں میری دوسری فوج کے ساتھ جنوبی مشرقی دروازے سے خود نانا فرنویس آ جائیں گے۔

ٹیپو سلطان : نانا فرنویس آ رہے ہیں؟ تو پھر جاؤ پیشوا، اس راستے سے بری پٹائل پل کو پار کر کے نانا فرنویس کے پاس چلے جاؤ۔

پیشوا : سلطان!

ٹیپو سلطان : تم سمجھتے کیوں نہیں، دشمنوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، میرے سر پر سیکڑوں شمشیریں لٹک رہی ہیں، اس مصیبت کی گھڑی میں ایسے خطرناک موقع پر میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا، میں تو مر ہی رہا ہوں، لیکن میری وجہ سے تم جیسی ایک قیمتی جان مفت میں برباد ہو گی، یہ میں نہیں ہونے دوں گا، جاؤ، پیشوا، تم جاؤ، نانا فرنویس کے پاس چلے جاؤ، جاؤ۔

(پیشوا چلا جاتا ہے اور رونی بیگم کھانا لے کر آتی ہے)

رونی بیگم : اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان : کیا بات ہے رونی بیگم؟

رونی بیگم : آپ کا کھانا!

ٹیپو سلطان : کھانا؟

رونی بیگم : آپ کے دونوں بچے بھی ابھی تک بھوکے ہیں، وہ دونوں آپ کے ساتھ کھانا چاہتے ہیں۔

ٹیپو سلطان : ان دونوں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا؟ اچھا تو پھر لے آؤ۔

(ٹیپو دونوں لڑکوں کے ساتھ کھانے بیٹھتا ہے، ٹھیک اسی وقت توپ کی آواز سنائی دیتی ہے)

(چونک کر) کیا ہوا! یہ خطرناک آواز کیسی تھی!

(سپاہی آتا ہے)

سپاہی : دشمنوں نے توپ داغ کر محل کا دروازہ توڑ دیا ہے جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان: ایں ؟ محل کا دروازہ ٹوٹ گیا!

(کھانا چھوڑ دیتا ہے اور اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

روشنی بیگم: ابھی نہ اٹھئے گا اعلیٰ حضرت! ابھی نہ اٹھئے گا!

ٹیپو سلطان: اب میں نہیں کھا سکتا روشنی بیگم، انھوں نے مجھے کھانے کی مہلت بھی نہیں دی، کیا تم دشمنوں کے نعرے نہیں سن رہی، جو وہ فتح کی خوشی میں لگا رہے ہیں، جاؤ، جتنی جلدی ممکن ہو سکے اپنے دونوں بچوں کو لیکر یہاں سے بھاگ جاؤ، جاؤ، دیر نہ کرو۔

(روشنی بیگم کو زبردستی دروازے کے باہر کر دیتا ہے)

کوئی ہے! (غلام آتا ہے)

میرا حمائل شریف لاؤ! (غلام چلا جاتا ہے اور حمائل شریف لیکر آتا ہے)

تم آ گئے، آؤ، آؤ میرے بھائی، حمائل شریف مجھے دے دو، دشمن محل میں داخل ہو چکے ہیں تو کیا ہوا، ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں ابھی زندہ ہوں۔

(حمائل شریف گلے میں ڈال لیتا ہے اتنے میں قمر الدین آتا ہے)

قمر الدین: حضرت! اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان: کیا بات ہے قمر الدین خان!

قمر الدین: اب کوئی امید نہیں ہے جہاں پناہ! قطار در قطار دشمنوں کی فوج محل میں داخل ہو رہی ہے، آپ بھاگ جائیے، یہاں سے بھاگ جائیے اعلیٰ حضرت!

ٹیپو سلطان: (مسکراتا ہے) میں بھاگ جاؤں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا ہے قمر الدین خان، میں اپنے وطن کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں، نہیں، اگر جان ہی دینی ہے تو جس زمین پر پیدا ہوا ہوں اسی پر اپنی جان بھی دوں گا۔

قمر الدین: جہاں پناہ!

ٹیپو سلطان: تم جاؤ قمر الدین، پری پٹنائل پل کے رستے پیشوا اور نانا فرنویس آتے ہونگے، ذرا جا کر دیکھو تو وہ لوگ کتنی دور رہ گئے ہیں۔

(قمر الدین چلا جاتا ہے)

اب مجھے چلنا چاہئے، اس پاک حمائل شریف کو گلے میں ڈال کر میں وطن کی راہ میں شہید ہو سکتا ہوں۔

(ٹیپو سلطان چلنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے اتنے میں انگریز سپہ سالار آتا ہے اور ٹیپو سلطان پر گولی چلاتا ہے، ٹیپو زخمی ہو کر گر پڑتا ہے، فرنگی سپہ سالار کی نظر ٹیپو کی کمر میں لٹکے ہوئے خنجر پر پڑتی ہے، خنجر کے دستہ میں جڑے ہوئے ہیرے کو دیکھ کر فرنگی لالچ میں آ جاتا ہے۔ وہ ٹیپو کے قریب پہنچ کر اس کی کمر سے چھرا نکال لینا چاہتا ہے)

فرنگی: AH! WHAT A BEATIFUL DIAMOND.......!

(فرنگی خنجر نکال لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے، اتنے میں ٹیپو سلطان اٹھ کر اس پر تلوار سے

حملہ کرتا ہے، فرنگی زخمی ہو کر گرتا ہے اور غضبناک ہو کر دوبارہ گولی چلاتا ہے اور ٹیپو
دوبارہ زمین پر گر پڑتا ہے)

ٹیپو سلطان: (کراہتے ہوئے) آہ! نہیں کر سکا، میں اپنے وطن کی حفاظت نہیں کر سکا، مگر میں کیا کرتا، کیا کر سکتا تھا جب کسی نے بھی میرا ساتھ نہ دیا تو میں کیا کرتا۔

(قمرالدین، نانا فرنویس اور پیشوا آتے ہیں)

نانا فرنویس: ہم آگئے سلطان، ہم آپکا ساتھ دینے کو آگئے، بیدار اور جیالے مرہٹوں کی بہت بڑی فوج لے کر۔۔۔

(ٹیپو سلطان کو زخمی دیکھ کر یکایک خاموش ہو جاتا ہے)

یہ کیا سلطان عالی! سلطان!

(ٹیپو کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر ٹکا دیتا ہے)

ٹیپو سلطان: تم آگئے، تم آگئے بھائی، اپنے مسلمان بھائی کا ساتھ دینے آگئے میرے دوست، لیکن جس وقت مجھے یہ خوشی مل رہی ہے، جس وقت ہندوؤں کے سورج کی روشنی کا سیلاب دیکھ رہا ہوں، اس وقت میسور کی قسمت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے میرے بھائی!

نانا فرنویس: سلطان! سلطان معظم!

ٹیپو سلطان: میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے، میں جا رہا ہوں، تم لوگوں سے رخصت ہو رہا ہوں میرے بھائی، اپنے وطن کو مسلمانوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، جاتے وقت میں تم لوگوں کو اپنی آخری آرزو بتاتا ہوں، اُسے پورا کرنا، میں جو کچھ نہ کر سکا وہ تم لوگ ضرور کر سکو گے، تم لوگ میرے وطن کی حفاظت کرنا۔

نانا فرنویس: جس کی حفاظت ٹیپو سلطان جیسا بہادر انسان نہ کر سکا، اس کی حفاظت ہم کیسے کر سکتے ہیں، کس طاقت سے کر سکتے ہیں بتائیے سلطان، وہ کون سا منتر ہے جس سے ہم اس دیش کو آزاد کرائیں؟

ٹیپو سلطان: وہ منتر ہندو مسلمانوں کا اتحاد ہے اس کام کو اکیلے ہندو بھی نہیں کر سکتے، مسلمان بھی نہیں کر سکتے، یہ تیس کروڑ ہندو مسلمانوں کا وطن ہے۔ دونوں مل کر اس کی حفاظت کریں گے۔ میں ان تیس کروڑ ہندو مسلمانوں کی بیداری، اتحاد اور جدوجہد دیکھنے کے لیے شاید ایک بار پھر اس دنیا میں آؤں، پھر اسی سرزمین میں جنم لوں اور اس ملک کی مٹی کو مادرِ وطن کہہ کر سلام کروں۔ لیکن آج میں جا رہا ہوں، تم لوگوں سے رخصت ہو رہا ہوں۔

(نانا فرنویس کے سینے پر رکھا ہوا ٹیپو سلطان کا سر ایک طرف
ڈھلک جاتا ہے، ساتھ ہی غمناک موسیقی بجنے لگتی ہے
اور افق پر سورج غروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے)

(پردہ)

سورج بھی تماشائی

انور کے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان کا فن بھی —— روز بروز ترقی کرتا مگر اس مجموعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں یہی ہے کہ ہر فن کار کی ابتدائی چیزیں ہی بعد کی تخلیقات سے بہتر ہوتی ہیں —— انور کا شمار اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا انداز کچھ الگ سا ہے۔ ان کے افسانوں میں افسانویت سے زیادہ ڈرامائیت ہوتی ہے۔ اسے چاہیے آپ خوبی کہیں، چاہے نقص، بہرحال ان کے افسانے کتابی پن دینے والی فنی خوبیوں سے پاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری بدمزا نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی افسانہ نگار ہی کی طرح مزے لیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کہیں کہیں بلندیوں کا سا کھوکھلا پن بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے متعدد افسانوں میں بجائے اس کے کہ کہانی خود بخود چلے، وہ کہانی کو ایسے واقعوں سے چلاتے ہیں —" اس کے بعد یہ ہوتا ہے —" "اب میں آپ کو وہ قصہ سناتا ہوں" — وغیرہ وغیرہ۔ زبان کی طرف بھی یہ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ بہرحال جو کچھ یہ کہنا چاہتے ہیں وہ اچھے سے انداز میں کہہ تو لیتے ہیں۔ اگر یہ کچھ زبان اور کچھ افسانے کے فن کا یہ قدرے ضرورت بھی خیال رکھتے تو آج ان کے افسانے اس سے زیادہ مقبول ہوتے —— ان کے کردار بلاوجہ انگریزی بولتے ہیں۔ اس کی وجہ خود افسانہ نگار ہیں اس لیے کہ وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ — آج کل جب کہ افسانہ نگار سستا رہے ہوں اور اس صنفِ ادب ہی سے بے توجہی سی برت رہے ہوں۔ ایسے ماحول کا یہ مجموعہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔

فصیلِ شب

اردو ادب میں ڈراما ایک یتیم سی صنفِ ادب بن کر رہ گیا ہے کوئی اس کا والی وارث ہی نہیں۔ ہمارے ہاں نہ تو اچھے ڈرامے لکھے جاتے ہیں اور نہ ہی ڈراموں کو عملی صورت میں پیش کرنے کا کوئی زیادہ رواج ہے۔ لے دے کے ایک ریڈیو ہی ہے جہاں سے کبھی کبھار اتفاق ہی سے اچھے ڈرامے نشر ہو جائیں تو ہو جائیں —— اس صنف سے عوام کی بے توجہی بالکل حق بجانب ہے اس لیے کہ اچھے ڈرامے لکھنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ اگر آج بھی چند ایک اچھے ڈراما نویس سامنے آ جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس صنفِ ادب کو عروج حاصل نہ ہو —— میرزا ادیب ایک ایسے "پاگل" ہیں جنھوں نے زیادہ تر اپنی زندگی کا مقصد ڈراما نویسی ہی کو بنا لیا ہے۔ یہ ڈراموں کی متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے اوپر ڈرامے کو اس حد تک طاری کر لیا ہے کہ مجھے جب بھی میرزا جی نظر آتے ہیں تو فوراً میرے ذہن میں کوئی ڈراما ہی آ جاتا ہے یعنی ڈراما اور میرزا جی ایک ہی چیز بن گئے ہیں۔ اگر اس حد تک اس فن سے پیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھے ڈرامے نہ لکھے جائیں اور عوام ان سے دلچسپی نہ لیں —— میرزا جی کے ڈراموں میں یہ خوبی ہے کہ ان میں خود مصنف نہیں بولتا بلکہ کردار ہی اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ خوبصورت مکالمے لکھ لینا اور بات ہے مگر خوبصورت ڈرامے لکھنا اور بات، میرزا جی خوبصورت مکالمے نہیں لکھتے، خوبصورت ڈرامے لکھتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں جہاں سماجی شعور اور ان کی مشکلات کے تانے بانے ملتے ہیں وہاں سیاسی شعور کی مثال "جمیلہ" ایسے ڈرامے بھی ہیں اور "آقائے ولی نعمت" ایسے ڈرامے بھی جس میں شاہوں کی مجبوریاں اور ذہنی آویزشیں ملتی ہیں —— غرض اس کتاب کے موضوعات متنوع ہیں جس میں انسانی دکھ درد، سیاسی شعور اور امیرانہ چونچلے سبھی کچھ ملتا ہے اور وہ بھی فن کارانہ انداز میں —— یہ دونوں کتابیں رائٹرز گلڈ نے چھاپی ہیں۔ ان کی علی الترتیب قیمت ساڑھے پانچ روپے اور چار روپے ہے۔

رائٹرز گلڈ پر جہاں اور کئی ذمہ داریاں ہیں وہاں ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ جہاں وہ موجودہ زندہ ادیبوں کی اچھی کتابیں چھاپے وہاں مرحوم ادیبوں کی نہ مرنے والی کتابیں بھی چھاپے اور اپنے اشاعتی پروگرام کو ایک عام سے پبلشر کی سطح پر نہ لے آئے تاکہ اسے اس اعلان کی ضرورت نہ پڑے —— کہ "ہمارا پبلشنگ کا شعبہ ناکام ہو گیا ہے۔"

ذکرِ غم ۱۹۶۰ء

مشاہیر کی وفات سے متاثر ہو کر جہاں رسائل نے خاص نمبر شائع کیے وہاں قطعاتِ تاریخ کے مجموعے بھی بطور یادگار شائع کیے گئے۔ نفیس لکھنوی کی وفات پر "معیار" لکھنؤ نے "گنجینۂ حزن و ملال" کے عنوان سے دو حصّے شائع کیے جس کے پہلے حصّے میں قطعاتِ تاریخ فارسی اور دوسرے حصّے میں قطعاتِ تاریخ اردو ہیں۔ تاج الشعراء شاطرؔ آنجہانی کی وفات پر مسّل صاحب نے یادگارِ شاطر کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ "شاہدِ غم" کے نام سے جناب مائلؔ دہلوی کی وفات پر ایک تاریخی مجموعہ شائع کیا گیا۔ اسی طرح حال ہی میں "ذکرِ غم" حضرت انور علی شادؔ کی وفات حسرت آیات سے متاثر ہو کر مکتبۂ اردو کراچی نے ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ "ذکرِ غم" اس کتابچے کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۹۶۰ عدد برآمد ہوتے ہیں۔

یہ مجموعہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں "حقیقت احساس پیشکش" کے عنوان سے مکتبۂ اردو کراچی کے اغراض و مقاصد بتلائے گئے ہیں۔ اغراض و مقاصد کی شق ۵ کے تحت حضرت شادؔ جے پوری مرحوم کی تاریخ گوئی سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے مذکورہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔ دوسرا باب "ترویج فنِ تاریخ" (۱۹۶۰ء) کا عنوان لیے ہوئے ہے۔ یہ مقالہ صبا متھراوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے تاریخ کی تعریف، تاریخ محفوظ کرنے کے ذرائع، فنِ جمل، ابجد کے اصطلاح، جملِ صغیر، جملِ کبیر، تاریخ صوری و معنوی، تعمیۂ داخلی، تعمیۂ خارجی اور تاریخ کے صنائع و بدائع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس مقالے کی ترتیب میں چونکہ انھوں نے غرایب الجمل سے زیادہ استفادہ کیا ہے اس لیے اس کے حوالہ جات جابجا مرقوم ہیں۔ دوسری فنِ تاریخ گوئی کی کتابیں بھی ان کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ یہ مقالہ بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے جو مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ تیسرے باب میں حضرت شادؔ مرحوم کی زندگی کے حالات لکھے گئے ہیں جس کا عنوان "روداد حیات سید انور علی شادؔ" ہے۔ یہ حالات سیّد خورشید علی مہر جے پوری کے مختصر لیکن جامع طور پر پیش کیے ہیں جس سے شادؔ مرحوم کے سوانح حیات، سیرت و کردار اور خاص کر ان کی تاریخ گوئی و ادبی خدمات کا نہایت قابلیت سے تذکرہ کیا ہے۔ چوتھے باب میں حضرت شادؔ کے متعلق مشاہیرِ ملک کے تعزیتی خطوط کی نقلیں درج ہیں۔ پانچویں باب کا نام "طلسمِ حضرت انور علی شادؔ" ہے۔ اس میں حضرت شادؔ کے فنی کمالات کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ حضرت شادؔ کا کچھ تاریخی کلام بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام اس باکمال مورخ کے فنی کمالات سے پوری طرح روشناس ہو سکیں۔ چھٹے باب میں مختلف شعرائے کرام کے قطعاتِ تاریخ مندرج ہیں۔ اس باب کا عنوان "مجموعی قطعاتِ تاریخ" ہے۔ اس کی ترتیب میں صبا متھراوی، افضل فرولوی، صبا جے پوری، شاغل عثمانی، آسی واصفی، درد کاکوروی، رضا لکھنوی، منظر صدیقی اکبرآبادی، عشرت جلالی، غم مچھلی شہری، فاضل زیدی، منظر ناظر، مہر نقوی جے پوری، رئیس امروہوی، شرف جورجوی، شائق اکبرآبادی، خوشدل، کمال، جلیل واسطی، نیر فاروقی، شوکت، طالب اجمیری، شمیم صبائی نے حصّہ لیا ہے اور بعض تاریخیں فنِ تاریخ گوئی کی مشکل ترین اقسام میں سے ہیں اور مورخین نے ان کو پیش کرنے میں جو محنت کی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔

فنِ تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ رسالہ بڑے کام کا ہے۔ اس کی قیمت پچھتر پیسے ہے اور ناشر ہے اس کا محفل مکتبۂ اردو کراچی۔

(ک۔م)

ہماری کتابیں

رات، چور اور چاند
آج تک اُردو میں کل تین چار ہی قابلِ ذکر ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں اب جاکر ایک اور سِکھ کے ناول کا اضافہ ہوا ہے جسے بلونت سنگھ نے لکھا ہے۔ یہ ناول قسط وار نقوش میں شائع ہوتا رہا ہے جس کی دھوم مچی ہوئی ہے اس لیے کہ اس میں بلونت سنگھ کا فن عروج پر ہے۔ جزویات نگاری بلونت سنگھ پر ختم ہے۔ پنجاب کی زندگی کا بھرپور نقشہ جیسے بلونت سنگھ نے پیش کیا ہے وہ بھی انھی کا حصّہ ہے۔

جس ناول کی عرصے سے مانگ تھی وہ اب چھپ گیا ہے۔ قیمت سات روپے۔

مٹی کی مونا لیزا
جتنے خوبصورت افسانے اے حمید نے لکھے ہیں کم کسی نے لکھے ہوں گے ــــ ساری ہی رومانی فضا، سارے ہی رومانوی کردار ـــ یہ خاصہ صرف انھی کے افسانوں میں ملے گا ـــ مٹی کی مونا لیزا' اے حمید کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا ایک ایک افسانہ دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ لکھا گیا ہے اور دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

قیمت چار روپے

سورج نہیں نکلا
" دھوپ اور شگوفے " کی رومانوی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے' اے حمید کا نیا ناول 'سورج نہیں نکلا' دھوپ سے زیادہ روشن، شگوفے سے زیادہ نمکیلا' جس کی ہر سطر میں گلاب کی خوشبو ہے اور کانٹوں کی چبھن۔ ایک دلگداز رومانوی داستان ۔ بہترین چھپائی ـــ دیدہ زیب سرورق ـــ قیمت چار روپے۔

غیرتِ بہارستان
امیر مینائی کے اس غیر مطبوعہ دیوان کا نام ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا تھا اب خالد مینائی نے بڑی تلاش سے اس کا کچھ حصّہ دوبارہ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں امیر مینائی کے حالات، شاعری کے محاسن اور کلام کا بہترین انتخاب بھی ہے ـــ ایسا انتخاب جس کے متعلق امیر نے خود کہا ہے ؎

وہی رہ جاتے ہیں زبانوں پر
شعر جو انتخاب ہوتے ہیں

قیمت ۳/۵۰

من آنم
محمد طفیل نے فراقؔ گورکھپوری کے وہ تمام خطوط یکجا کر دیے ہیں جو انھوں نے مدیرِ نقوش کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط میں ایک بڑے شاعر کا خود اپنی شخصیت کے بارے میں بڑے کام کا مواد ملتا ہے۔ فراقؔ کو پتہ نہ تھا کہ یہ خط چھپیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ وہ ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں جو شاید عام حالات میں نہ کہہ سکتے ـــ غالب اور ابوالکلام کے خطوں کی اپنی شان ہے مگر ان خطوں میں جو عالمانہ شان ہے وہ انھی کا حصہ ہے اور فراقؔ کا۔

قیمت چار روپے

طلوع

یقین کیجیے کہ اب کے کچھ بھی لکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اپنے آپ کو آمادہ بھی کیا مگر دل یہی کہتا رہا۔ چھوڑو میاں، کچھ کہہ کے کیا کرو گے۔ تمھاری سنتا کون ہے!

مجھے کسی سے گلہ نہیں۔ اس لیے کہ میں بھی کسی کی نہیں سنتا۔ مگر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ کو بھی سن لینی چاہئیں اور مجھے بھی۔

میرا ارادہ تھا کہ میں نقوش کے سلسلے میں کچھ نئے تجربات کرتا اور آپ میرا ساتھ دیتے۔

میں نے ایک تجربہ لاہور نمبر کی صورت میں کیا۔ مگر آپ نے میرا ساتھ تو دیا مگر کچھ بے دلی کے ساتھ۔

ہمارے دوسرے نمبروں کے تو کئی کئی ایڈیشن نکلے مگر اس کا پہلا ایڈیشن ہی میری تجرباتی حس کو شرمندہ کیے دے رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں قصور میرا ہے یا آپ کا؟ — جہاں تک اس نمبر کی اہمیت کا تعلق ہے۔ یہ نمبر نقوش کے پہلے نمبروں سے زیادہ دنوں تک جیے گا۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ آپ نے کیوں میرے جذبات کا ساتھ نہیں دیا؟

"قیمت زیادہ ہے صاحب!"

"ابھی یہ بھی کوئی موضوع ہے!"

مجھے آپ کی ایسی شکایتوں کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ اس کے باوجود اس "حماقت" کا مرتکب ہوا۔ میری صحت اور جیب اگر مجھے اس سے بھی زیادہ حماقت کی اجازت دیتی تو میں آپ کو اس سے [illegible] [illegible] کر لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لیے کہ اس نمبر کے سلسلے میں ابھی میرا ارمان پورا نہیں ہوا۔ [illegible] تک آپ کے جذبات کا خیال رکھا تھا۔ یہ پہلا موقع آیا تھا کہ آپ بھی میرے جذبات [illegible] کیا۔ پھر میری آپ کی دوستی کیا ہوئی؟ — باقی رہا میری تجرباتی حس اب وہ مردہ تھا۔ احساس کی لاش [illegible] نہیں بنتا تھا۔ میرے لیے تو اس عمر میں بھی سوا تین [illegible] ہجوم تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے آدمی ہسپتال [illegible] کیا — [illegible] کے اوراق میں اپنا نام [illegible] جوق لوگ اُس باغی کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے [illegible] [illegible] میں بھی تاریں بھیجی جا چکی تھیں اللہ [illegible] سنا تھا کہ وہ [illegible]

محمد طفیل

بات چیت

پچھلے دنوں انجمن ادبی رسائل نے میری مجبوریوں کا کچھ بھی اندازہ نہ کرتے ہوئے مجھ پہ یہ ستم ڈھایا کہ اس کی چوتھی سالانہ کانفرنس کا سارا بار مجھ پہ ڈال دیا۔ میں نے اپنی طرف سے بڑے پینترے بدلے۔ مگر تھا اناڑی، اس لیے بات نہ بنی۔ دوستوں کے خلوص کی زد میں آنا ہی پڑا ۔۔۔ پھر وہ دن بھی آئے کہ کراچی سے مندوبین آرہے ہیں۔ کوئٹہ سے آرہے ہیں۔ ڈھاکہ سے آرہے ہیں۔ غرض خوب ہنگامہ رہا۔ جلسے ہوئے، مقالات ہوئے، مشاعرہ ہوا، ڈراما ہوا، الیکشن ہوا ۔۔۔ ایک تو اتنے لمبے چوڑے پروگرام کی تکمیل، پھر اس کے لیے روپے کا حصول، ایک مسئلہ تو تھا ۔۔۔ بہرحال احباب کے تعاون سے عزت رہ گئی۔ مگر انعام یہ ملا کہ انجمن کا نائب صدر بننا پڑا۔ عہدوں کا مل جانا یا حیلے حوالوں سے کسی عہدے کا حاصل کر لینا۔ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرے۔

انجمن ادبی رسائل کیا ہے؟ یہ سارے پاکستان کے مدیرانِ رسائل اور مالکان کی ایک تنظیم ہے جس نے ماضی میں تو کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ مگر یہ تنظیم بڑی مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے تمام ممبران کے پاس اپنی باتیں کہنے اور منوانے کے لیے پرچے ہیں۔ حکومتِ وقت بھی ہماری اہمیت کا احساس رکھتی ہے۔ اخبارات نے بھی ہمیشہ حوصلہ افزا اڈیٹوریل لکھے۔ ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر کچھ ٹھوس بنیادوں پر ملک و ملت کی خدمت کر گزریں۔

○ کچھ دن ہوئے کہ رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے بھی انتخابات ہوئے۔ خوب زور شور رہا۔ ادیبوں نے اس مسئلے کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیا۔ جس طرح باقاعدہ قسم کے سیاست دان الیکشن لڑتے ہیں۔ بالکل وہی سماں تھا۔ شہر بہ شہر گھوما جا رہا ہے ووٹ مانگے جا رہے ہیں، گٹھ جوڑ ہو رہے ہیں۔ بزرگ ادیب بھی خوردوں کے لیے میدان میں نکل آئے ۔۔۔ ادیب جو کل تک کچھ بے نیاز سے، اور کچھ تساہل پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ آج بیدار ہو رہے ہیں۔ اپنے حقوق کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔

انتخابی ڈھانچہ یہ تھا۔ ۴۲ اُمیدوار تھے اور اُن میں صرف ۸ منتخب ہونا تھے۔ کل ۔

۸۱۴ ممبران نے حقِ رائے دہندگی استعمال کیا ۔۔۔ بیالیس امیدواروں میں ایک سو ۳/۲
۲۰۷ ووٹ مجھے ملے۔ یہ عزت جو ادیبوں نے مجھے بخشی اس کے لیے احبار کل نے مدیرِ نقوش کے نام لکھے تھے۔ ان
دوست یہ ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید فارغ، نظمیں بڑے کام کا مواد ملتا ہے۔ فراق کو پتہ نہ تھا کہ یہ
۔۔۔ دیکھ لیا آپ نے اب ادیب بھی لیڈر بنتے جا رہے ہیں۔ مگر ساتھ وہ ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں جو شاید عام حالات میں
ہمارا نصب العین خدمت اور صرف خدمت ہونا چاہیے۔ ان خطوں میں جو عالمانہ شان ہے وہ انہی کا حصہ ہے اور صرف انہی کا۔

قیمت چار روپے

سرتاج

کرشن چندر

ایک روز خبر آئی کہ فجا ڈاکو مارا گیا ہے اور پولیس والے اُس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال میں لا رہے ہیں۔
فجے نے ایک عرصے سے ریاست کی سرحدی تحصیل فتح گڑھ میں بغاوت پھیلا رکھی تھی اور راجہ جی نے اس کی لوٹ مار سے تنگ آ کر اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی شخص فجا کا سر کاٹ کر اُن کے دربار میں پیش کرے گا اُسے دس ہزار روپیہ نقد، خلعت اور جاگیر انعام میں دی جائے گی۔ فتح گڑھ کا سردار موسیٰ خان ایک عرصے سے فجے کی تاک میں تھا۔ اور چاروں طرف اس نے اپنے آدمی اس کام کے لیے پھیلا رکھے تھے۔ ایک روز آدھی رات کے قریب جب فجا فتح گڑھ کے قلعے کے نیچے سردار موسیٰ خاں کے گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا۔ موسیٰ خاں نے اس کی پیٹھ میں چھ گولیاں مار کر اُسے ہلاک کر دیا۔ اور اب وہ فجے کی لاش کو اٹھوا کر اپنے حمایتیوں اور شناختی گواہوں کے ہمراہ صدر مقام پر آیا تھا۔ تاکہ خلعت، جاگیر اور دس ہزار روپیہ نقد حاصل کر سکے۔

سردار موسیٰ خان اپنی کارکردگی پر بہت خوش تھا۔ کیونکہ فجے نے جس کا اصلی نام فیض محمد خان تھا، ایک عرصے سے فتح گڑھ اور دوہالہ کے علاقے میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ فتح گڑھ کا علاقہ راجہ جی کی ریاست میں اور دوہالے کا علاقہ انگریزی عملداری میں شامل تھا۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ آج سے ایک سو سال پہلے ان دونوں علاقوں پر گکھڑوں کی حکومت قائم تھی جو ان علاقوں میں آباد تھے۔ لیکن اس آزاد ریاست کو ایک طرف سے انگریزوں نے اور دوسری طرف راجہ جی کے دادا نے حملہ کر کے ختم کر دیا تھا۔ گکھڑ اس دو طرفہ لڑائی کی تاب نہ لا سکے اور جرأت اور بہادری اور جی داری سے لڑنے کے باوجود ہار گئے۔ لیکن ہار نے کے باوجود بسے تھے ... حقیقت یہ ہے کہ یہ علاقہ آج تک کبھی پوری طرح سے مطیع نہ ہو سکا۔ کیونکہ گکھڑ بڑے جنگجو، خودسر اور آزادی پسند قوم ہیں۔ آج تک ہمیشہ کبھی نہ کبھی کوئی بغاوت ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے سرکار انگلشیہ نے ... قائم کی تھی اور ادھر ریاستی علاقے میں راجہ جی کی ایک تھانی فوج فتح گڑھ کے ... کے لیے ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

اب وہ مردہ تھا۔ اور اس کی لاش ہسپتال ...
ہجوم تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے آدمی ہسپتال [illegible] ... نہ کرتا تھا۔ پہلے تو وہ دوہالے کے علاقے میں اپنے باغی جوق جوق لوگ اُس باغی کو دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے جن کے [illegible] ... نے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔ اور چاروں طرف اپنے قبیلوں علاقے میں بھی تاریں بھیجی جا چکی تھیں اور سنا تھا کہ وہ ... [illegible] ... ہو گیا۔ اور فتح گڑھ کے علاقے میں اپنی سرگرمیاں

کو پھیلنے لگا۔ پہلے تو صرف دوہالے کے ڈپٹی کمشنر نے اس کی گرفتاری کے لیے پانچ ہزار روپیہ کا انعام رکھا تھا۔ لیکن جب ریاست میں آکر فجے نے ایک دن فتح گڑھ تحصیل کے خزانے کو دن دہاڑے لوٹ لیا تو اس واقعے کے بعد راجہ جی بھی اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ اور انھوں نے اس کے سر کے لیے دس ہزار کا انعام رکھ دیا لیکن اس انعام رکھنے کے ڈیڑھ سال بعد بھی فجا کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اور بدستور اپنے دلیرانہ حملوں میں مصروف رہا۔ یوں بھی دوہالے اور فتح گڑھ کے علاقے میں کسی ڈاکو کو پکڑنا آسان نہیں ہے۔ یہ علاقہ سخت دشوار گزار بنجر ویران اور پُر پیچ سنگلاخ پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ جہاں ننگی چٹانوں اور سنفتے کی جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پانی کمیاب ہے۔ بارش کم ہوتی ہے۔ صرف کہیں کہیں اکا دکا وادیوں میں جوار باجرے یا مکئی کی فصل ہوتی ہے۔ لوگ بے حد غریب اور جفاکش ہیں اور اپنی غریبی کے باوجود اپنے علاقے کی آزادی پہچان دیتے ہیں۔ ہر گاؤں میں پوشیدہ طور پر بندوقیں تیار ہوتی ہیں۔ اور غیر قانونی طور پر انگریزی علاقے میں بھیجی جاتی ہیں اور یہی اُن لوگوں کی سب سے بڑی تجارت ہے۔

فجا کوٹ بلیر خان کا رہنے والا تھا۔ اور ایک لوہار کا بیٹا تھا۔ اور بندوق کی دونالیاں بے حد عمدہ تیار کرتا تھا اُس کے ہاتھ کی بنی ہوئی بندوقیں دور دور تک جاتی تھیں۔ اس تجارت کے سلسلے میں وہ ایک بار دوہالے کے قریب اپنی بندوقیں بیچتا ہوا پکڑا گیا۔ اور تین سال کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ مگر فجا بے حد ذہین اور سرکش طبیعت کا مالک تھا۔ ڈیڑھ سال جیل کاٹنے کے بعد انگریزی جیل سے فرار ہو گیا۔ اور اپنے علاقے کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو کر ڈاکو بن گیا۔

شاید فجا ابھی تک زندہ ہوتا۔ اگر اُسے خانم سے محبت نہ ہو گئی ہوتی۔ خانم سردار موسے خاں کی لڑکی تھی۔ اور سردار موسے خان فتح گڑھ کا نمبردار تھا۔ اور اپنے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا اور خانم اس کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور سُنا ہے کہ اس قدر حسین تھی کہ راولپنڈی اور گوجر خان کے انگریزی علاقے تک اُس کی شادی کے پیغام آتے تھے۔ فجا اُسی خانم پر مر مٹا تھا۔

فجے نے خانم کو سب سے پہلے سُون کے میلے میں دیکھا تھا۔ سون کا میلہ ہر سال برسات کے موسم میں دریائے سُون کے کنارے ہوتا ہے۔ ایک طرف ریاستی علاقہ دوسری طرف انگریزی علاقہ۔ بیچ میں دریائے سون بہتا ہے اور یہ میلہ ہر سال اُسی مزار پر ہوتا ہے اور دوہالے اور فتح گڑھ دونوں علاقوں کے گکھڑ اپنی بندوقیں کو چھوڑ کر اور اپنی رقابتوں کو بھول کر اور لڑائی جھگڑوں کو بالائے طاق رکھ کر شاہ نظیر کے میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ سُنا ہے کہ کوئی فساد نہیں ہوا۔ کبھی کوئی پولیس کا آدمی نہیں آیا۔ یہ گکھڑوں کا قومی میلہ ہے

...دن نے مدیر نقوش کے نام لکھے تھے۔ ان

کے گکھڑ اس مقام پر پہنچتے ہیں اور اونچ نیچ نابرابری اور ذاتی منافقشات

...میں بڑے کام کا مواد ملتا ہے۔ فراق کو پتہ نہ تھا کہ یہ

کرتے ہیں۔

...مانہ وہ ساری باتیں لکھ ڈالی ہیں جو شاید عام حالات میں

اس موقعے پر کشتیاں ہوتی ہیں۔ تیغے لڑائے...

...فراق خطوں میں جو عالمانہ شان ہے وہ انہی کا حصہ ہے اور خاص انہی کا۔

مقابلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ سُون کا دریا بھی تو اپنے علا...

قیمت چار روپے

ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف اونچی اونچی ننگی چٹا...

پُل کے نیچے سے گزرتا ہے۔ جس کی دیواریں تو ایک طرف فتح گڑھ کے قلعے سے مل جاتی ہیں۔ اور دوسری طرف انگریزی علاقے کی کسٹم کی چوکی پر ختم ہوتی ہیں۔ یہاں پر دریائے سون کی روانی سب سے تیز ہے۔ اور بھری برسات میں جب یہ میلہ ہوتا ہے اُس زمانے میں تو سون کے تنگ پاٹ کی روانی اور اُس کی کف آلود لہروں کے غیض و غضب کا عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہزاروں من وزنی چٹان بھی اس پانی کے بہاؤ کے سامنے آ جائے گی تو گھاس کے تنکے کی طرح بہائی جائے گی۔ ان طوفانی پانیوں میں تیرنا جیتے جی موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر گکھڑ نوجوان ہر سال خوشی خوشی اس تیراکی کے مقابلے میں شریک ہوتے ہیں۔ کئی بار کئی تیراک شوریدہ سر لہروں کی تاب نہ لا کر اُن کے تھپیڑوں سے پار نہ جا سکے اور واپس بھی نہ آ سکے۔ بلکہ پانی کی لہروں میں یوں بہہ گئے کہ دوسرے دن دس میل کے فاصلے پر نیچے کی گھاٹی کے کنارے اُن کی لاش ملی۔ تو بھی نوجوانوں میں تیراکی کا یہ مقابلہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ کیونکہ اس مقابلے میں اول نمبر پر آنے والے کو گکھڑ قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ ہر سال سات نوجوانوں کی ایک ٹولی فتح گڑھ کے قلعے کی دیوار کے نیچے اُس پار جانے کے لیے کھڑی رہتی ہے اور سات نوجوانوں کی ٹولی دوہاسے کے کنارے سے اِدھر آنے کے لیے کھڑی رہتی ہے ایک اشارے پر دونوں طرف کے نوجوان پانی میں کود پڑتے ہیں اور جو نوجوان سب سے پہلے اُدھر سے اِدھر یا اِدھر سے اُدھر کے کنارے پر پہنچتا ہے اُسے چاندی کے موٹھ والا خنجر انعام میں دیا جاتا ہے۔ اور یہ رسم بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ نوجوان کنارے پر کھڑے ہوئے سرپنچ یا مقدم کے پاس جا کر اُسے تعظیم دیتا ہے۔ مقدم اُسے گلے سے لگا لیتا ہے اور اُس کا ماتھا چوم کر اُسے قومی خنجر پیش کرتا ہے جسے لے کر نوجوان دو قدم پیچھے ہٹتا ہے اور پھر خنجر کو اٹھا کر مقدم کو فوجی سلام کرتا ہے۔ پھر مقدم کہتا ہے۔

"بول جوان اور کیا چاہیے؟"

اس سوال کے جواب میں جوان کہتا ہے "شاہ نظیر کا سایہ اور مقدم کی دعا چاہیے"

اتنا کہہ کر نوجوان سر جھکا لیتا ہے۔ پھر مقدم آگے بڑھتا ہے اور وہ نوجوان کے کندھے پر ایک چادر ڈال دیتا ہے جسے نوجوان اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلا دیتا ہے۔ اس پر وہ مقدم اُس پھیلی ہوئی چادر میں نقد انعام ڈال دیتا ہے جو ہمیشہ ایک سو گیارہ روپے کا ہوتا ہے۔

ہمیشہ ہر سال یونہی ہوتا ہے۔ اسی طرح کے سوال جواب ہوتے ہیں جیتنے والا مقدم کو تعظیم دیتا ہے۔ مقدم آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگاتا ہے۔ اُسے قومی خنجر دیتا ہے۔ نوجوان فوجی سلام کرتا ہے۔ مقدم پوچھتا ہے۔ بول جوان اور کیا

" نظیر کا سایہ اور مقدم کی دعا چاہیے۔ اس پر مقدم نوجوان کے گلے پہ چادر ڈالتا ہے۔ نوجوان چادر

جھکاتا ہے تو مقدم اُس کی پھیلی ہوئی چادر میں ایک سو گیارہ روپے ڈال دیتا ہے۔

اب وہ مردہ تھا۔ اور اس کی لاش پہ تے ہوئے آتے ہیں اور اپنے ہیرو کو کندھے پر اٹھا کر ناچنے لگتے ہیں۔ میں نے

ہجوم تھا میں نے اپنی زندگی میں اتنے آدمی ہسپتال میں

جو تق لوگ اُس پانی کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے جس کے [illegible] سال پہلے سے سات دن پہلے خلافِ معمول دن رات بارش

علاقے میں بھی تاریں بھیجی جا چکی تھیں اور [illegible]

ہوتی رہی تھی۔ اور بڑی بوڑھیوں کو بھی یاد نہ تھا کہ اس علاقے میں ایسی زوردار کی جھڑی اس سے پہلے کبھی ہوئی تھی۔ دریائے سون کا پانی پُل سے صرف چند گز نیچے رہ گیا تھا۔ اور چٹانوں سے اوپر قلعے کی دیواروں سے ٹکراتا تھا اور دوسری طرف شاہ نظیف کے مزار کے چبوترے تک پہنچ گیا تھا۔

اُس سال مجا انگریزی جیل سے بھاگ کر اپنے علاقے میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اب تک وہ دو چار چوکیوں پر حملہ کر چکا تھا۔ اور گکھڑ نوجوانوں میں اس کی شہرت پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔

اُسی سال میلے میں مجے نے خانم کو دیکھا جو سردار موسیٰ خاں کی اکلوتی لڑکی تھی اور اپنے علاقے کی حسین ترین دوشیزہ سمجھی جاتی تھی۔ لمبے قد والی سیاہ آنکھوں والی دراز بالوں والی بھرپور جوانی والی خانم میلے میں جس طرف سے گزرتی تھی۔ نوجوانوں کے دل دھک سے رہ جاتے تھے اور وہ سناٹے میں آ کر رہ جاتے تھے۔ ایسا باوقار مرعوب کر دینے والا حسن انھوں نے آج تک اپنے علاقے کی کسی عورت میں نہ دیکھا تھا۔ خانم کو اس میلے میں جس نے دیکھا سینے پر ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔ مجا حالانکہ خود ایک خوبصورت کڑیل جوان تھا۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ رنگ سانولا۔ سینہ فراخ اور جسم اس قدر مضبوط جیسے اُس کے وطن کی سانولی پہاڑیوں کی ننگی چٹان سے تراشا گیا ہو۔ مگر جونہی اس نے خانم کو دیکھا تو اُس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اس کا سانس اس کے سینے میں اٹکنے لگا۔ خانم نے ایک سیدھی سپاٹ کھلی بے خوف نڈر نگاہ اُس پر ڈالی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اور یکایک مجے کو ایسا محسوس ہوا جیسے سورج پر سایہ سا آ گیا ہے۔

اُسی وقت اس نے اپنے دل میں محسوس کیا کہ اُسے تیراکی کے مقابلے میں حصہ لینا چاہیئے۔ حالانکہ اس میلے میں پولیس کے مخبر بہت ہوں گے۔ اور اُس کے حمایتیوں نے اُسے اس مقابلے میں حصہ لینے سے منع کیا تھا۔ اور اپنے تحفظ کی خاطر ان کی بات مان بھی گیا تھا۔ مگر خانم کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس کے دل میں تیراکی کے مقابلے میں حصہ لینے کی خواہش زور پکڑنے لگی اور جونہی تیراکی کے مقابلے کے لیے ڈھول بجنے لگے۔ وہ لنگوٹ باندھ کر میدان میں آ گیا۔ اور اُس نے اپنے دوست شاہنواز خان کو ہٹا کر اس کی جگہ تیراکی کے مقابلے میں لے لی۔ شاہنواز نے حیرت کی نگاہ سے مجے کو دیکھا۔ مگر مجا اس کا سردار اور رہنما تھا۔ اس لیے شاہنواز مقابلے سے ہٹ گیا۔ اور اُس نے اپنی جگہ مجے کو دے دی۔

لیکن پانی کی روانی اس قدر تیز تھی اور سون کا دھارا اس قدر خطرناک تھا کہ فتح گڑھ کے کنارے سے ادھر آنے والے تیراکوں میں ایک بھی ادھر تک نہ پہنچ سکا۔ اور اُدھر سے فتح گڑھ جانے والے تیراکوں میں سے صرف دو جوان ریاستی علاقے کے کنارے تک پہنچ سکے۔ جہاں سردار موسیٰ خان مقدم کی حیثیت سے ان کی عزت افزائی کے لیے موجود تھا۔ اس کے پیچھے اس کی بیٹی خانم کھڑی تھی۔ اور اس کے گاؤں کے لوگ اور اب پُل پار کر کے دوہالے کے علاقے کے لوگ بھرے اس رسم کو دیکھنے کے لیے آ گئے تھے۔

مجا سب سے پہلے منبر پر آیا تھا۔ اس کے ٹخنوں سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ اپنے لنگوٹے کو کستا ہوا ہنستا ہوا اپنے بھیگے چہرے کو پونچھتا اس نے تعظیم دی۔

...نے مدیر نقوش کے نام لکھے تھے۔ ان ...کام کا مواد ملتا ہے۔ فراق کو یہ پتہ نہ تھا کہ یہ ...وہ ساری باتیں لکھ ڈالی ہیں جو شاید عام حالات میں ...خطوں میں جو عالمانہ شان ہے وہ انہی کا حصہ ہے اور فراق کا۔

قیمت چار روپے

موسے خان نے اُسے اپنے گلے سے لگایا۔ اس کے بھیگے ہوئے ماتھے کو چوما جس پر بھیگے ہوئے بالوں کی لٹیں پڑی تھیں۔ پھر اُس نے اپنی کمر سے قومی خنجر نکال کر فجے کے ہات میں دیا۔ فجے نے دو قدم پیچھے خنجر کو ہات میں اٹھا کر اپنی دونوں ایڑیاں ملا کر مقدم کو فوجی سلام کیا۔

سردار موسے نے پوچھا۔

"بول جوان کیا چاہیئے!"

"شاہ نظیر کا سایہ اور خانم کا ہات!" فجے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کی سیدھی صاف نگاہ خانم پر تھی۔
خانم نے چونک کر دراز قد فجے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اُس کی نگاہ شرم سے جھک گئی اور اس کی زیتونی رنگت گلاب کی طرح سُرخ ہو گئی۔

ایکدم سینکڑوں لوگوں کے چہرے فق ہو گئے۔ یہ کون دیدہ دلیر تھا جس نے بزرگوں کی پرانی رسم کو توڑا تھا۔ یوں اور یوں ایک لمحے میں فتح گڑھ کے سب سے بڑے سردار کی بھرے میلے میں بے عزتی کر ڈالی تھی اور یوں سب کے سامنے اس کی بیٹی مانگ لی تھی۔

"تجھے تیری یہ ہمت!" سردار موسے خاں غصے سے گرجا۔ ایک معمولی ڈاکو ہو کر ایک سردار کی لڑکی پر نظر رکھتا ہے۔ بدتخم۔ بے ایمان۔ تو نے بھرے میلے میں بزرگوں کی رسم کو توڑا ہے۔ آج تیری بوٹی بوٹی نوچ لی جائے گی۔
موسے خاں اور اس کے گاؤں کے بہت سے لوگ فجے کو مارنے کے لیے آگے بڑھے۔ مگر فجا پلٹ کر واپس دریا کی طرف بھاگنے لگا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ لوگ اُسے پکڑ سکتے اُس نے ایک اونچی چٹان سے کود کر پھر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

تماشائیوں نے اپنے دل تھام لیے۔
اس بار فجا چڑھتے ہوئے دریا کو چیر کر شاہ نظیر کے مزار کے چبوترے پر نہیں اُتر سکا۔ بلکہ اس سے بہت نیچے میلے کے مقام سے بہت دور نیچے کنارے پر جا لگا۔ پھر ایک چٹان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پھیلا کر اپنے منہ کے دونوں طرف رکھ کر زور سے چلا کر کہا۔
"موسیٰ خان یاد رکھ تیری بیٹی اب میری ہے"

(۲)

اب وہ مردہ تھا۔ اس کی لاش پولیس والوں کی معیت میں ہسپتال میں آ چکی تھی۔ ہسپتال میں سینکڑوں لوگوں کا ہجوم تھا جس نے اپنی زندگی میں اتنے آدمی ہسپتال میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہسپتال کے ارد گرد میلہ سا لگ گیا تھا۔ جوق در جوق لوگ اُس باغی کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے جس کے سر کے لیے راجہ جی نے دس ہزار روپے کا انعام رکھا تھا۔ انگریزی علاقے میں بھی تاریں بھیجی جا چکی تھیں اور سنا تھا کہ دو روز میں وہاں کا انگریز ڈپٹی کمشنر خود لاش کی شناخت کیلئے آنے والا

ہے۔ تب تک یہ لاش ہسپتال کے مردہ خانے میں برف میں دبا کر رکھی جائے گی۔ یہ مردہ خانہ سپیشل کوارٹروں کے پیچھے کی گھاٹی پر سب سے الگ تھلگ تھا۔ اور مجھے اس جگہ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اور میں اس طرف کبھی نہ جاتا تھا۔ اور نہ ہی میری ماں جی مجھے کبھی اس طرف جانے دیتی تھیں۔ اور مردہ خانے کے بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے سُنا کر انھوں نے مجھے مردہ خانے سے اور بھی خائف کر دیا تھا۔ اور میں اپنے پتا جی کی جرائت پر بہت حیران ہوا کرتا تھا کہ کس طرح وہ مُردوں کی چیر پھاڑ اس دلجمعی سے کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ زمانہ میرے بچپن کا تھا۔ لیکن اب بڑا ہو جانے پر مجھے مردوں پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ مُردے خوش قسمت تھے کہ وہ مر گئے۔ لیکن حیرت اُن زندوں پر ضرور ہوتی ہے۔ جو شب و روز واقعات و حالات کا ظلم سہتے ہیں۔ خود اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی کے ٹکڑے ہوتے دیکھتے ہیں اور کوئی احتجاج کیے بغیر سماج کے مردہ خانے میں پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں!

لاش کو دیکھنے کی ہمت تو مجھ میں نہیں ہوتی۔ اس لیے میں ہسپتال کے برآمدے کے باہر ہی ڈرا سہا لوگوں کی باتیں سنتا رہا جو اندر سے لاش دیکھ کر آ رہے تھے۔ اور اب ہسپتال کے باہر باغ کی کیاریوں میں دو چار دس کی ٹولیاں بنائے باتیں کر رہے تھے۔ ایک بچے کی موجودگی کو کون اہمیت دیتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ باتیں کرتے رہے اور میں اس ٹولی سے اس ٹولی میں جا کر اُن کی باتیں سنتا رہا۔ اور جو باتیں وہ کر رہے تھے اُن سے معلوم ہوا کہ موسےٰ خان نے بڑی جی داری سے فجے کا پیچھا کیا تھا۔ اور جب فجا جان بچا کر بھاگنے لگا تو موسےٰ خان نے اُسے گولی سے ہلاک کر دیا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ موسیٰ خاں فجے کو زندہ ہی پکڑ کر راجہ صاحب کے حضور میں پیش کرتا۔ مگر راجہ صاحب اب بھی موسےٰ خان کے کارنامے پر بہت خوش تھے۔ تجویز یہ تھی کہ جب انگریز صاحب بہادر دوہالے سے آکر لاش کو شناخت کرے گا اور موسےٰ خان کے انعام کے کاغذ پر دستخط کر دے گا تو فجے کا سر کاٹ کر ایک نیزے پر چڑھا کر صدر مقام میں جگہ جگہ دکھایا جائے گا تاکہ بدمعاشوں اور باغیوں کو عبرت ہو۔

ہسپتال میں اس واقعے پر خود موسےٰ خان بھی اپنے تیس چالیس حمائیتیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا ناٹے قد کا تانبے کے رنگ کا دُہرے بدن کا اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں بڑی خوفناک معلوم ہوتی تھیں اور اس کی ہنسی بڑی کرخت اور کرڑدی تھی۔ اور وہ گفتگو کرتے ہوئے اپنی کارتوسوں کی پیٹی کو ہلاتا تھا جو اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ مجھے موسےٰ خاں سے بڑا ڈر لگا۔ اس لیے میں اُسے دُور ہی سے دیکھ کر واپس پیچھے اپنے گھر کو بھاگ گیا۔ جہاں ماں جی نے مجھے اوپر ہسپتال جانے پر ڈانٹ پلائی اور دن بھر کے لیے گھر سے نکلنے کے لیے منع کر دیا۔

جب شام گہری ہو گئی تو پتا جی ہسپتال سے تھکے ہارے لوٹے۔ مگر آج ماں جی نے انھیں بنگلے کے باہر میں ہی روک لیا۔ یہ ماں جی کا دستور تھا کہ جس دن ہسپتال میں کوئی لاش آتی تھی۔ وہ پتا جی کو گھر میں گھسنے نہیں دیتی تھیں تک وہ اُن پر گنگا جل نہ چھڑک دیں۔ جو پوجا کے کمرے میں ایک بند ٹین میں مقفل رہتا تھا۔ اس لیے ماں جی نے گھر کے باہر ہی پتا جی کو روک دیا۔ اُن پر دور ہی سے گنگا جل چھڑکا۔ پھر اُن سے کہا کہ وہ اپنے کپڑے اُتار دیں اور ایک نئی دھوتی انھوں نے پتا جی کو پہننے کو دی۔ اور وہ اسی دھوتی میں لپٹے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ماں جی انھیں سیدھے غسل خانے لے گئیں۔ جہاں گرم پانی اُن کے نہانے کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر جب ڈاکٹر صاحب غسل خانہ

سے نکلے تو ماں جی کی جان میں جان آئی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد پتا جی سیدھے سونے کے کمرے میں چلے گئے اور دیر تک ایک بڑی کتاب اٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اور دو تین گھنٹوں کے بعد جب رات گہری ہو چکی اور انھیں پورا یقین ہو گیا کہ میں سو گیا ہوں تو وہ ماں جی کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

"کلے دی ماں، سو گئی کہ جاگتی ہے؟"

"نہیں جاگتی ہوں۔" ماں جی اپنے بستر میں دُبکی سہم کر بولیں۔

"تو بولتی کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں۔ مجھے تو اُس موئے ڈاکو سے ڈر لگتا ہے جو مردہ خانے میں پڑا ہے۔"

"وہ ڈاکو نہیں تھا۔"

"ڈاکو نہیں تھا تو پھر کون تھا؟" ماں جی نے حیرت سے پوچھا۔

پتا جی آہستہ سے بولے۔ "وہ تیری میری طرح کا ایک انسان تھا۔ جو اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرتا تھا۔"

"پرے ہٹو" ماں جی ہنک کر بولیں۔

"تم بھی جانے کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتے۔ ساری دُنیا جانتی ہے۔ فجا ایک ظالم ڈاکو تھا۔ جس کے سر پر راجہ جی نے انعام رکھا تھا۔ کیونکہ اس نے سارے علاقے میں اُودھم مچا رکھا تھا۔ وہ تو پرماتما بھلا کرے جیسلے خان کا جس نے اُس ظالم کو گولی سے مار دیا۔"

"جیسلے خان نہیں موسلے خان۔" پتا جی نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ اِن سب موئے مسلمانوں کے نام ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں آتا....." ماں جی نے ہات چلا کر بڑی نخوت سے کہا۔

"اور ہندوؤں کے نام ایک سے نہیں ہوتے کیا!" پتا جی مسکرا کر بولے "اندر۔ بیر ندر۔ مہندر، راجندر، گجندر۔ سبھی اندر ہی اندر ہیں!"

"تم تو جب بات کرنے بیٹھتے ہو، مسلمانوں کی طرفداری کرنے لگتے ہو۔ اب فجا ڈاکو ڈاکو ہی نہیں ہے۔ کل کہو گے کہ جیسلے خان نے فجے کو مارا ہی نہیں۔"

"جیسلے خان نہیں موسلے خان" پتا جی نے پھر بتایا۔

"اچھا بابا موسلے خان ہی سہی۔ پھر!"

"پھر قصہ یہ ہے کہ موسلے خان نے فجے کو لڑائی میں نہیں مارا۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"وہی بات! میں نہ کہتی تھی کہ تم آجاؤ گے اپنی اُلٹی سیدھی تھیوری پر۔" ماں جی ذرا غصے سے بولیں۔

"لوگ کہتے ہیں فجے کو موسلے خان کی لڑکی خانم سے محبت تھی۔ اور خانم بھی اس جیالے نوجوان سے پیار کرنے لگی تھی۔ مگر چونکہ موسلے خان فجے کے خلاف تھا۔ اور سب فجے کے خلاف ریاستی اور انگریزی دونوں علاقوں کے وارنٹ نکلے ہوئے

تھے۔ سینے فجا خانم سے چوری چھپے ملتا تھا۔ وہ دن بھر پہاڑیوں کی غاروں اور کھائیوں میں چھپا رہتا تھا اور دور دراز کے تھانوں پر ڈاکے مارتا۔ پولیس اور فوج کو عاجز کرتا اور پھر ایک چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا۔ سارے علاقے کے نوجوان در پردہ اُس کے حمایتی تھے۔ نوجوان لڑکیوں نے اس کی تعریف میں گیت کہے تھے۔ اور وہ اپنے علاقے کا بہت بڑا ہیرو تھا۔ اور خانم جی جان سے اُس سے پیار کرتی تھی۔ گہری اندھیری راتوں میں سون دریا کے کنارے فتح گڑھ کے قلعے کی دیواروں کے پیچھے خانم اور فجا ملا کرتے تھے۔ چند گھنٹوں کے لیے پھر پَو پھٹنے سے پہلے فجا یا تو فتح گڑھ کی سنگلاخ پہاڑیوں کی راہ لیتا یا دریا پار کر کے دوسرے علاقے میں چلا جاتا۔ اور اُسے آج تک کوئی نہ پکڑ سکا تھا۔"

"پھر وہ کیسے پکڑا گیا؟" ماں جی نے پوچھا۔

"خانم کی ایک خالہ نے جواب تک اس کی ہم راز رہی تھی۔ ایک روز موسے خان کو یہ سب کچھ بتا دیا"

"ہائے ری جنم جلی مھاسڑی بڈھی خالہ تجھ کو شرم نہ آئی" ماں جی کو ایکدم خانم اور فجے پر ترس آ گیا۔ نی خصماں کھانیے!" ماں جی نے گویا اُس خالہ کو اسی لمحے مخاطب ہو کر کہا "تجھے ان غریبوں کا پیار برباد کرتے ہوئے لجا نہ آئی؟"

پھر وہ پتا جی کی طرف مڑ کر بولیں "پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ یہ خبر ملتے ہی موسے خان نے فجے کو پکڑنے کے لیے گاؤں کے چاروں طرف اپنا جال پھیلا دیا لیکن اس نے قلعے کے فوجیوں کو مطلق خبر نہ دی۔ مبادا وہ بھی انعام کے حقدار بن جائیں۔ ہر روز رات کو اُس کے لوگ پہرہ دیتے تھے۔ اور صرف اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ رات کو کہیں خانم باہر جائے تو وہ اس کا پیچھا کریں۔"

"پھر؟" ماں جی کی سانس تیز ہو گئی۔

"پہلے تین روز تو کچھ نہ ہوا۔ خانم بڑے مزے سے اپنے گھر میں سوتی رہی۔ چوتھی رات کو جب آدھی اِدھر ہوئی آدھی رات اُدھر ہوئی تو خانم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور خالہ کو بھی اس نے جگا دیا۔ پھر خانم نے بال سنوارے۔ نئے کپڑے پہنے۔ نیلی سوسی کی مخملی شلوار اور قمیض اور سر پہ ریشمی اوڑھنی ڈال کر اپنے محبوب سے ملنے چلی!"

"ہا!" ماں جی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"خالہ ساتھ میں تھی" پتا جی نے بتایا۔

"وہ کُٹنی مُردار۔ کیڑے پڑیں اُس کی جون میں" ماں جی نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"قلعے کی دیواروں کے پیچھے وہ دونوں ملے۔ خانم اور فجا۔ دونوں مل کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر جب رات کا تیسرا پہر جانے لگا۔ تو فجا بادلِ نخواستہ خانم سے الگ ہوا۔ اور گاؤں کی چو حدی سے باہر باہر اُس راستے پر چلنے لگا۔ جو فتح گڑھ کے پہاڑی درے کو جاتا ہے جہاں اُس نے اپنا خفیہ اڈہ بنا رکھا تھا۔ اِدھر نیچے کے راستے سے فجا جا رہا تھا اُدھر اوپر کے راستے سے خانم خالہ کو لے کر اپنے گاؤں کو جا رہی تھی۔ دونوں راستوں پر تاریک سے سائے سے ملتے تھے۔ اور فجا کبھی خانم کے سائے کو دیکھ کر خوش ہو لیتا۔ کبھی خانم نیچے جاتے ہوئے فجے کو دیکھ کر دل ہی دل میں اس کی بلائیں لینے لگتی۔"

"پھر؟"

"پھر جب فجا دریا کے کنارے ایک تنگ موڑ سے گزر کر درے کی جانب مڑنے لگا تو کسی نے پیچھے سے چٹانوں کے عقب سے اس پر گولیوں کی بارش کر دی۔ ایک ساتھ تڑا تڑ کی آواز سے چھ گولیاں اُس کی پیٹھ میں پیوست ہو گئیں۔"

فجا زور سے چلایا "خانم" اور اوپر کے راستے پر جاتی ہوئی خانم گولیوں کی آواز سن کر کانپ گئی اور دوڑتی گرتی پڑتی گھاٹیوں سے نیچے اُترتی اُس موڑ پر پہنچ گئی جہاں خاک و خون میں لت پت اُس کا محبوب پڑا تھا۔ بے جان، مردہ اور اس کی لاش پر اس کا باپ موسے خان اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے مسکرا رہا تھا۔

ماں جی کچھ دیر ساکت رہیں۔ خاموشی سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھتی رہیں۔ پھر بولیں "تم تو ایسے بات کرتے ہو جیسے تم اُس موقع پر موجود تھے۔"

"میں تو نہیں تھا" ڈاکٹر صاحب بولے "مگر جو تھا اس نے مجھے خود یہ واقعہ سُنایا ہے۔"

"کس نے؟"

"خانم نے!"

"خانم یہاں آئی ہے۔" ماں جی نے حیرت سے پوچھا "یہاں؟ صدر مقام پر؟"

"ہاں! وہ اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھی ہے۔" پتا جی نے سرگوشی میں کہا۔

ماں جی ایکدم چونک گئیں۔ دیر تک چُپ رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔

"وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ تمہارے بنگلے پر؟ وہ کیا چاہتی ہے؟"

"وہ چاہتی ہے کہ ایک دفعہ فجے کو دیکھ لے!"

ماں جی پھر دیر تک چُپ رہیں۔ پھر بولیں "اس کے باپ کو معلوم ہے کہ وہ یہاں آئی ہے؟"

"نہیں۔ وہ سب سے چھپ کر یہاں آئی ہے اور چاہتی ہے کہ میں ایک دفعہ اُسے فجے کی لاش دکھا دوں۔"

"مگر فجے کی لاش تو مردہ خانے میں ہے!"

"ہاں۔ مگر مردہ خانے کی کنجی تو میرے پاس ہے۔"

ماں جی خوف سے لرز کر بولیں "اس وقت آدھی رات میں تم مردہ خانے کے اندر جاؤ گے؟"

"کیا حرج ہے؟"

"اور اگر کسی کو پتہ چل گیا۔ اگر کسی نے رپورٹ کر دی۔ اگر کوئی شکایت راجہ جی تک پہنچ گئی؟"

"اس اندھیرے میں کون دیکھتا ہے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔" ماں جی ایکدم فیصلہ کُن لہجے میں بولیں۔

"تم تو باؤلے ہو اور عقل نام کی کوئی چیز تمہارے دماغ میں نہیں ہے! میں خود ابھی باہر جاتی ہوں اور اُس خانم سے بات کرتی ہوں۔" ماں جی بستر سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایسا مت کرو۔ ایسا مت کرو۔" پتا جی ایکدم گھبرا کر بولے "اُس کا دل مت توڑو۔ ذرا سی تو بات ہے!"

"واہ! چاہے ہماری نوکری چلی جائے۔ خوب۔ یہ بھی کیا تماشہ ہے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ ساتھ میں ہمارا رزق بھی لیے جائے گا۔"

ماں جی ایکدم کمرے سے باہر نکل گئیں۔ پتا جی اس کے پیچھے بھاگے۔ اور ان دونوں کے پیچھے دبے پاؤں میں بھی باہر نکلا۔ مگر برآمدے میں نہیں گیا۔ دروازے کی آڑ سے کر دیکھنے لگا۔ برآمدے کے ایک چوبی ستون سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دو ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی اُس کے مضمحل اور اُداس چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر جب وہ لڑکی اٹھی تو مجھے وہ ماں جی سے بھی لمبی معلوم ہوئی۔ اس کے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے۔ اور گھٹنوں تک آتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے لمبے بال کسی عورت کے نہیں دیکھے۔ اس کا چہرہ سپید تھا۔ اور آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور وہ بالکل چُپ تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر بھی وہ بالکل چُپ کھڑی رہی۔

"چلی جاؤ!" ماں جی نے گرج کر کہا۔

"نہیں نہیں، کاکے دی ماں!" پتا جی نے پریشان ہو کر کہا۔ مگر ماں جی فوراً تڑپ کر بولیں "تم چپ رہو۔ پھر خانم کی طرف مُڑ کر ایک اُنگلی اٹھا کر بولیں "سیدھے سیدھے یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ ابھی پولیس کو بلاتی ہوں"

"میں ایک بار مجھے اُسے دیکھ لینے دو" خانم آہستہ سے بولی۔

"اب اُسے دیکھ کر کیا کرو گی؟" ماں جی نے پوچھا۔

"میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں!" خانم نے بڑی سادگی سے کہا۔

"پگلی ہوئی ہو! مردے سے کون باتیں کر سکتا ہے؟"

"میں کروں گی!" خانم نے کامل یقین سے کہا "مجھے اُسے ایک بار دکھا دو صرف ایک بار"

ماں جی روتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں "جا ابھاگن چلی جا۔ مُردے اگر کسی کی بات سُن سکتے تو آج کوئی عورت بیوہ نہ ہوتی۔ کسی کا بچہ یتیم نہ ہوتا۔ مگر مُردے سُن نہیں سکتے!"

خانم دیر تک میری ماں کو دیکھتی رہی۔ اُس کی نگاہ کبھی میری ماں پر جاتی کبھی ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر۔ آخر وہ آزردہ خاطر ہو کر بولی "ٹھیک ہے مردے نہیں سُن سکتے۔ شاید اس لیے تم بھی نہیں سُن سکتی ہو۔ ڈاکٹر بھی نہیں سنتا ہے۔ اس جگہ پر کوئی بھی کسی کی نہیں سنتا ہے۔ کیا یہاں سب مردے بستے ہیں؟"

خانم نے بڑی حقارت سے پوچھا۔ اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں سے شعلے لپکنے لگے۔ پھر وہ منہ موڑ کر مزید بات چیت کیے بغیر برآمدے سے باہر نکل گئی۔

(۳)

دوسرے دن خانم نے مجسٹریٹ لال خان کی عدالت میں درخواست دی کہ وہ بنجے کی بیوہ ہے۔ اس لیے بنجے کی لاش اس کے حوالے کی جائے۔ درخواست سے کہ جب وہ خود عدالت میں پیش ہوئی تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے اور عدالت کو

اپنا کمرہ تماشائیوں سے خالی کرانا پڑا۔ پھر بھی علاقے کے تمام بڑے بڑے افسر اور چودھری اور معزز لوگ عدالت میں موجود تھے۔ سردار موسےٰ خاں بھی موجود تھا۔ مجسٹریٹ لال خان نے درخواست لے کر پوچھا "فیض محمد تیرا کیا لگتا ہے؟"

"وہ میرے سر کا سائیں (سرتاج) تھا" خانم نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔

"کیا تیری اُس کی شادی ہوئی تھی" مجسٹریٹ نے پھر پوچھا۔

"نہیں!" خانم بولی۔

"پھر کیا تیری اس کی آشنائی تھی؟"

"نہیں!" خانم غصے سے بھڑک کر بولی "میں تو کنواری ہوں۔ اُس نے تو آج تک میرے جسم کو چھوا تک نہیں! مگر پھر بھی وہ میرے سر کا سائیں تھا۔ اُس کی لاش میرے حوالے کر دی جائے!"

موسےٰ خاں نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر کہا "سرکار۔ یہ میری لڑکی ہے۔ میری اجازت کے بغیر گھر سے بھاگ کر یہاں آئی ہے۔ اُسے میرے حوالے کر دیا جائے"

"میں کسی غدار کی لڑکی نہیں ہوں" خانم نے گرج کر کہا "میں فجے کی بیوہ ہوں اس کی لاش میرے حوالے کر دی جائے!"

مجسٹریٹ لال خان نے خانم کو سمجھاتے ہوئے کہا "خانم! تو ایک معزز سردار اور نمبردار کی لڑکی ہے۔ تیرے باپ نے ریاست کے ایک خطرناک باغی کو جس کے سر پہ دس ہزار کا انعام تھا، مار کر ہم سب کی خوشنودی حاصل کی ہے۔ تیرے باپ کو انگریزی سرکار سے پانچ ہزار کا انعام ملے گا۔ راجہ صاحب سے دس ہزار کا انعام، خلعت اور جاگیر ملے گی۔ ایسے بڑے آدمی کی بیٹی کو ایسی باتیں نہ کہنی چاہئیں!"

خانم نے آہستہ سے مگر گہرے یقین سے کہا "آج بھری عدالت میں سب سے کہتی ہوں۔ میرا باپ بھی میرے سامنے کھڑا ہے وہ بھی سن لے۔ جس انعام کی خاطر میرے باپ نے یہ کام کیا ہے وہ انعام اُس کو کبھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ غدار کو انعام نہیں دیا جاتا اُسے تو سزا دی جاتی ہے۔ بس! عدالت میری درخواست کا فیصلہ کرے!"

"نامنظور!" مجسٹریٹ لال خان نے باآواز بلند کہا۔

(۴)

عدالت سے نکل کر خانم اس طرح بھاگی کہ اس کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ موسےٰ خان نے اپنی لڑکی کی تلاش میں چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ پولیس نے بھی بڑی دوڑ دھوپ کی۔ مگر خانم ڈھکی کے نیچے پہنچ کر ایسی غائب ہوئی کہ پھر اُس کا پتہ نہ چل سکا۔ خانم کے دھمکی دینے اور دھمکی دے کر اس طرح غائب ہو جانے پر لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کوئی کہتا موسےٰ خان کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُس کی لڑکی اُسے قتل کر دے گی۔ موسیٰ خان حالانکہ ہر وقت ریوالور اپنی کمر میں رکھتا تھا۔ پھر بھی اس کی حفاظت کے لیے دو پولیس کے سپاہی ہر وقت اس کے ساتھ لگا دیے گئے۔ راجہ صاحب نے موسیٰ خان کو بلا کر اُس کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور اُس سے وعدہ کر لیا کہ جونہی انگریز ڈپٹی کمشنر دورے سے آکر اپنی شناخت مکمل کر کے موسیٰ خان کے انعام کے لیے حکم جاری کرے گا راجہ صاحب اُس کے دوسرے دن ہی ایک دربار منعقد کر کے موسیٰ خان کو اپنے ہاتھ سے دس ہزار کی تھیلی دیں گے۔ خلعت

اور جاگیر عطا کریں گے۔ موسیٰ خاں یہ انٹرویو لے کر بے حد خوش خوش اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔
دو دن کے بعد جب انگریز ڈپٹی کمشنر ریاست کے صدر مقام پر پہنچا اور لاش دیکھنے کے لیے ہسپتال پہنچا تو ایک عجیب واردات ہوئی۔ موقع پر پہنچ کر سب نے دیکھا کہ مردے خانے کا قفل ٹوٹا پڑا ہے۔ اور رنجے کا سر غائب ہے۔ صرف ایک بے دھڑ لاش ایسی مخدوش حالت میں پڑی ہے کہ کسی طرح بھی پہچانی نہیں جا سکتی۔
جس سر پر دس ہزار روپے کا انعام تھا۔ وہ سر ہی غائب تھا! اس بے دھڑ لاش کو دیکھ کر انگریز ڈپٹی کمشنر نے شناختی کاغذوں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب انگریز ڈپٹی کمشنر نے انکار کر دیا تو دیسی راجہ کی کیا مجال تھی کہ موسے خاں کو انعام دیتا۔ نتیجے میں موسے خاں کو بے نیل و مرام اپنے علاقے کو لوٹ جانا پڑا۔ جہاں چند روز کے بعد اس کی لاش قلعے کی دیوار کے نیچے پائی گئی۔

(۵)

جس دن قفل ٹوٹا اور رنجے کا سر غائب ہوا۔ اُس دن شام کے وقت جب پتا جی گھر لوٹے تو بے حد خوش مسکراتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے "پیٹی جب کان اس بن میں" کا نغمہ اُن کے لبوں پر موجود تھا۔
"قفل کس نے توڑا؟"
"پیٹی جب کان اس بن میں" پتا جی جواب میں گنگناتے رہے۔
"میں کہتی ہوں ایک دن تم جیل میں جاؤ گے"
"پیٹی جب کان......"
"اور میں بازار میں بیٹھی بھیک مانگوں گی اور تمہارا بچہ؟"
"اس بن میں! اس بن میں!! اس بن میں!!!" پتا جی زور سے گانے لگے۔
پھر کچھ دیر کے بعد کھانے کے کمرے میں میری ماں سے کہنے لگے۔
"کاکے دی ماں۔ جانتی ہو اس دنیا میں سب سے قیمتی شے کونسی ہے؟"
"سونا!" میری ماں نے کہا۔
"نہیں آزادی! ـــ کاکے دی ماں۔ اس دنیا میں سب سے مہنگی اور سب سے قیمتی چیز آزادی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ہر موڑ پر اس کی پوری قیمت ادا کی ہے!

ممتاز مفتی

پہلا ایکٹ

شہر کا ایک مضاف جہاں دو ایک کارخانے ہیں اور بیشتر آبادی مزدوروں کی ہے۔
مضافی آبادی میں چانن چودھری کے کچے گھروندے کا ایک حصہ۔ چودھری صحن کے ایک حصے میں بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ بائیں ہاتھ کوارٹر کے دو کمرے ہیں۔ سٹیج کے پیچھے مکان کی کچی چار دیواری کا وہ حصہ ہے جو قدِ آدم سے نیچا ہے جس کے درمیان میں صدر دروازہ کھلتا ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ باہر گلی میں سامنے ایک سائیں بیٹھا ہے کبھی کبھار لوگ گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔
دیوار کے پیچھے دور دو اونچی لمبی چمنیاں ہیں۔
کچھ دیر تک چودھری چانن اپنے ہی خیال میں کھویا ہوا حقہ پیتا رہتا ہے
سٹیج کے پرے ایک کونے میں ایک سات سال کی بچی بیٹھی گڑیاں کھیل رہی ہے۔

سائیں (دفعتاً نعرہ لگاتا ہے) گھوڑ ہنیرا، اک چانن تیرا۔

چانن (چونکتا ہے، ہنستا ہے، سائیں کی طرف دیکھتا ہے):۔ سچ ہے سائیں۔ گھوڑ ہنیرا اک چانن تیرا۔ تو اپنا ڈیس لگا کر بیٹھا رہ۔ سُلفے کا سوٹا چلتا رہے۔ (ہنستا ہے)

دولہ (دروازے میں):۔ کیوں سائیں! موج میں ہے نا موج میں۔

چانن :۔ یہ تو سدا موج میں رہے ہے دولے۔ حلوا مانڈا ملتا ہے۔ سلفے کی چلم چلتی ہے۔ بس یہی اس کا چانن ہے۔ (ہنستا ہے)

دولہ (ہنستے ہوئے اندر داخل ہو کر):۔ سلام علیکم چودھری!

چانن :۔ سُنا کدٓ آیا تو دولے! آ بیٹھ۔ واسی لے۔

دولہ :۔ رات آیا تھا۔

چانن :۔ بیٹھ جا۔ بیٹھ جا۔ کہاں گیا تھا تو؟ (حقّے کا منہ موڑتا ہے)

دولہ :۔ گاؤں گیا تھا (بیٹھ کر)

چانن :۔ اپنے سوجووال؟

دولہ :۔ اور کہاں جانا ہے چودھری! اب تو وہی اپنا گاؤں ہے نا۔

چانن :۔ سنا کیا حال چال ہے وہاں کا؟

دولہ :۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں چودھری ساجو کی بھینس گابھن ہو رہی ہے۔ غلام محمد نے جمین بیچ دی۔

چانن :۔ جمین بیچ دی؟

دولہ :۔ ہاں بیچ دی!

چانن :۔ یہ اس نے اچھا نہیں کیا دولے۔ سمجھ لے جس نے جمین بیچ دی اس نے اپنی ماں بیچ دی۔

دولہ :۔ سچ کہے ہے چودھری۔ بے سک۔

چانن :۔ پر دیکھ لے تو۔ میں نے نہیں بیچی۔ چاہے گاؤں چھوڑ کر سہر آ گیا ہوں۔

دولہ :۔ وہ جیسب کے گھر والا محمد بھی آ رہا ہے سہر اور اپنے بیج نے نیا کوٹھا بنا لیا ہے۔

چانن :۔ ہوں! (حقہ پیتا ہے)

دولہ :۔ رحیمے گجر کے لڑکے کے ختنے پر گیا تھا میں۔ اپنا سنگی ہے نا، میں نے کہا ہو آؤں۔ یہ نہ کہے کہ سہر جا کر اپنوں کو چھوڑ بیٹھا۔

چانن :۔ اچھا کیا تو نے۔

دولہ :۔ گاؤں میں سب تیرا پوچھتے تھے۔

چانن :۔ میرا اب کیا پوچھنا ہے دولے۔

دولہ :۔ کہتے تھے چودھری چانن کب آئے گا اپنی جمین پر۔

چانن :۔ اب کہاں آنا کہاں جانا دولے۔ اب تو چودھری چانن اپنے آپ سے ہی گیا۔

دولہ :۔ تو تو کہتا تھا میں اپنی جمین پہ لوٹ جاؤں گا۔

چانن :۔ (آہ) ہاں کہتا تو تھا۔ اب تو خالی کہنا ہی کہنا رہ گیا ہے۔ کہہ کہہ کر اپنا جی راجی کر لیتے ہیں۔

(دونوں خاموشی سے حقہ پیتے ہیں۔ پینو گڑیا پکڑے پاس سے گزرتی ہے)

دولہ :۔ یہ کس کی ہے چودھری؟

چانن :۔ (چونک کر) یہ! یہ اپنی پینو ہے۔ منگاں کی بیٹی۔

دولہ :۔ منگاں کی!

(پینو کونے والے دروازے سے اندر چلی جاتی ہے)

چانن :۔ بہ کتے کی بہن منگاں!

دولہ :- اوہ!

(اندر سے مُنگاں کے کھانسنے کی آواز۔ لمبی مسلسل کھانسی پھر منگاں ہائے ہائے کرتی کراہتی ہے پھر نڈھال ہو کر پڑ جاتی ہے۔ باہر دونوں سُنتے ہیں چپ چاپ حقہ پیتے رہتے ہیں)

کون بیمار ہے۔ کیا بر کتنے ہے؟

چانن :- وہ کہاں بیمار پڑے گی۔ اُسے نہیں لگتی بیماری۔

دولہ :- تو بھی حد کرتا ہے چودھری (ہنس کر)

چانن :- حد کی اس میں کیا بات ہے۔ جا ہے دیکھ لے اندر جا کر گھنٹی کی طرح ٹن ٹن کرے ہے اس کی صحت۔ یہ تو منگاں ہے۔ کدسے گاؤں میں بیمار پڑی تھی۔ وہاں اکیلی پڑی تھی تو بہن نے یہاں بلا لیا دوا دارو کے لیے، پر حالت اچھی نہیں۔

دولہ :- اونہوں یہ کہاں بچے گی اسے تو بڑا روگ ہے۔

چانن :- بس آخری دموں پر ہے۔

دولہ :- تو پھر مٹی کھینچ لائی ہے نا۔ یوں کھو سھر کی مٹی میں سمانا جو لکھا ہے نصیب میں۔

چانن :- یہ نہ آتی دولے تو اللہ جانے میں تو تیار بیٹھا تھا۔

دولہ :- کس لیے؟

چانن :- گاؤں جانے کے لیے۔ جی چاہے ہے دولے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں چلا جاؤں، اپنی جمین پر۔ جبردستی چلا جاؤں پر جب بھی جانے لگتا ہوں کوئی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ اب کی بار یہ منگو آ گئی۔

دولہ :- جی چاہے ہے تو پھر رُکتے کیوں ہو؟

چانن :- مجھ کو حرام خوری کی لت پڑ گئی ہے۔ یہاں نکما پڑا رہا ہوں نا دو سال ہڈیوں میں سے کام نکل گیا ہے۔ آرام نے چاٹ لیا دولے۔ یہ بھی ہیضہ ہوتی ہے۔ آرام کی ہیضہ جسے لگ جائے سمجھ لو وہ اپنے آپ سے گیا۔

دولہ :- (ہنس کر) پھر کیتے ہو جانے کو جی بھی چاہے ہے۔

چانن :- (ہنس کر) ہاں جانے کو بھی جی چاہے ہے۔ جی کرتا ہے پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ پھر سے چودھری چانن بن جاؤں۔ اب تو لڑکوں کی روٹی پر پڑا ہوں نا۔ چودھری چانن نہیں بر والا کمین بنا بیٹھا ہوں۔ سمجھ کر لو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو تو مرد اور جو دوسروں کی کمائی پہ بیٹھا ہو وہ مرد نہیں ہوتا زنخا ہوتا ہے۔ (نفرت) زنخا۔

دولہ :- تو بھی عجیب باتیں کرے ہے چودھری! اللہ کے فضل سے اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔ تین بیٹے ہیں —— ان بھلا بچھڑے ملنے کا پتہ چلا کچھ؟

چانن :- اونہوں۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔

دولہ :- گاؤں میں بھی فکر کرتے تھے جلیسے کے بارے میں۔

چانن :- نہیں دولے فکر کی بات نہیں۔ میں جانوں وہ گھر سے بھاگ گیا ہے‘ آجائے گا کسی روج ——— اور ———

(برکتے داخل ہوتی ہے‘ کرنے والے کرے سے۔ خود بخود باتیں کیے جاتی ہے۔
دولے اور چانن کی طرف نہیں دیکھتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی ہے جس میں
دال پڑی ہے اور وہ اس میں سے کنکر چُن رہی ہے)

برکتے :- گھر کی عبت کا کھیال بھی ہو کسی کو۔ سب کیا کرایا کھاک میں ملا دیا۔ اس لڑکی کا دھیان تو بس بننے سنورنے میں لگا ہے روج اللہ مارا اخروٹ کا چھلکا لیے بیٹھی رہتی ہے۔ دانت نہ ہوئے چھُریاں ہو گئیں۔ (دفعتاً دولے کو دیکھ کر) کیا تو دولا ہے؟

دولہ :- سلام کہتا ہوں بہن۔

برکتے :- جیتا رہ اللہ جندگی دے۔ تو کیا گاؤں گیا تھا؟

دولہ :- ہاں بہن! ابھی بتا رہا تھا چودھری چانن کو کہ گاؤں والے بڑا فکر کریں ہیں اپنے علیہ کے بارے میں۔

برکتے :- ہے میرا علیہ ——— پر اس سے بات کرنے کا فائدہ۔ اسے گھر کے دُکھ درد سے واسطہ بھی ہو کوئی۔ اتنا نہیں کہ شہر میں جا کر علیہ کو ڈھونڈے۔ بس حُقّہ لیا اور بیٹھ رہا۔ اللہ اللہ خیر سلا!

چانن :- یہ تو بس اپنی ہی ہانکتی ہے۔ علیہ کوئی بچہ تو تھا نہیں کہ کھو جاتا۔ بھئی چھ جماعتیں پاس تھا اللہ کے فضل سے‘ بارھویں سال میں تھا۔

برکتے :- ہے میں جانوں کسی موٹر تلے آ گیا بس۔ (آنسو پونچھتی ہے) میرا پلا پلایا جوان گھبرو۔

چانن :- جو موٹر تلے آ گیا تو اب ایک مہینے بعد ڈھونڈنے کا فائدہ۔ ہاں موٹر تلے جو آ گیا دولے اسے نا بھی۔

برکتے :- سُن لے سن لے تو اس کی بات۔ یہ تو چاہے ہے کہ میرا بیٹا موٹر تلے آ جائے۔

چانن :- کسی طور جینے نہیں دیتی یہ تمہاری بہن۔ جو کہوں اللہ چاہے تو لڑکا خیر سے ہے تو کہے ہے نہیں جرور موٹر تلے آ گیا ہے اور جو کہوں موٹر تلے آ گیا ہے تو آنسو چھلکائے ہے۔ طعنے دے ہے۔ بھئی واہ!

دولہ :- (ہنستا ہے) اب تم آپس میں نہ جھگڑو۔

چانن :- ہر وقت جھگڑتی ہے۔ ٹوکتی ہے‘ جبھی تو علیہ تنگ آ کر بھاگ گیا گھر سے۔ اسی کی وجہ سے بھاگا ہے وہ۔ ٹھیک نہ ہو تو میرا جمعہ دے لے تو سوچ نا دولے۔ جوان لڑکا تھا۔ ہر وقت کی ٹوک‘ ہر وقت کی ٹوک‘ جندگی حرام کر رکھی تھی اس کی سو وہ گھر سے بھاگ گیا اس کی وجہ سے۔

برکتے :- کیوں میری وجہ سے کیوں؟ میں کیا ایسی بُری ہوں۔

چانن :- تو‘ تو تو اس گھر کی گدھ ہے۔ گھر کو لاش بنا رکھا ہے تاکہ تیری چونچ ہری رہے۔

دولہ :- نہ بھئی چودھری گھر والی سے نہیں لڑا کرتے۔

چانن :- اس سے کون لڑ سکتا ہے دولے۔ کس میں جان ہے جو اس سے لڑے۔

برکتے :۔ سُن لے تو اس کی باتیں۔ بھلا ماں سے پُتر بھاگ جائے۔

چانن :۔ تینوں پُتروں کے سروں پہ ہر وقت ٹھونگے مارتی رہتی ہے۔ بچارے گُنگے ہو گئے ہیں پر ہیں بے جان۔ چپ چاپ ظلم سہے جاتے ہیں۔ ٹکر ٹکر اس کا منہ تکتے ہیں۔ ان پر جننے کا احسان کر رکھا ہے دو لے اس لیے اب چاہے جتنا ظلم کر لے وہ چھوٹا کچھ جان والا نکلا سو وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔

برکتے :۔ ہے کتنا جھر ہے اس کے دل میں میرے لیے۔

(کمرے میں نگاں کو پھر کھانسنے کا دورہ پڑ جاتا ہے اور وہ مسلسل کھانستی ہے۔ بے حال ہو جاتی ہے۔ باہر چانن، برکتے اور دولہ متفکر انداز سے سُنتے ہیں)

چانن :۔ جا جا اندر بہن کی سُدھ لے۔ دو روز کی مہمان ہے وہ۔

برکتے :۔ ہے میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ (آنسو پونچھتے ہوئے کونے کے دروازے سے اندر چلی جاتی ہے)

دولہ :۔ اچھا تو چودھری میں چلتا ہوں۔

چانن :۔ بیٹھ گھڑی دو گھڑی۔ تمباکو رکھوں۔

دولہ :۔ نہیں بھئی۔ مجھے جھی جانا ہے اسبگول لانے۔

چانن :۔ کیوں، اسبگول کیوں؟

دولہ :۔ پیٹ میں گڑبڑ ہے کچھ کچھ۔ (حقہ پینے لگتا ہے)

چانن :۔ اچھا تو لے آ۔ دیکھیو چھلکا نہ لائیو۔ ثابت اسبگول ہو (چلا کر، دولہ دروازہ کے پاس جاتا ہے)

دولہ :۔ اچھا بھئی ثابت ہی لاؤں گا۔ (دروازے کے قریب سے)

(دولہ دروازے پہ کھڑا ہے، ابھی باہر نہیں نکلا۔ اکبر داخل ہوتا ہے)

اکبر :۔ سلام کہتا ہوں چاچا۔

دولہ :۔ جیتا رہ ــ کہاں سے آیا ہے تو؟

اکبر :۔ کرتنے سے۔

دولہ :۔ اس وقت؟

چانن :۔ اوبر ٹیم لگا کے آیا ہے تو۔

اکبر :۔ (اندر آ جاتا ہے) ہاں بابا!

(دولہ باہر نکل جاتا ہے)

چانن :۔ تجھے جو کہا ہے کہ اوبر ٹیم نہ کیا کر۔

اکبر :۔ (خاموش)

چانن :۔ بولتا نہیں ــ جواب دے۔

اکبر :۔ ماں نے کہا تھا۔ (کمرے کی طرف جاتا ہوا رک جاتا ہے)

چانن :۔ اور وہ جو تیری گھر والی رستہ تکتی رہتی ہے تیرا' وہ؟

اکبر :۔ ماں نے کہا تھا ماسی بیمار ہے اس کا دوا دارو کرنا ہے پیسہ چٹے۔

چانن :۔ وہ کیا بچ جائے گی دوا دارو سے۔

اکبر :۔ مجھے کیا خبر؟

چانن :۔ تجھے کچھ خبر بھی ہے۔ کبھی اپنی لوگائی کی بھی خبر لی ہے تو نے جسے اپنے گھر میں لا کر باندھ رکھا ہے۔ جو کڑھنے ہیں اور بڑھیم ہی کرنا تھا تو اسے کیوں لا کر باندھ دیا یہاں۔ کیوں بیاہ کیا؟

اکبر :۔ ماں نے کہا تھا بیاہ کروں گی تیرا۔ میں نے کہا جو کرنا ہی ہے تو نے تو کر دے۔

چانن :۔ تو پھر اب وہ تجھ سے اوبڑھیم کیوں کراتی ہے؟

اکبر :۔ پوچھ اس سے۔

چانن :۔ اس سے کیا پوچھنا۔ مجھے معلوم ہے۔

اکبر :۔ تو پھر مجھ سے کیوں پوچھے ہے تو؟

چانن :۔ تاکہ تجھے بھی معلوم ہو۔ اس لیے کراتی ہے اوبڑھیم تجھ سے تاکہ اپنے بیٹے کا راشن کر کے لوگائی کو دے۔

اکبر :۔ مجھے نہیں سمجھ میں آتا۔

چانن :۔ کب آئے گا تیری سمجھ میں۔ ہوش کر اب تو مرد ہے' ماں کی گودی سے نہ چمٹ۔ (اپنے آپ سے) مجھے تو تیری لوگائی سے ڈر لگتا ہے۔

اکبر :۔ ڈر کس لیے بابا؟

چانن :۔ وہ جے ناں نہیں وہ تو جن ہے' اگو نگا جن ہے۔ جن اور رجن میں کچھ زیادہ پھرک نہیں ہوتا۔

اکبر :۔ تو تو ماں کو سمجھا۔ مجھے نہیں معلوم یہ باتیں۔

چانن :۔ جاگتے کو کون جگائے پتر۔ تیری ماں سب جانتی ہے وہ یہ سب کھود بیٹ چکی ہے۔

اکبر :۔ ایک بات پوچھوں بابا؟

چانن :۔ پوچھ

اکبر :۔ جے ناں نے تو نہیں کہا کچھ تجھ سے۔

چانن :۔ (ہنس کر) جو وہ کہنے والی ہوتی تو پھر پھکر کس بات کا تھا۔ وہ پھنکارنے والی نہیں' بل کھانے والی ہے بولتی نہیں۔ پر جب نگاہ بھر کر دیکھتی ہے تو اپنا کو ٹھا لرزتا ہے۔ جانے کس روح دم سے آ رہے نیچے' تو آ اوبڑھیم کرنا چھوڑ دے۔ اس کا ٹھیم نہ چھین۔ چاہے ماں کچھ بھی کہے' یاد رکھ میری بات پلّے باندھ لے ـــــ وہ شیدا ہے اوبڑھیم کرنے کو۔ چاہے روح کرے' گھر لوگائی جو نہ ہوئی۔

اکبر :۔ ماں کہتی ہے شیدا نہ لگائے اور بڑھیم
چانن :۔ دیکھ لیا نا۔ بہو پہ حکومت کرنا چاہتی ہے تیری ماں۔ شیدے کی گھر والی جو نہ ہوئی پھر حکومت کیسی؟ تیری تو ہے بھی تجھے ہی لگاتی ہے اور بڑھیم پر۔

(جے ناں اپنی ہی دُھن میں باہر نکلتی ہے ـــ ورلے دروازے سے۔ وہ گندمی رنگ کی ٹیار ہے۔ بھرا بھرا جسم، ماتھے پر تیوری، موٹی موٹی آنکھیں، بارعب، خاموش)

جے ناں :۔ پینو! پینو! کہاں گئی؟ اے پینو!
(دفعتاً اکبر کو دیکھتی ہے۔ رُک جاتی ہے)

چانن :۔ (بابا گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے) میں ذرا غلام مدکے گھر سے ہو آؤں، تو جب تک تبا کو رکھ دے جے ناں! (چودھری چل پڑتا ہے)

(جے ناں نے گویا بابا کی بات نہیں سُنی۔ وہ ویسے ہی کھڑی اکبر کو دیکھ رہی ہے اکبر اس کی نگاہ تلے گھبرایا ہوا ہے۔ آنکھ نہیں ملاتا)

جے ناں :۔ مجھے بتا کر کیوں نہ گیا اور بڑھیم کرنے؟
اکبر :۔ (خاموش)
جے ناں :۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں؟
اکبر :۔ کیا پوچھ رہی اے؟
جے ناں :۔ پہلے تو گونگا تھا اب بہرا بھی ہو گیا کیا۔ میں کہتی ہوں مجھے بتا کے کیوں نہ گیا اور بڑھیم کرنے۔
اکبر :۔ میں نے کہا تو گرمی کھائے گی
جے ناں :۔ اور ایسے نہیں کھاؤں گی گرمی؟
اکبر :۔ تیرا تو کام ہی ہے گرمی کھانا۔
جے ناں :۔ تو نہ کھائیو گرمی۔ برف ہی رہیو۔
اکبر :۔ کس پر کھاؤں گرمی؟
جے ناں :۔ اپنی ماں پر اور کس پر۔
اکبر :۔ کیوں؟
جے ناں :۔ جس نے تجھے جوت رکھا ہے گھر کا چھکڑا ہانکنے کو۔ باقی سب بیٹھ کر کھاتے ہیں۔
اکبر :۔ (خاموش)
جے ناں :۔ وہ شیدے سے کیوں نہیں کراتی اور بڑھیم؟
اکبر :۔ مجھے نہیں پتہ۔

جے ناں :- کچھ پتہ بھی ہے تجھے؟
اکبر :- (خاموش)
جے ناں :- ہوش کر۔ مر دبن، کیوں اپنی ہڈیاں گال رہا ہے تو؟ کس کے لیے؟
اکبر :- بس اب چھوڑ۔
جے ناں :- اپنا کنبہ کم تھا کیا جو وہ بہن کو اٹھا لائی ہے۔ اب کر اس کا دوا دارو۔
اکبر :- وہ تو چار روز جئے گی۔
جے ناں :- اور جو اس کی لڑکی ہے بینو، وہ؟
اکبر :- اس کا کیا ہے؟
جے ناں :- کہاں جائے گی وہ ماں کے مرنے کے بعد
اکبر :- جانا کہاں ہے اس نے؟
جے ناں :- ساری عمر کا بوجھ بن جائے گی وہ تیرے سر پہ، پہلے پال پھر اس کا بیاہ کر۔ (وقفہ) دوسروں کے بچے پالتا رہ اپنے ہوں گے تو کیا کرے گا؟
اکبر :- اپنے تو دے بھی؟
جے ناں :- میں نہیں دیتی کیا؟
اکبر :- دے کے دکھایا بھی ہو، چھ سال بہت گئے۔
جے ناں :- تو اور بر تیم کرے اور میں نہیں دیتی۔
اکبر :- چھ سال کے لنڈورے بیٹھے ہیں۔
جے ناں :- اپنا گھر ہو، اپنا دکھت ہو۔ اپنی مرضی سے جاگیں اپنی مرضی سے سوئیں جب بات ہے اور اب! اب تو تو کولھو کا بیل بنا ہوا ہے اور میں بیٹھی تیری راہ دیکھتی ہوں اور تیری ماں یوں دیکھے ہے میری طرف جیسے کسائی دیکھتا ہے بھینس کو۔ گھر تو اس کا ہے ہم تو بردے ہیں ——— بردے۔
اکبر :- اب چھوڑ بھی۔
جے ناں :- کیسے چھوڑوں۔ بتا تو وہ بابا کو کیوں نہیں جانے دیتی اپنی جگہ پہ۔ جب بھی وہ تیار ہوتا ہے اسے روک لیتی ہے اور تیری ماں آپ کیوں بیٹھی ہے یہاں شہر میں۔
اکبر :- تو پھر میں کیا کروں؟
جے ناں :- تو اور بر تیم کر۔ جا۔ تو آ کیوں جاتا ہے گھر میں؟
اکبر :- تو تو کھوامکھواہ بگڑتی ہے۔
جے ناں :- کیوں نہ بگڑوں! اس گھر میں رکھا ہی کیا ہے میرے لیے؟ جا تو، جا کر اوبر تیم لگا۔

اکبر :- تجھے نیند نہیں آتی کیا میرے بنا؟
جے ناں :- ہاں نہیں آتی۔
(گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ جے ناں اسے گھورتی ہے وہ نگاہیں جھکائے کھڑا ہے)
سائیں :- (باہر سے نعرہ لگاتا ہے) گھور اندھیرا۔ اک چانن تیرا۔
جے ناں :- سُنا کیا کہتا ہے سائیں؟
اکبر :- (خاموش نگاہیں جھکائے کھڑا رہتا ہے)
جے ناں :- میری طرف دیکھ۔
اکبر :- نہیں نہیں دیکھتا۔
جے ناں :- تو پھر جا کر او برٹیم۔ (کمرے کی طرف چل پڑتی ہے۔ اکبر کھڑا رہتا ہے۔ اندر سے برکتے پہلے دو ایک آوازیں دیتی ہے۔ جے ناں! جے ناں! پھر داخل ہوتی ہے کونے کے دروازے سے)
برکتے :- کس سے باتیں کر رہی تھی تو؟ (جے ناں آگے چل پڑتی ہے اور رک جاتی ہے)
جے ناں :- (خاموش)
برکتے :- (اکبر کو دیکھتی ہے) تو ——— تو آ گیا؟ میں نے بھی کما کیا بات ہے؟
اکبر :- ابھی آیا ہوں ماں ابھی ابھی!
برکتے :- جبھی اس کے دیدے پھٹے دے ہیں تجھے دیکھ کر۔ آواز نہیں سُننی سُننے لگی تو "میرے جوتے سے"
(جے ناں غصے سے دیکھتی ہے)
اکبر :- میں نے ہی روک رکھا تھا اسے ماں۔ یہ تو آ رہی تھی اندر۔
برکتے :- تو روکے گا؟ تو روکنے والا، اور یہ رکنے والی۔ ہنہ۔
اکبر :- نہیں ماں۔
برکتے :- بس رہنے دے مجھے کیا دکھتا نہیں؟ یہ تو تجھے نگاہوں سے کھا جائے گی۔ بس چلے تو تو بنا کر پنجرے میں ڈال لے۔
اکبر :- وہ بولتی نہیں ماں اور تو کہے جا رہی ہے۔
برکتے :- اسے بولنے کی جرات۔ یہ تو ان بولے بات کرتی ہے اگلا تو مجھے ہی پھاڑنا پڑتا ہے۔
(اس دوران میں جے ناں دونوں کو گھورتی ہے نگاہ میں غصہ، نفرت، تحقیر)
برکتے :- یہ بی بی تو جاڑ مانگے ہے۔ بس کھود ہو اور خصم پر تیجا نہ ہو کوئی۔
(جے ناں مڑتی ہے اور غیرت مندانہ انداز سے کمرے کی طرف چل پڑتی ہے۔ سو رلے دروازے سے اندر داخل ہو جاتی ہے)

برکتے :۔ دیکھ لو بہت بات کرنے کی واوا نہیں۔ بری بات پر کان نہیں دھرتی۔ یوں سر اٹھا کر چلتی پھرتی ہے گھر میں جیسے ملاؤ کی لٹک ہو۔ پر میں بتا دوں اس کو میں وہی ہو گا جو اس گھر میں ہوتا آیا ہے۔ آخر گھر کی عزت بھی کوئی چیز ہے۔ میں تو جان دے دوں گی بڑوں کی ریت کو ہاتھ سے جانے نہ دوں گی، ہاں! کان کھول کر سن لے تو۔

(چانن پچھلے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

چانن :۔ تو بڑوں کی ریت نہ چھوڑیو۔ گھر کی عزت گھر کی عزت کی مالا جپتی رہیو۔

برکتے :۔ بس تیری ہی کمی تھی۔

چانن :۔ تجھے کس کی کمی ہے بھاگوان! تو تو خود گھر کی ریت ہے۔

برکتے :۔ تو جب بھی کرے گا میرے کھلاف بات کرے گا۔

چانن :۔ تیرے کھلاف بات کر سکتا ہے کوئی اس گھر میں؟

برکتے :۔ تیرا بس چلے تو ــــــ

چانن :۔ کسی کا بھی نہیں چلتا۔ میرا کیا ہے۔

برکتے :۔ تیری بات تو جہر بھری ہوتی ہے۔

چانن :۔ تو میری بات چھوڑ اپنا کام کیے جا بھاگوان۔

برکتے :۔ میں نہ ہوں تو چوپٹ ہو جائے یہ گھر۔

چانن :۔ تو اپنا ریت کا چوپٹ کھیلتی رہ، ہاں!

اکبر :۔ چھوڑ ماں تو کیوں گصہ کرتی ہے۔

برکتے :۔ میرا غصہ کون سہے ہے یہاں؟

اکبر :۔ سبھی سہتے ہیں ماں!

برکتے :۔ وہ تیری جے ناں یوں دیکھتی ہے میری طرف جیسے ــــــ

چانن :۔ کیوں نہ دیکھے تو جو اس کے گھر والے سے اوبڑ ٹیم کراتی ہے۔

برکتے :۔ اور یہ مردوا۔ یہ مجھ سے ٹھٹھے کرتا ہے۔

چانن :۔ بھاگوان تجھ سے ساری جندگی گجاری ہے۔ میری بخشش کے لیے تو یہی بہت ہے۔ جندگی بھر تیری مانی ہے اب اگر جو کبھی کبھی ٹھٹھا کر لیا تو کیا ہوا؟

اکبر :۔ تو ہی جانے دے بابا! تو ہی چھوڑ۔

چانن :۔ میں کیسے چھوڑوں اکبر۔ میری تو یہ ساری جندگی کی مایا ہے۔ دیکھ لو یہی دھن کمایا ہے میں نے جندگی بھر۔

پینو :۔ ماسی! ماسی! (اندر سے) (گونے والے دروازے سے چھپتی ہوئی باہر نکلتی ہے) ماسی ماسی! ماں، ماں کو کیا

ہوگیا۔ ماسی!

بسکتے :- کیا ہوا ٹنگاں کو؟

پینو :- آنکھیں کھلی ہیں پر دیکھتی نہیں۔ منہ بند ہے ہلتی نہیں، بولتی بھی نہیں اور رہا تھ یوں ہلائے ہے پڑی جیسے کبوتر اڑا رہی ہو۔

برسکتے :- اسے خیر ہو۔ اللہ خیر کرے۔ (کونے والے دروازے سے اندر جاتی ہے)

(وقفہ)

پینو :- بابا!

چانن :- ہاں!

پینو :- کیا ہے ماں کو؟

چانن :- بیمار ہے۔

پینو :- کیوں ہے بیمار بابا؟

چانن :- تو جا اکبر۔ اُدھر جے ناں انتظار کرتی ہے تیرا۔

پینو :- تابھی نا بابا!

چانن :- اس کا جی نہیں اچھا۔ جا اکبر اس کے پاس بھی بیٹھا کر۔

اکبر :- اچھا جاتا ہوں۔ (چل پڑتا ہے)

چانن :- لڑیو نہیں اس سے۔

اکبر :- نہیں لڑتا۔ (کمرے میں داخل ہو جاتا ہے)

پینو :- بتانا بابا!

چانن :- کیا پوچھے ہے تو بول؟

پینو :- بیمار مر جاتے ہیں نا؟

چانن :- ہاں

پینو :- ماں کہتی تھی۔

چانن :- کیا کہتی تھی؟

پینو :- کہتی تھی بیمار مر جاتے ہیں، اللہ کے پاس چلے جاتے ہیں۔

چانن :- اچھا!

پینو :- کیوں چلے جاتے ہیں اللہ کے پاس؟

چانن :- پتہ نہیں۔

پینو :- ماں کہتی تھی میں نہیں مروں گی۔

چانن :- اچھا!

پینو :- ہاں! مجھ سے کہتی تھی جب تک تیرا بیاہ نہ ہو جائے گا میں نہیں مروں گی۔ بابا! بیاہ کیا ہوتا ہے؟

چانن :- بیاہ! (ہنستا ہے) اب میں کیا بتاؤں کیا ہوتا ہے۔

پینو :- جیسے بیدی کا ہوا تھا نا ویسا؟

چانن :- ہاں ویسا!

پینو :- مجھے سب پتہ ہے۔

چانن :- اچھا!

پینو :- جب بیدی نے لال کپڑے پہنے تھے۔ مہندی لگائی تھی ہاتھوں پہ۔

چانن :- (ہنس کر) ہاں! ہاں!

پینو :- باجا بجا تھا اور ڈھولک رکھی تھی گھر میں۔ ہے نا بابا!

چانن :- ہوں!

پینو :- میں بھی مہندی لگاؤں گی ہاتھوں پر، لال جوڑا پہنوں گی۔ (تالی مار کر)

چانن :- ہاں ہاں! تو بھی دولہن بنے گی۔

پینو :- کب بنوں گی میں دولہن بابا؟

چانن :- پتہ نہیں۔

پینو :- پتہ کیوں نہیں؟

چانن :- (ہنس کر) پگلی مجھے کیا پتہ؟

پینو :- ماں کو تو پتہ ہے نا؟

چانن :- پگلی ابھی تو چھوٹی ہے۔ جب بڑی ہو جائے گی پھر۔

پینو :- کتنی بڑی بابا؟

چانن :- بہت بڑی۔

پینو :- میں کیا چھوٹی ہوں؟

چانن :- ہاں!

پینو :- اوں! میں تو اتنی بڑی ہوں۔ (پنجوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہے) کیوں بابا بڑی ہوں نا؟

چانن :- (ہنستا ہے) اچھا بڑا اپنے آپ سے) تم جنانیاں تو پیدا ہوتے ہی بڑی ہوتی ہو۔

پینو :- جنانیاں کون بابا؟

چانن :- کوئی نہیں۔

پینو :- ابھی جو کہہ رہے تھے تم۔
چانن :- جنانیوں کی بات کر رہا تھا میں، تیری نہیں۔
پینو :- وہ کیا ہوتی ہیں؟
چانن :- وہ بھی ہوتی ہیں۔ (اپنے آپ سے) جندگی میں ایک ہی کام ہوتا ہے ان کا۔
پینو :- کیا ہوتا ہے؟
چانن :- بس بیاہ۔ بیاہ! بیاہ! بیاہ! اللہ اللہ خیر سلا۔

(منجھلا بیٹا شیدا داخل ہوتا ہے۔ پچھلے دروازے سے۔ پتلا دبلا۔ عمر ۱۲ سال کے لگ بھگ، لمبا چہرہ، تیز طبیعت)

شیدا :- ماں کہاں ہے بابا؟
چانن :- تو کہاں سے آیا ہے اس وقت؟
شیدا :- رحمت کے گھر سے۔ ماں کہاں ہے؟
چانن :- میں سمجھا اوور ٹیم کر کے آیا ہے۔
شیدا :- نہیں تو۔
چانن :- تو کیوں نہیں کرتا اوور ٹیم؟
شیدا :- مجھے بتا بابا۔
چانن :- پھر بتاؤں گا۔ جا تو جا کھیل اب۔
شیدا :- بتا نا بابا۔
شیدا (غصے میں، پینو سے) جا دوڑ یہاں سے۔
پینو :- ہوں۔ بڑا آیا ہے۔ (منہ چڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے)
چانن :- ہوں بتا نا مجھے۔ تو کیوں نہیں کرتا اوور ٹیم۔ بڑے بھائی کو دار پر چڑھا رکھا ہے تو نے۔ وہ لوگائی والا ہے اسے گھر رہنا چاہیے۔ تو تو اکیلا ہے۔
شیدا :- ماں کہتی ہے۔
چانن :- کیا کہتی ہے؟
شیدا :- کہتی ہے جب تک بڑا بھائی سر پہ ہے تو کیوں کرے اوور ٹیم۔
چانن :- آخر کیوں؟
شیدا :- کہتی ہے یہی ہے بڑوں کی ریت۔
چانن :- اس کی ریت ہیں سے ڈوبی۔ تو ہی بتا کیا اچھی لگتی ہے یہ بات کہ تو تو مزے کرے اور بڑے بھائی کو کوئیں جوت رکھے۔

شیدا :- مجھے نہیں معلوم ماں جو کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔

چانن :- تو بھی کچھ کہے گا یا نہیں؟

شیدا :- میں کیا کہوں۔

چانن :- آخر کچھ تو پھوٹ منہ سے۔

شیدا :- بابا تو ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟

چانن :- کیسی باتیں؟

شیدا :- ہر وقت ایسی بات کرتا ہے جیسے جیسے ———

چانن :- جیسے کیا؟

شیدا :- جیسے ———

چانن :- بول بھی۔

شیدا :- پتہ نہیں کیسے کہوں؟

چانن :- جا ماں سے پوچھ لے جا کر۔

شیدا :- دیکھا پھر ویسی بات ——— تو ہر سمے مجھے ماں کا طعنہ کیوں دیتا ہے۔ مجھے اس کے کھلاف کسانا کیوں ہے ایسا نہ کیا کر بابا۔

چانن :- کیوں؟

شیدا :- مجھے نہیں اچھا لگتا۔ ماں جو کرتی ہے ٹھیک کرتی ہے۔ وہ گھر چلاتی ہے، گھر کی عجت کا کھیال رکھتی ہے، کہتی ہے ہمارا سر نیچا نہ ہو۔

چانن :- ہنہ! سر نیچا نہ ہو۔

شیدا :- اور تو ہر وقت ماں سے چڑتا ہے۔

چانن :- پاگل۔

شیدا :- وہ ہر بات میں تیرے گھر کی عجت کا کھیال رکھتی ہے تیرا ساتھ دیتی ہے پر تو نہیں دیتا اس کا ساتھ۔

چانن :- تیرا کیا ہے تجھ سے تو ماں کہے کہ بابا کا سر کاٹ لا تو تو دیر نہ کرے گا۔ باپو کا سر کاٹ کر اس کے قدموں میں رکھ دے گا۔ ہے نا!

شیدا :- ایسی بات نہ کر بابا۔

چانن :- جھوٹ ہے کیا؟

شیدا :- ماں ایسی بات کبھی نہ کہے گی۔

چانن :- جو وہ کہہ دے تو۔

شیدا :- وہ نہیں کہے گی۔ میں جو کہہ رہا ہوں تو کھوا مکھواہ رٹے جا رہا ہے وہی بات۔ ماں وہی کہتی ہے جو ٹھیک ہوتا ہے جو میں

گھر کی ہیٹی نہیں ہوتی۔ تیری عزت پر بٹہ نہیں لگتا۔ گھر تو تیرا ہی ہے نا۔ پھر تو کیوں ماں کے کھلاف جہر اگلتا ہے؟

چانن :۔ جاجا جو ماں کہتی ہے وہی کر۔ مجھ سے کیوں الجھتا ہے؟

شیدا :۔ (غصے میں) ماں وہی کروں گا ۔۔۔ پھر! (کونے والے کمرے کی طرف چل پڑتا ہے)

(اکبر باہر نکلتا ہے ورلے دروازے سے)

اکبر :۔ اے شیدا! اُدھر اس کوٹھڑی میں نہ جا۔ ماسی کی حالت اچھی نہیں، عورتیں آرہی ہیں، اِدھر آجا۔ شاید آج کی رات نہ گجار سکے گی۔

چانن :۔ تو حکیم کو بلا لو۔

اکبر :۔ ماں کہتی ہے حکیم کو بلانا بے کار ہے ۔۔۔ ماسی کی جبان بند ہو گئی ہے۔

چانن :۔ بے ہوش ہو گئی ہو گی۔

اکبر :۔ نہیں آنکھیں کھلی ہیں۔

چانن :۔ ماں سے پوچھ کر ڈاکدار کو بلا لا۔

اکبر :۔ ماں اُدھر گئی ہے۔

چانن :۔ کدھر؟

اکبر :۔ سائیں کے پاس۔

چانن :۔ ادھر سے تو نہیں گجری۔

اکبر :۔ پچھلے دروجے سے گئی ہے۔ میرے سامنے گئی ہے۔

چانن :۔ اچھا!

(شیدا اور چانن پچھلے دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سائیں کے پاس برکتے بیٹھی ہے سائیں سلیٹ پر کچھ لکھ رہا ہے۔ حساب کر رہا ہے)

سائیں :۔ (دفعتاً سر اٹھا کر) گھور ہنیرا۔ اک چانن تیرا۔

جینا مرنا اس کے ہتھ میں ہے
کوئی دم نہ مار سکے
پتہ نہ ہل سکے
حکم بنا
اک اللہ اور بس۔ باقی سب ہوس

چانن :۔ چکا ہوا ہے سائیں بھی۔

اکبر :۔ ماں جو گئی ہے پاس۔

چانن :- تیری ماں نے تو اسے پیر بنا رکھا ہے۔

سائیں :- اس کے من میں فکر ہے

جب تک دل میں رولا ہے

شانت نہ ہوگی

چنتا فکر، رولا دور کرو

سب چنتا کا رولا ہے

چنتا دور کرو

من شانت کرو

کالا بکرا دو

اک اللہ اور بس باقی حرص ہوس

(وقفہ)

چانن :- باتوں کا دھنی ہے۔ باتوں کی کمائی کھاوے ہے۔ جانیں کہ پاگل کر رکھا ہے۔ تمہاری ماں کسی کی نہیں مانتی، کسی کی نہیں سنتی۔ سوائے سائیں کے۔ اس کے سامنے جا کر تو یوں ہو جاتی ہے جیسے پانی ہو۔

شیدا :- توبہ بابا! ماں کے خلاف بات کرنے سے نہ مجھ کو کبھی۔

اکبر :- تو چپ کر بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے۔

چانن :- بول لینے دے اسے۔ دل کی بھڑاس نکال لینے دے یہ بھی بولنا سیکھے مرد بنے۔ جانی بنا بیٹھا ہے۔

برکتے :- (روتی ہوئی صحن کے دروازے سے داخل ہوتی ہے) بس وہی ہوا جو ہو کر رہنا تھا۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

شیدا :- کیا ہوا ماں؟

برکتے :- وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے اس گھر میں۔

چانن :- وہی ہوگا جو تو چاہے گی۔ تو ہی اس گھر کی ہونی ہے۔

برکتے :- بس تو نہ بول بیچ میں۔

(برکتے سر پکڑ کر کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے)

چانن :- جیسے تیری مرضی۔

برکتے :- میری مرضی کون جانے۔ وہی ہوگا جو بڑوں کی ریت ہے۔ جو باپ دادا کرتے آئے۔ جس میں گھر والے کی شوبھا بڑھے۔

شیدا :- ہاں ہاں ماں تو کہہ تو سہی۔

برکتے :- جو تو میرا پتر ہے، جو تو نے میرا دودھ پیا ہے تو اب اس کا حق ادا کرنا ہوگا۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ برکتے کے لڑکوں نے اپنے بڑوں کی ریت توڑ دی، گھر کی عزت پر بٹہ لگایا۔

اکبر :- تو پھکر نہ کراں۔

برکتے :- کیسے نہ کروں پھکر۔ اُدھر تمہاری ماسی پڑی ترطپ رہی ہے۔ جبان بند ہو چکی ہے، دھڑ میں سے جان نکل چکی ہے پر وہ مر نہیں سکتی۔ یونہی تڑپتی رہے گی۔ ہونٹوں پر جان اٹکی رہے گی۔ وہ نکاح میں ہی رہے گی۔ مجھ سے اس کا دُکھ دیکھا نہیں جاتا۔ (روتی ہے) ہے میری راندھن۔ کوئی اپنا نہیں، کوئی دُکھ بانٹنے والا نہیں۔ (ہچکی)

شیدا :- تو بات تو کراں۔ رونے کیوں ہے۔ ہم تیرے پُتر ہیں تو حکم کر۔

اکبر :- ہم کیا بیگانے ہیں ماں؟

برکتے :- اپنے بن کر دکھاؤ تو اپنا سمجھوں میں (آنسو پونچھتے ہوئے)

چانن :- تو مطلب کی بات کرنا۔

برکتے :- (غصے میں) تو نہ بول بیچ میں۔ میں اپنے پُتروں سے بات کر رہی ہوں۔ تجھے کیا لینا دینا ہے۔ میری عزت تیرے ہاتھ میں نہیں، میرے پتروں کے ہاتھ ہے شکر ہے اللہ کا۔

اکبر :- تو نہ بول بابا۔

چانن :- میں تو پہلے ہی چپ ہوں۔

شیدا :- تو ہم سے بات کراں۔ ہم جو سنتے ہیں تیری بات۔

برکتے :- وہ نہیں مرے گی۔ اس کی روح کو چین نہیں آئے گا جب تک ———

شیدا :- جب تک کیا۔

برکتے :- جب تک اس کی اکلوتی بچی کو سہارا نہ مل جائے۔

اکبر :- ہم جو ہیں ماں۔ ہماری بہن ہے وہ۔

برکتے :- بہن کون بناتا ہے۔ سب منہ زبانی کی باتیں۔

اکبر :- ہم جو بنانے ہیں۔

برکتے :- جو کل میرا دم نکل جائے تو ——— کیا تمہاری گھر والیاں اسے گھر میں رکھیں گی، اسے اپنا سمجھیں گی؟ اور کل جب وہ جوان ہوگی تو کس طرح اس گھر میں رہ سکے گی؟ لوگ کیا کہیں گے؟ گھر کی عزت کے پرچے اڑیں گے۔ لوگ باتیں کریں گے طعنے دیں گے۔ اگر سگّاں کی لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہوتا تو اور بات تھی پر یہ لڑکی ہے۔ ہاں!

اکبر :- تو پھر اس کا کیا ہو سکتا ہے؟

برکتے :- جب تک میری بہن کی آنکھوں کے سامنے پینو کا نکاح نہیں ہوتا وہ شانت نہیں ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ میں کہتی ہوں نہیں ہوگی۔

چانن :- تو کس سے نکاح کرے گی تو پینو کا؟

برکتے :- پھر تو نے دیا دخل؟

اکبر :- آخر تو بتائے گی تو ہی پتہ چلے گا ہمیں کہ تیرے دل میں کیا ہے۔

چانن :۔ اس کے دل کا پتہ چلا ہے بھلا کسی کو کبھی؟

سائیں :۔ گھور ہنیرا۔ گھور ہنیرا۔ (اٹھ کر چلا جاتا ہے، گھنٹیاں بجتی ہیں، دیر تک خاموشی)

چانن :۔ (ہنس کر) واہ سائیں آج تو سچی کہہ دی۔

شیدا :۔ تو چھوڑ مذاک کو بابا۔ ہاں ماں بتا نا

اکبر :۔ کس کا نکاح کرے گی تو پینو سے۔

برکتے :۔ شیدے کا۔

(سب بولتے ہیں۔ شیدے کا پینو سے، حیرت سے دیکھتے ہیں)

اکبر :۔ ماں! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟

برکتے :۔ یہ ہو کے رہے گا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ مرتے وقت بھی بہن نے سہارا نہ دیا۔ بہن کی لاج نہ پالی۔ اس کی معصوم بچی کا ہاتھ نہ تھاما۔

چانن :۔ لیکن شیدے سے؟

شیدا :۔ میں ...... میں ...... ماں ...... میں ......

برکتے :۔ ہاں تو۔ تو جو میرا پتر ہے تو میری لاج رکھے گا۔ گھر کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ جو تو نے میرا دودھ پیا ہے تو میرے چٹے سر پر دھول نہ ڈلوائے گا۔

اکبر :۔ لیکن ماں! کوئی جوڑ بھی ہو دونوں کا۔

برکتے :۔ شیدے کیا تو مجھے ذلیل کروائے گا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ لوگ میرے منہ پر تھوکیں؟

شیدا :۔ ماں ......

برکتے :۔ ماں کہتے شرم نہیں آتی۔ جو ماں کہتا ہے تو پھر ماں کہنے کی لاج پال اور نہیں پال سکتا تو ماں کیوں کہتا ہے تو؟

شیدا :۔ بابا بول۔ تو کیوں نہیں بولتا (روتی آواز) بول بابا بول۔

چانن :۔ کیا بولوں میں؟ میں تو ساری جندگی بول نہ سکا۔ تم نے مجھے بولنے نہ دیا۔ تم جو میرے پتر ہو۔ مجھے اپنے پتروں نے بولنے نہ دیا۔ تم سب نے ہر بات میں ماں کا ساتھ دیا اور مجھے اپنا بیری سمجھتے رہے۔ الٹا مجھے ڈانٹتے رہے دھمکاتے رہے۔ اب میں کیا بولوں؟

برکتے :۔ تو کیا بولے گا۔ تجھے کیا پتہ گھر کی عزت کسے کہتے ہیں۔

چانن :۔ دیکھ لو یہ سامنے کھڑی ہے گھر کی عزت۔ جو یہ کہے وہی سچ۔ جو یہ کہے اسی میں گھر کی شوبھا ہے۔ جو یہ کہے وہی ہو کر رہے گا بس یہی دیوی ہے اس گھر کی۔ اس کی پوجا کرتے کرتے جیون بتا دیا۔ اس کے چرنوں میں پھول چڑھاتے چڑھاتے بڈھا ہو گیا۔ اب تم اس کے چرنوں میں پھول چڑھاؤ۔ اب تم سب اس کی بلیاں ہو۔ تم اپنے جیون کا بلیدان دو۔

(اس دوران میں بھے ناں کمرے سے نکل کر دروازے میں کھڑی باتیں سنتی رہی ہے)

جے ناں :- (اپنے آپ سے) ہنہ وڈیری ادیریاں کیا اپنے بیٹوں کا کلیجہ کھاتی ہیں۔

اکبر :- (چپکے سے۔ غصے میں) تو نہ بول جے ناں۔ تو کیوں آئی ہے ادھر؟

چانن :- تو کیوں روکتا ہے اسے؟ ساری دنیا تماشہ دیکھ رہی ہے۔ وہ کیوں نہ دیکھے تماشہ۔

برکتے :- میں کیا تماشہ ہوں؟

چانن :- تو تو مداری ہے۔ تماشہ تو ہمارا دیکھ رہی ہے تو۔ کیسے جا تماشہ اپنے بچوں کا۔ ان میں سے کسی میں جان نہیں۔ کوئی نہیں بولے گا۔ جتنا جُلم جی چاہے توڑ۔ یہ تو یہی کہنا جانتے ہیں۔ ماں کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔

برکتے :- میں کیا اپنے لیے کہتی ہوں۔ میری طرف سے چاہے جو جی میں آئے کرو۔ چاہے اپنی ناک کٹواؤ، گھر کی عجت پہ بٹہ لگاؤ، مجھے کیا لینا دینا۔

اکبر :- اس میں بٹے کی کیا بات ہے ماں؟ کیا ہم پینو کو نکاح کیے بغیر اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے۔

برکتے :- ہنہ اپنے گھر۔ یہ گھر کیا تمھارا ہے۔ اپنے گھر میں تمھاری کیا حیثیت ہے۔ کون جانتا ہے تمہیں؟ گھر گھر والی کا ہووے ہے۔ تمھاری گھر والی کا بس چلے تو ابھی مجھے گھر سے نکال باہر کرے۔ مجھے —اور کی بات چھوڑو۔ یوں نکال پھینکے جیسے دودھ سے مکھی نکالتے ہیں۔ تو کیا اپنی بیوی کا خصم بن سکا ہے کبھی۔ تیری کیا مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھے —— دیکھ تو کس طرح دیکھ رہی ہے میری طرف۔

جے ناں :- تو میری بات چھوڑ۔

برکتے :- کیسے چھوڑوں تیری بات۔ تیری بات تو تیرے ماتھے پر لکھی رہتی ہے چاہے کوئی پڑھ لے۔

اکبر :- پر ماں —

برکتے :- پر تو نہیں جانتی میں۔ کل پینو جوان ہوگی تو کس طرح رہے گی اس گھر میں۔ تم اسے بہن کہو گے پر دنیا کیا کہے گی اور پھر تم —— تمھارا بھی کیا اعتبار —— جوان لڑکی کو دیکھ کر تو سگے بھائیوں کے دیدے پھٹ جاتے ہیں آج کل۔ منہ بولی بہن کس شمار قطار میں ہے۔

چانن :- بھاگوان ——

برکتے :- بس تو نہ کر بات۔ میں کہتی ہوں پینو کا بیاہ شیدے سے (چھاتی بجاتی ہے) ہو کر رہے گا اور ابھی ہوگا۔ اسی وقت میں نے مولوی کو بلا بھیجا ہے۔

چانن :- نہ کر جلم نہ کر بھاگوان۔

برکتے :- تو نہ بول۔

چانن :- لوک ریت پوری کرنے کے لیے کیوں اپنے بیٹے کی قربانی دے رہی ہے تو۔

برکتے :- دے رہی ہوں۔ تو دخل دینے والا کون ہے؟

چانن :- اب کیوں نہیں بولتا تو شیدے؟

شیدا :- میں ہیں —— ہیں۔
چانن :- قربانی کے بکرے کی طرح میں ہیں کیا کرتا ہے۔
شیدا :- میں —— (ہچکی)
چانن :- دیکھ تو یہ بیس سال کا ہے اور یہ نو سات سال کی ہے۔
برکتے :- لڑکی کو جوان ہوتے دیر لگتی ہے کیا۔ کھمبھ کی طرح بڑھے ہے۔ آج اتی سی کل جوان۔
(شیدے کی ہچکیاں جاری رہتی ہیں)
چانن :- پر دونوں میں اتنا فرق ہے۔
برکتے :- (شیدے سے) تو کیا ٹھس ٹھس کر رہا ہے
شیدا :- ماں میں ——- میں تو۔
برکتے :- بول نا کیا بولتا ہے تو۔
شیدا :- ہیں۔
برکتے :- ہاں تو بول۔
شیدا :- میں تو کچھ نہیں بولتا ماں (ہچکی) کچھ بھی نہیں۔
(پینو سرخ کپڑے پہنے کونے والے کمرے سے داخل ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر
سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ شیدے کی ہچکی جاری رہتی ہے)
پینو :- دیکھ ماسی! میں نے لال کپڑے پہنے۔ دیکھ۔
(ہچکی)
پینو :- بابا! دیکھ۔ پھول والا لال کرتا۔ اچھا ہے نا!
(بابا سر ہلاتا ہے)
پینو :- بابا میں اپنے ہاتھوں پر مہندی لگاؤں گی۔
(شیدا ہچکی لیتا ہے)
پینو :- ماسی مجھے مہندی منگا دو۔
(خاموشی)
پینو :- بابا میں نے کہا تھا نا میرا بیاہ ہو گا (تالی بجاتی ہے) کہا تھا نا میں نے؛
(بابا سر ہلاتا ہے)
پینو :- اس وقت تو تو کہتا تھا نہیں ہو گا۔ کہتا تھا ابھی چھوٹی ہوں —— میں کیا چھوٹی ہوں —— کیوں ماسی —— اتنی بڑی تو ہوں ہیں۔

(رشیدا ہچکی لیتا ہے۔ برکتے مسکراتی ہے)
(رشیدا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے)

پلینو :۔ شیدا کیوں روتا ہے بابا۔ بیاہ پر تو گاتے ہیں۔ روتے تو نہیں۔ کیوں بابا!
(خاموشی)

بلینو :۔ کیوں شیدے تو تو روتا ہے۔ کیوں روتا ہے تو؟
(خاموشی)

پلینو :۔ کیوں بابا یہ بولتا نہیں۔

چانن :۔ اب کیا بولے گا یہ ——
بس کر شیدا —— اب تو ساری عمر کا رونا ہے۔ (تھپکتا ہے)

دولہ :۔ (صحن کے دروازے سے داخل ہو کر) بہن برکتے مولوی صاحب آ گئے۔

مولوی صاحب :۔ (مولوی صاحب صحن کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

وہی منظر۔ چھ ماہ بعد
صحن میں چند ایک تبدیلیاں ہو چکی ہیں جو ضمنی نوعیت کی ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے
چارپائی پر بجے ناں بیٹھی قمیص پر بٹن ٹانک رہی ہے۔
کچھ دیر کے بعد اکبر ورلے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اس نے پاجامہ اور
بنیان پہن رکھی ہے۔ ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا آئینہ اور کنگھی ہے۔

اکبر :۔ ماں اور بابا نہیں آئے ابھی قبرستان سے۔

بجے ناں :۔ ابھی کہاں۔ گھگو کی قبر پر ختم بھی تو دلانا ہے۔

اکبر :۔ اور رشیدا کہاں ہے؟

بجے ناں :۔ پتہ نہیں۔ کہیں گیا ہوگا۔

اکبر :۔ تو جلدی بٹن ٹانک نا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

جے ناں :۔ آج تو کیوں جا رہا ہے کرنے۔ آج تو چھٹی ہے۔
اکبر :۔ ہاں چھٹی تو ہے پر آج بڑا صاحب آ رہا ہے نا اس لیے۔
جے ناں :۔ کس لیے آ رہا ہے وہ؟
اکبر :۔ آج بزٹ ہے نا۔ جو صاحب خوش ہوا تو شاید ——
جے ناں :۔ شاید کیا؟
اکبر :۔ شاید ترقی مل جائے۔ اگلا گیڈ مل جائے تو سوچ ہو جائے۔
(آئینہ کہیں رکھ کر بال بنانے لگتا ہے)
جے ناں :۔ مل بھی جائے تو کیا؟
اکبر :۔ کیوں؟
جے ناں :۔ چاہے کتنا کمالے سب بھسم ہو جائے گا اس گھر کی بھٹی میں۔
اکبر :۔ بڑا جھر ہے تجھ میں۔
جے ناں :۔ (خاموش)
اکبر :۔ گھر کا نام سن کر آگ ہو جاتی ہے تو۔
جے ناں :۔ اپنا گھر ہو بھی۔ سرائے میں بیٹھے ہیں۔
اکبر :۔ بس ڈھاک کے وہی تین پتر —— اب بھی تو کش نہیں ہے۔ اب تو ہم نے اور برٹیم کرنا چھوڑ دیا ہے۔
جے ناں :۔ تو نے کہاں چھوڑا ہے؟
اکبر :۔ تو کس نے چھوڑا ہے؟
جے ناں :۔ وہ تو شیدے نے حد کر کے اور برٹیم کرنا شروع کر دیا ابھی تجھے چھوڑنا پڑا۔
اکبر :۔ چلو یونہی سہی کچھ تو مان تو۔
جے ناں :۔ شیدا تو بالکل بدل گیا ہے۔ وہ شیدا تو رہا ہی نہیں جب سے اس کا پینو سے نکاح ہوا ہے۔ چھ مہینے میں اتنا بدل گیا ہے۔
اکبر :۔ مجھے تو نہیں دکھتا۔
جے ناں :۔ تجھے کچھ دکھے بھی؟
اکبر :۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ مجھے تو صرف تو ہی دکھے ہے۔
جے ناں :۔ (لاڈ سے) ہنہ!
اکبر :۔ تجھ پر تو نئے سر سے جوانی آ گئی ہے۔
جے ناں :۔ گپیں نہ مار اب ——

اکبر :- تیری قسم! (ہاتھ میں ہاتھ تھام کر) ایسے دِکھ رہی ہے تو جیسے مکئی کی دودھیا چھلّی ہو۔

جے ناں :- ہٹ (ہاتھ چھڑاتی ہے)

اکبر :- بس اب اک لڑکا دے دے۔

جے ناں :- (شرماتی ہے) لے اپنی قمیض۔

اکبر :- (قمیص پہنتا ہے) بھئی واہ۔ تو تو دلہن بن گئی اب۔

جے ناں :- دیکھ لے۔

اکبر :- اب لڑکے کی ماں بھی بن نا۔

جے ناں :- شکر ہے تجھے بھی کھیال آیا۔

اکبر :- یہ قمیض کس کی ہے؟ (دوسری قمیص اٹھا کر)

جے ناں :- یہ رشیدے کی ہے۔

اکبر :- یہ رشیدا گھر کیوں نہیں رہتا اب؟

جے ناں :- گھر آ کے کیا کرے۔ اس کی نجر میں تو فاطاں تھی۔

اکبر :- کون فاطاں؟

جے ناں :- یہی اپنے ودلے کی لڑکی۔ (پڑوس کی طرف اشارہ کرتی ہے)

اکبر :- اچھا!

جے ناں :- کہتا تھا فاطاں سے بیاہ کروں گا۔

اکبر :- ماں کو پتہ تھا کیا؟

جے ناں :- ہاں! کیا نہیں جانتی وہ ہر بات پہ نجر رکھتی ہے۔ گھاگ ہے۔

اکبر :- تو ماں کے لیے دل میں میل ہی رکھیو۔ ہاں!

جے ناں :- اب تو رشیدا بھی ہٹ گیا ہے ماں سے۔ پہلے کمذہی ماں نے رشیدے کا نکاح جبردستی مینو سے کیا۔ اب مینو سے روج کہتی ہے۔ (ہنستی ہے)

اکبر :- کیا؟

جے ناں :- کہتی ہے تو نہ جایا کر رشیدے کے پاس۔ جس سے بیاہ ہو جائے اس کے پاس نہیں جایا کرتے۔

اکبر :- اچھا!

جے ناں :- اور کہتی ہے جو رشیدا تیری باہنہ پکڑے تو مجھے بتائیو۔

اکبر :- یہ تو عقل کی بات ہے۔ وہ بیس سال کا ہے یہ سات سال کی۔ اگرچہ ——

جے ناں :- اگرچہ —— ہنہ —— پہلے کیوں نہ سوچا اگرچہ —— اب عقل آگئی۔

اکبر :- تجھ سے کون سر کھپائے۔

جے ناں :- نہ کھپا۔

(وقفہ)

اکبر :- اور بچ وہ بینو ہے کہاں؟

جے ناں :- ورسے کے گھر گئی ہے۔ سارا دن میرے گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔

اکبر :- اچھا! وہ علیہ بھی تو تیرے گلے کا ہار بنا رہتا تھا۔

جے ناں :- وہ تو میرا رانجھا ہے۔

اکبر :- کتے کی طرح تیرے پیچھے پیچھے پھرتا تھا۔

جے ناں :- سچ پوچھو تو اس گھر میں جو مجھ سے کسی نے محبت کی ہے تو بس اک علیے نے کی ہے۔

اکبر :- اور میں جو کرتا ہوں؟

جے ناں :- مطلب کی ——— تو کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں۔

اکبر :- اچھی محبت کرتا تھا تیرا رانجھا کہ تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔

جے ناں :- وہ آئے گا ضرور آئے گا، بہت جلد آئے گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔

اکبر :- تجھے کیا پتہ کہ وہ کہاں ہے۔

جے ناں :- جہاں بھی ہے وہ خیر سے ہے۔ جانے سے پہلے کہتا تھا بھابی میں نوکری کر دوں گا اور جو کماؤں گا تجھے دوں گا سب ——— (ہنستی ہے) کہتا تھا ماں کو نہ بتانا۔ (ہنستی ہے)

اکبر :- بے وقوف ابھی سے نوکری کی سوچتا تھا۔ نوکری تو عمر بھر کرنی ہے۔ کچھ پڑھ لیتا اور ———

جے ناں :- اوہوں۔ پڑھنے نہ دے گا وہ۔ لے اب تو ٹھیک ہو گیا سب۔

اکبر :- اچھا تو میں چلتا ہوں اب۔

جے ناں :- ٹھہر ذرا۔ (دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے)

اکبر :- کیوں؟

جے ناں :- میں قرآن لے آؤں۔ اس کے تلے سے گزاروں گی تجھے۔ (اندر داخل ہو جاتی ہے)

اکبر :- (ہنستا ہے) اچھا! تو جلدی کر دیر ہو رہی ہے۔

اکبر :- (کچھ دیر کے بعد) آ بھی اب ——— کہاں چلی گئی۔

(وقفہ)

اکبر :- اوہو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں جاتا ہوں۔ اگلے برٹ پر سہی۔ (جاتا ہے)

(وقفہ)

(بے ناں قرآن اٹھائے دوسرے کمرے سے آتی ہے۔ خوشی شرق۔ اکبر کو غیر موجود دیکھ کر
دھک سے رہ جاتی ہے۔ دیر تک حسرت بھری نگاہ سے دیکھتی رہتی ہے)

بے ناں :۔ اللہ خیر کرے (اپنے آپ چپ چاپ آہستہ آہستہ واپس دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے)

(وقفہ)

پینو :۔ (باہر صحن کے دروازے سے داخل ہوتی ہے) دیکھو بے ناں ہی نے گڑیا کا کرتا ———— (دیکھتی ہے۔ بے ناں نہیں ہے' وہیں بیٹھ کر گڑیا کو کرتا پہنانے لگتی ہے)
(گڑیا سے باتیں کرتی ہے۔ بیٹھ دروازے کی طرف) اتنا اچھا کرتا ہے یہ اب تو پہن لے اسے۔ نہ بھئی' پہلے یہ کرتا اتار دے' یہ پرانا ہے۔ پھر نیا پہن لینا ہے نا بھئی۔ کتنا اچھا ہے یہ نیا کرتا۔ (کرتا پہناتی ہے)
(شیدا صحن کے دروازے میں سے داخل ہوتا ہے۔ ہاتھ میں بوتل ہے پینو کو اکیلی دیکھ کر ٹھٹھکتا ہے۔ دبے پاؤں اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کو بغل میں لے لیتا ہے۔ پینو چیخ مارتی ہے)

شیدا :۔ چیخیں کیوں مارتی ہے تو؟
پینو :۔ میں ڈر گئی۔
شیدا :۔ تو تو کھوا مخواہ ڈرتی ہے۔
پینو :۔ چھوڑ مجھے۔ چھوڑ بھی۔
شیدا :۔ آہستہ بول۔ شور کیوں مچاتی ہے؟
پینو :۔ تو چھوڑ مجھے۔
شیدا :۔ میں کہتا ہوں شور نہ مچا۔
پینو :۔ چھوڑ۔ ماں کہتی تھی جو تیرا ہاتھ پکڑے تو مجھے بتانا۔
شیدا :۔ نہ نہ ماں کو نہ بتانا۔ (چھوڑ دیتا ہے) تو تو کھوا مخواہ مجھ سے دور بھاگتی ہے۔
پینو :۔ ماں کہتی ہے جس سے پیار ہو جائے اس کے پاس نہیں جاتے۔
شیدا :۔ تو پھر بے ناں کیوں جاتی ہے اکبر کے پاس؟
پینو :۔ مجھے نہیں پتہ۔
شیدا :۔ تجھے کب ہوش آئے گا۔ کب بڑی ہوگی تو؟
پینو :۔ (کھڑی ہو جاتی ہے)۔
شیدا :۔ ابھی کہاں؟ (آہ)

(بے ناں دروازے سے سر نکالتی ہے۔ دیکھتی ہے۔ سسکتی ہے۔ پھر چھپ کر جاتی ہے)

پینو :- کیوں؟
شیدا :- دیکھ تو ابھی تو ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں تیرے پنڈے میں۔ ابھی تو پھول نہیں لگے۔ جیسے لکڑی کا تختہ ہو۔
پینو :- پھول ——
شیدا :- ہاں پھول!
پینو :- وہ کب لگتے ہیں؟
شیدا :- جب پنڈا بھر جاتا ہے۔ جیسے بے ناں کا ہے۔ جب تمہارا پنڈا بھر جائے گا پھر تم بھی بڑی ہو جاؤ گی۔
پینو :- ہاں! جب بے ناں بیٹھتی ہے تو چوکی بھر جاتی ہے۔
شیدا :- پھر تم بھی بیٹھو گی تو چوکی بھر جائے گی۔
پینو :- اچھا —— پھر —— پھر کیا ہو گا؟
شیدا :- پھر —— (سوچ میں پڑ جاتا ہے)
پینو :- بتاؤ نا۔
شیدا :- اب میں تمھیں کیا بتاؤں؟ (اپنے آپ سے) آہ!
پینو :- بتاؤ نا۔ بتاؤ بھی نا۔
شیدا :- شور نہ مچا۔
پینو :- کیوں؟
شیدا :- کسی نے سن لیا تو۔
پینو :- تو کیا۔
شیدا :- ماں غصے ہو گی۔
پینو :- میں کہوں گی، شیدے نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔
شیدا :- نہ نہ ایسا نہ کہنا۔ آ میں تجھے کچھ دوں۔
پینو :- کیا ہے؟
شیدا :- یہ دیکھ (پوٹلی سے ابلا ہوا انڈا نکالتا ہے) انڈا۔ میں تجھے چھیل دوں؟
پینو :- تو مجھے انڈا کیوں کھلاتا ہے۔ برفی کیوں نہیں لاتا میرے لیے؟
شیدا :- برفی تو خالی میٹھی ہوتی ہے اور انڈا تو گرم ہوتا ہے گرم۔
پینو :- ہوں یہ تو ٹھنڈا ہے۔
شیدا :- اوپر سے ٹھنڈا ہے اندر سے گرم ہوتا ہے۔
پینو :- اچھا!

شیدا :- یہ تمہیں گرما دے گا۔
پینو :- سچ!
شیدا :- ہاں ہاں!
پینو :- پھر؟
شیدا :- پھر تم جلد بڑی ہو جاؤ گی۔ تمہارا پنڈا بھر جائے گا جیسے جیناں کا ہے۔
پینو :- اچھا! (انڈا کھاتی ہے)
شیدا :- پر ماں کو نہ بتانا۔
پینو :- کیوں؟
شیدا :- ماں گُھسے ہوگی۔
پینو :- جے ناں کو بتا دوں؟
شیدا :- نہ نہ۔ کسی کو نہیں بتایا کرتے۔
پینو :- جب میں ماں کے ساتھ سوتی ہوں تو وہ پوچھتی ہے۔
شیدا :- تو ماں کے ساتھ نہ سویا کر۔
پینو :- کیوں؟
شیدا :- وہ تو برف کی سِل ہے، تجھے بھی برف کر دے گی۔
پینو :- تو پھر کس کے ساتھ سویا کروں؟
شیدا :- جناں کے ساتھ۔
پینو :- پھر کیا ہوگا؟
شیدا :- پھر تو بھی جے ناں جیسی بن جائے گی۔ (ہاتھ پکڑ لیتا ہے) اور پھر ——
پینو :- چھوڑ میرا ہاتھ۔ چھوڑ۔ میں چیخوں گی۔
شیدا :- شور نہ مچا۔ نہ مچا۔
پینو :- پھر چھوڑ۔ (ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہے۔ صحن کے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔ شیدا دیکھتا رہ جاتا ہے)
شیدا :- (آپ ہی آپ) اب میں کیا کروں —— آہ! (دیر تک سر پکڑے اُداس بیٹھا رہتا ہے)
جیناں :- (جے ناں باہر نکلتی ہے) کون شیدا ہے؟ (جے ناں کے ہاتھ میں بھٹے ہیں، دانے الگ کرتی ہے)
شیدا :- ہاں! (گھبرایا ہوا)
جے ناں :- کہاں گیا تھا تو؟ (چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے۔ بھٹوں کی ٹوکری سامنے رکھ لیتی ہے)
شیدا :- ذرا باہر گیا تھا۔

جے ناں :- ہر وقت باہر ہی رہتا ہے تو آج کل۔ کیا بات ہے؟
شیدا :- ویسے ہی۔
جے ناں :- بات تو ضرور ہے کوئی۔ ویسے رہتا بھی چپ چاپ ہے تو۔ وہ بات ہی نہیں رہی۔
شیدا :- گھر آکر کروں بھی تو کیا؟
جے ناں :- پہلے بھی تو یہی گھر تھا۔ سارا سارا دن گھر رہتا تھا تو۔
شیدا :- اب نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔
جے ناں :- (شرارت) کیا ہوا ہے؟
شیدا :- پتہ نہیں جے ناں۔
جے ناں :- پھر بھی۔
شیدا :- جی نہیں لگتا۔
جے ناں :- کیوں؟
شیدا :- پتہ نہیں۔ گھر آؤں بھی تو ماں گھورتی ہے۔ نظریں رکھتی ہے جیسے کوئی اچکا ہو۔
جے ناں :- کیوں؟
شیدا :- کہتی ہے پینو سے بات نہ کر۔
جے ناں :- وہ تو تیری بیاہتا ہے (شرارت)
شیدا :- (تڑپ کر) تو بھی مخول کرتی ہے جے ناں۔
جے ناں :- پگلا لڑکیوں کو جوان ہوتے دیر لگتی ہے کیا؟
شیدا :- چھ مہینے تو ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے گزر گئے پر —— وہ کبھی جوان نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں ہوگی۔
جے ناں :- کیوں؟
شیدا :- جو ہر وقت ماں سے چمٹی رہے وہ کیا جوان ہو سکتی ہے اور پھر ماں تو برف کی سل ہے۔ میں نے تو پینو کو کئی بار کہا ہے کہ تیرے سائے رہا کرے۔
جے ناں :- کیوں میرے پاس کیا ہے؟
شیدا :- تیرے پاس۔ تیرے پاس ——
جے ناں :- بتا نا۔
شیدا :- مجھے نہیں معلوم۔ بس میرا جی کرتا ہے کہ وہ تیرے پاس رہا کرے۔
جے ناں :- ایک بات پوچھوں شیدے؟
شیدا :- پوچھ۔ دو پوچھ۔ دس پوچھ۔

جے ناں :- اس وقت، جب تیرا نکاح ہوا تھا، اس وقت تو کیوں چپ رہا، تیرے منہ میں گھنگھنیاں کیوں پڑی رہیں؟

شیدا :- پتہ نہیں کیوں پر ماں کے سامنے میری زبان کھنچ جاتی ہے۔

جے ناں :- تو پھر اپنے کیے کی سزا بھگت۔

شیدا :- تو تو ایسی بات نہ کہہ جے ناں۔ تو تو جانتی ہے۔ تجھے تو معلوم ہے۔ سارے گھر میں صرف تو ہی تو ہے۔

جے ناں :- (شرارت) کیوں گھر میں تو سبھی ہیں۔

شیدا :- ہوں گے، پر ——

جے ناں :- پر کیا؟

شیدا :- تجھ سے ہی تو بات کر لیتا ہوں اور جو تو بھی طعنے دے تو۔

جے ناں :- میں طعنہ تو نہیں دیتی۔

شیدا :- تو بڑی اچھی ہے۔ جو تو نہ ہو تو میں گھر آؤں ہی نہ کبھی۔ (ہچکی)

جے ناں :- تو تو کھوا مکھواہ روتا ہے۔ اب پینو کو جوان ہونے میں کیا دیر ہے۔ جی بُرا نہ کر۔

(صحن کے دروازے سے پینو داخل ہوتی ہے)

پینو :- جے ناں! اماں نہیں آئی۔

شیدا :- دیکھ لے اسے تو ہر وقت ماں کی دھن لگی رہتی ہے۔

پینو :- جے ناں! دیکھ میں نے قمیچ پر موتی ٹانکے۔ (گڑیا کی قمیص دور سے دکھاتی ہے)

جے ناں :- آجا یہاں۔ آکر دکھا مجھے۔

پینو :- اونہوں۔

جے ناں :- کیوں؟

پینو :- شیدا جو ہے وہاں۔

شیدا :- (ہنستے ہیں) دیکھ لیا جے ناں۔ نہ جانے کب عقل آئے گی اسے کب بڑی ہوگی۔

جے ناں :- جلدی جلدی بڑی ہونا پینو۔

پینو :- پھر کیا ہوگا؟

جے ناں :- پھر تو دولھن بنے گی۔

پینو :- اور اس روز جو بنی تھی جب گوٹے والے کپڑے پہنے تھے۔ کیسے اچھے اچھے کپڑے پہنے تھے میں نے ماں کال بجاکر

شیدا :- آہستہ بول چیختی کیوں ہے تو؟

جے ناں :- تو کیوں غصہ کرتا ہے اس کی بات پر کھوا مکھواہ۔

پینو :- یہ مجھے ہر وقت گھورتا ہے۔ بانہہ پکڑ لیتا ہے۔ ہونہہ۔ (منہ چڑاتی ہے —— بھاگ جاتی ہے کرتے ہیں)

شیدا :- سب اس کی شرارت ہے بے ناں۔
بے ناں :- کیا؟
شیدا :- جان بوجھ کر مجھے گُسّہ چڑھاتی ہے یہ۔ منہ بناتی ہے۔
بے ناں :- بچی جو ہوئی۔
شیدا :- منہ بچی ـــ بڑی پکی ہے۔ جو ماں کہتی ہے وہی کرتی ہے۔
بے ناں :- تو ماں پر گُسّہ کرنا، اس کا کیا دوش ہے؟
شیدا :- یہ یہ ماں کی بات میں کیسں آتی ہے؟
بے ناں :- تو کیا ماں کی بات پر نہیں چلا کرتا تھا؟ بلکہ ماں کی خاطر باپا سے لڑتا تھا۔ خود ہی تو کہتا ہے تو ماں کے ملنے میری جان کھنچ جاتی ہے ـــ گلت ہے کیا؟
شیدا :- ٹھیک ہے بے ناں پر وہ تو جب کی بات تھی۔
بے ناں :- ان دنوں تو کسی کی نہیں سنتا تھا۔ کہتا تھا جو ماں کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔
شیدا :- ان دنوں مجھے سمجھ نہیں تھی۔
بے ناں :- تو کیا پینو کو سمجھ ہے؟ ـــ بول کیا کہتا ہے؟
شیدا :- تو ٹھیک کہتی ہے بے ناں۔
بے ناں :- پینو کا تو کوئی دوش نہیں نا۔ اس نے تو تیرا کچھ نہیں بگاڑا۔
شیدا :- کچھ نہیں ـــ پر
بے ناں :- پر کیا؟
شیدا :- پر ـــ مطلب ہے۔
بے ناں :- بول بھی نا۔
شیدا :- وہ جوانی کی اتنی ہی ہے۔ چھ مہینے ہوئے جرا نہیں بڑھی۔
بے ناں :- (ہنستی ہے) پاگل۔ یہ کیا اس کے بس کی بات ہے؟
شیدا :- (خاموش)
بے ناں :- اب بول بھی نا۔
شیدا :- نہیں اس کے بس کی بات تو نہیں۔
بے ناں :- تو پھر؟
شیدا :- پتہ نہیں بے ناں پر مجھے اسے دیکھ کر گُسّہ آتا ہے۔
بے ناں :- آخر کیوں؟

شیدا:۔ شرارت کرتی ہے نا مجھ سے۔
جے ناں:۔ کیا؟
شیدا:۔ بس شرارت۔ جان بوجھ کر کرتی ہے۔
جے ناں:۔ آخر بتا بھی نا مجھے۔
شیدا:۔ کیا بتاؤں تجھے؟
جے ناں:۔ کیوں مجھ سے پردہ ہے کیا؟
شیدا:۔ نہیں تو مجھے شرم آتی ہے۔
جے ناں:۔ شرم آتی ہے۔ کس بات پر؟
شیدا:۔ دیکھو نا پینو ہونٹوں پر سُرخی لگا لیتی ہے۔
جے ناں:۔ تو پھر کیا ہوا؟
شیدا:۔ پھر میرے سامنے آجاتی ہے اور پھر ہونٹ نکال نکال کر مجھے دکھاتی ہے۔
جے ناں:۔ (ہنستی ہے۔ ضبط کرتی ہے) سبھی لڑکیاں سنگار کرتی ہیں
شیدا:۔ پھر سُرمہ لگا کر میری طرف دیکھتی ہے اور آنکھیں مٹکاتی ہے۔
جے ناں:۔ اس میں کیا ہے؟
شیدا:۔ تو تو ایسا نہیں کرتی۔
جے ناں:۔ میں ——— میں تو اب بڈھی ہو گئی۔ وہ تو جوان ہے ابھی۔
شیدا:۔ جوانی تو ہو کر ہی نہیں دیتی۔
جے ناں:۔ تو تو پاگل ہو رہا ہے۔
شیدا:۔ سبھی مجھ کو پاگل سمجھتے ہیں۔ سبھی۔ ایک صرف تو ہی۔

(پینو داخل ہو کر شیدے کی طرف دیکھتی ہے)

جے ناں:۔ نہ نہ شیدے جی بُرا نہ کر۔
شیدا:۔ میں تو نہیں کرتا۔ آپ ہی آپ ہو جاتا ہے جی کرتا ہے روؤں، چیخیں مار مار کر روؤں۔ گھر میں کوئی بھی تو میرا طرفدار نہیں سبھی مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی جُرم کر کے آیا ہوں۔ میری ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ ماں یوں دیکھتی ہے جیسے قصائی ہو۔ بابا میرا مجاک اڑاتا ہے۔ کہتا ہے جا جا کر ماں کی گود میں بیٹھ۔
جے ناں:۔ میں تو تجھے اچھا جانتی ہوں نا!
شیدا:۔ بس اک تو ہی ہے جے ناں۔

(جے ناں جھکتی ہے۔ شیدے کی ہچکی نکل جاتی ہے)

پینو :- ہنہ۔ اتنا بڑا ہو کر روتا ہے۔ (منہ چڑاتی ہے)

شیدا :- تو پھر آگئی۔ دوڑ جا یہاں سے۔

پینو :- نہیں جاتی کر لے میرا کیا کرتا ہے۔

جے ناں :- نہ نہ تو نہ بول شیدے۔

شیدا :- اور وہ جو بولتی ہے۔

جے ناں :- وہ تو بچی ہے۔

پینو :- میں ماں سے کہہ دوں گی شیدے نے میری بانہہ پکڑی تھی۔

جے ناں :- نہ ماں سے نہ کہنا۔

پینو :- تو پھر یہ مجھے گھورتا کیوں ہے؟

جے ناں :- وہ تو مذاک کرتا ہے تجھ سے۔

پینو :- ہونہہ مذاک۔ وہ تو اتنی اتنی آنکھیں نکالتا ہے مجھ پر۔ دیکھ لے جیناں دیکھ لے۔

شیدا :- جو تو نے ماں کو بتایا تو ——

پینو :- بتاؤں گی، بتاؤں گی۔ جرور بتاؤں گی۔ (منہ چڑاتی ہے)

شیدا :- میں اسے ماروں گا۔ بُری طرح سے ماروں گا۔ ہڈیاں توڑ دوں گا۔

(شیدا پینو کے پیچھے بھاگتا ہے پینو چیخیں مارتی ہے۔ جے ناں شیدا کو روکتی ہے)

جے ناں :- نہ شیدے۔ پاگل نہ بن۔

شیدا :- دیکھتا ہوں تو آج مجھ سے بچ کر کیسے نکلتی ہے۔ (پھر بھاگتا ہے)

(ماں اور بابا صحن کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ پینو ماں کی طرف بھاگتی ہے

شیدا رک جاتا ہے۔ یوں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے جیسے پتھر کا بنا ہو۔ پینو روتی ہے)

پینو :- مجھے مارتا ہے ماں۔ کہتا ہے تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔

برکتے :- شرم نہیں آتی تجھے لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تو۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے کیا گھر کی بدنامی نہ ہوگی۔ کہیں گے برکتے کے پُتر نے کیا کیا۔ منہ میں انگلیاں ڈال لیں گے۔ کہاں تو اور کہاں یہ چھوٹی سی بچی۔ شرم نہ آئی تجھے اس پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ گھر کی عزت کا کھیال نہ آیا۔ اس سے تو اچھا تھا تجھے موت آ جاتی۔

چانن :- سوچ سمجھ کر بات کر بھاگواں۔

برکتے :- اور یہ بی بی۔ اس کی طرف دیکھو یہ کھڑی تماسہ دیکھتی ہے۔ یہ تو اس گھر کو تماسہ سمجھتی ہے۔ چاہے گھر کی عزت کھاک میں مل جائے اس کو کیا۔ گھر کا درد ہو تو ہے نا۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھتی بھی ہو۔ سر پہ خصم سے لگاؤ ہے۔ باقی سب جائے بھاڑ میں جائیں اسے کیا لینا دینا۔ یہ تو تماسہ دیکھتی ہے۔

سجے ناں :- گھر کا نہیں تیرا تماشہ دیکھتی ہوں (چپ چاپ اندر چلی جاتی ہے دوسرے دروازے سے)

چانن :- سن لیا نا۔ اور رکھ اسے۔ میں کہتا ہوں اسے نہ بلوا۔ اسے بولنے پر مجبور نہ کر ورنہ ———

برکتے :- ورنہ کیا؟

چانن :- ورنہ بھسم ہو کر رہ جائے گی تو اور جس گھر کی محبت کی تو دیوانی ہے وہ دھڑام سے آ رہے گا نیچے۔

برکتے :- تو اس کی حمایت نہ کر۔

چانن :- میں اس کی حمایت نہیں کر رہا۔ تجھے عقل کی بات بتا رہا ہوں جو تیرے منہ نہیں آتے۔ سنا تو نے وہ تو بے جان ہے ———

برکتے :- بڑی بے جان دیکھو اور تو بھی بے جان ہے۔ جان تو صرف میری ہے اس گھر میں۔

چانن :- جان کہاں تیرے منہ میں تو قینچی ہے قینچی۔

برکتے :- جو قینچی ہوتی تو کب سے گھر کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔

چانن :- پرخچے تو اڑ گئے کب سے۔ اب تو دکھلاوے کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور تجھے تو صرف دکھلاوے کی ہی پرواہ ہونا چاہیے روح نہ رہے تابوت پڑا رہے۔

(شیدا انہیں باتوں میں مصروف دیکھ کر کھسکنا چاہتا ہے)

برکتے :- تو کہاں جا رہا ہے۔ اے۔

شیدا :- (خاموش)

برکتے :- میری طرف دیکھ ——— اب تو بے جان بنا کھڑا ہے تو جیسے بکری ہو اور اس وقت لڑکی پر پنجے جھاڑ رہا تھا تو۔ بول۔ کیا اس گھر میں رہنا ہے تو نے یا نہیں؟

شیدا :- میں اس گھر میں نہ رہوں گا ماں

برکتے :- کیا کہا تو نے؟

شیدا :- میں نے کہہ دیا بس۔

برکتے :- کیا کہہ دیا۔ میں بھی تو سنوں۔

شیدا :- میں یہاں نہیں رہوں گا۔

برکتے :- آخر کیوں؟

شیدا :- (خاموش)

برکتے :- آخر کوئی وجہ۔

شیدا :- میں وہاں نہ رہوں گا جہاں ———

برکتے :- جہاں کیا؟

شیدا :۔ جہاں یہ لڑکی رہتی ہے۔ (ہیر کی طرف اشارہ)
برکتے :۔ کیوں اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟
چانن :۔ بگاڑنے والی تو پتر تیرے سامنے کھڑی ہے۔
برکتے :۔ تو نہ بول بیچ میں ——— پاگل ہو گیا ہے تو شیدے۔
شیدا :۔ ہاں مجھے پاگل کھانے بھیج دو۔ (پاگل کی طرح چلاتا ہے) میں پاگل ہوں میں پاگل ہوں (دونوں باہیں اوپر اٹھاتا ہے۔ چلاتا ہے)
برکتے :۔ ہے کیا ہو گیا میرے پتر کو ——— تو کیا دیکھ رہا ہے جا کر تھام اسے۔
چانن :۔ تیری کرتوت کا نتیجہ دیکھ رہا ہوں۔ یہ تیری لوک ریت کا پھل ہے اب چکھ اس کا جائقہ۔
(شیدا انڈھال ہو کر چارپائی پر دھڑام سے گر جاتا ہے)
برکتے :۔ ہے پکڑیو پکڑیو میرے پتر کو کیا ہوا۔ (سب بھاگتے ہیں۔ جے ناں دروازے میں آ کھڑی ہوتی ہے۔ شیدے کو پنکھا کرتے ہیں۔ لٹاتے ہیں)
برکتے :۔ ہے کیا ہو گیا میرے شیدے کو۔ اب میں کیا کروں؟ (روتی ہے)
چانن :۔ جانی بھی کیا گورکھ دھندا ہوتی ہے۔ پہلے آپ ہی بگاڑتی ہے پھر روتی ہے ——— تجھے کئی بار کہا ہے جب اولاد جوان ہو جائے تو اس سے نہیں الجھا کرتے۔ چھوٹے کو تو تو نے کھڑنکے مار مار کر گھر سے بھگا دیا۔ اب اس کو گھر سے نکل جانے پر اکسا رہی ہے تو۔
برکتے :۔ تو دیکھ تو سہی ہوا کیا ہے میرے لال کو۔
چانن :۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہونا کیا ہے۔
برکتے :۔ بس تو تو ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔
چانن :۔ اور کیا کہوں۔ یہ کہوں کہ شیدے کی حالت اچھی نہیں۔ نت نت بیچارہ۔
برکتے :۔ بس تیری مجت ہا جی نہ گئی۔ اے کوئی حکیم کو بلاؤ۔ جے ناں تو کیا کھڑی منہ دیکھ رہی ہے میرا۔ جرا دولے کو آواج دے حکیم کو لائے۔
چانن :۔ کوئی جرورت نہیں، دولے کو بلانے کی۔
برکتے :۔ بس تجھے تو اپنی اولاد سے بیر ہے۔
چانن :۔ محبت تو تو ہی کرتی ہے نا ——— (طعنہ) کیوں شیدے! اب جی کیسا ہے؟
شیدا :۔ (اٹھ بیٹھتا ہے) مجھے کچھ نہیں۔ چھوڑ دو مجھے۔
چانن :۔ اب تو کہاں جا رہا ہے؟ نہ پتر لیٹا رہ۔ دیکھ تو منہ جرد ہو رہا ہے تیرا۔
شیدا :۔ میں ٹھیک ہوں ماں۔

برکتے :- غصہ نہ کر پتر میں تو تیرے بھلے کی ہی کہتی تھی۔
چانن :- یہ تو بیچاری جگت کے بھلے کی سوچتی ہے اپنی بات تو کبھی ـــــ
برکتے :- تو نہ بول کھوا مچھو ہ ـــ تو غصے تو نہیں شیدا ؟
شیدا :- نہیں ماں۔ مجھے کوئی غصہ وسہ نہیں۔
برکتے :- اسے تو کیا چھٹی ہوئی ہے مجھ سے (پینو سے) جا جا کر کھیل۔
(پینو جے ناں کے پاس چلی جاتی ہے)
برکتے :- ٹھہر میں تجھے دودھ دوں۔ پی لے گا تو دل کو طاقت ملے گی (اٹھ کر دودھ لینے جاتی ہے)
چانن :- میں نے کہا جے ناں وہ اکبرا کہاں ہے ؟
جے ناں :- کرخنے گیا ہے۔
چانن :- آج کرخنے۔ آج تو اسے چھٹی تھی ؟
جے ناں :- کام پر تو نہیں گیا وہ۔
چانن :- تو پھر ؟
شیدا :- آج برنٹ ہے نا بابا۔ بڑا صاحب آ رہا ہے۔
چانن :- اوہ۔
جے ناں :- کہتا تھا ابھی لوٹ آؤں گا برنٹ لگا کر۔
دولہ :- (داخل ہو کر صحن کے دروازے سے) میں نے کہا کیا ہوا شیدے کو ؟
چانن :- آجا دولے آجا۔
دولہ :- یہ شیدا تو بیٹھا ہے۔ سنا ہے بے ہوش ہو گیا تھا۔
چانن :- بے ہوش تو نہیں پر جوش میں جرور آ گیا تھا۔
دولہ :- جوش میں ؟ یہ شیدا تو کبھی نہیں آیا جوش میں۔
برکتے :- میں کہتی ہوں نہ جانے کیا ہوا' یوں دھڑام سے گرا جیسے گاٹے کا بوہ گرتا ہے۔
چانن :- اور جس گاٹے نے گرایا تھا دولے وہ یہ رہی تیرے سامنے۔
دولہ :- (ہنس کر) کیوں بہن! یہ کیا کہے ہے چودھری ؟
برکتے :- اس کا کیا ہے یہ تو یونہی بولتا رہتا ہے۔
چانن :- بولتا تو بھول بھی پر تیرے بولنے سے کوئی بے ہوش ہو کر نہیں گرا آج تک۔ میری جان میں آسا اثر کہاں۔ یہ کرامت تو تیری بہن کو ہی حاصل ہے۔
شیدا :- ویسے ہی چکر آ گیا تھا چاچا۔

چانن :- وہ چکر رہا ہے اس بھاگوان نے
برکتے :- اب یہ پھر جھگڑا کر رہا ہے نا۔
دولہ :- نہ بھئی چودھری تو بہن برکتے سے لڑا نہ کر۔
چانن :- نہ جی اپنی کیا مجال ہے البتہ جرا مسخری رہتی ہے تھوڑی تھوڑی۔ جرا دل بہلا لیتے ہیں اتنا تو ہونا ہی چاہئیے یہی تو کمائی ہے جو میں نے جندگی بھر کی ہے۔ (طنز)
دولہ :- بڑی اچھی ہے بہن برکتے۔
چانن :- ہاں کچھ جیادہ ہی اچھی ہے۔ ساری دنیا کا پھکر لگا ہے اس اکیل جان کو۔ ہر کسی کی بھلائی سوچتی ہے۔ اپنا کھیال نہیں۔ (طنز)
برکتے :- دیکھ کتنے میٹھے میٹھے جخم لگاتا ہے۔
شیدا :- اچھا تو بابا میں جرا ہو آؤں۔
برکتے :- کہاں جائے گا تو؟
شیدا :- غلام مد کے ہاں جاؤں گا۔
برکتے :- اس وخت نہ جا۔ بڑا اچھا پتر ہے میرا۔
شیدا :- کیوں؟
برکتے :- بس کہا جو ہے تجھ سے۔
دولہ :- ہاں ہاں بھئی اس وخت نہ جائے گا تو کیا ہے پھر چلا جائیو۔ اچھا بھئی چودھری میں جرا پسو کے لیے دانہ لے آؤں با جار سے۔
چانن :- بیٹھ دولے۔ تماخو پی، پھر لے آئیو۔
دولہ :- نہ بھئی گھر والی گھورتی ہے۔ چار روج سے کہہ رہی ہے دانہ لے آ پر نہیں لایا میں۔
چانن :- تجھے بھی گھورتی ہے۔ میں سمجھا شاید اس ملے میں تو بچا ہوا ہے۔
دولہ :- (ہنستا ہے) یہ اتنے گبھرو بیٹھے ہوئے ہیں۔ پوچھ لے تو۔ کوئی بھی تو نہیں۔
چانن :- بچا ہوا ہے تو پھر تو ڈرتا کیوں ہے؟ پھر لے آنا دانہ۔
برکتے :- اس کی گل پر نہ چلیو دولے۔ یہ تو الٹی پٹی پڑھاتا ہے۔ جا تو لے آ دانہ اور دیکھیو۔
(دور کارخانے میں سائرن بجتا ہے۔ سب خاموش ہو کر سنتے ہیں۔ جے ناں باہر نکل آتی ہے۔ پیچھے سا تہ آتی ہے)
برکتے :- اللہ خیر کرے۔
چانن :- لیکن آج تو کارخانہ بند ہے۔ کیوں شیدے؟

شیدا :۔ ہاں بابا! آج تو خالی برنٹ ہے۔
دولہ :۔ پر یہ گھوگھو تو جب بجتا ہے جب اکسڈنٹ ہو جائے۔
برکتے :۔ اللہ اپنا فضل و کرم رکھے۔
چانن :۔ جب کارخانہ ہی نہ چلتا ہو تو اکسڈنٹ کیسا؟
دولہ :۔ ہاں! یہی میں سوچتا ہوں۔
شیدا :۔ سایدآگ لگ گئی ہو۔

(گھوگھو بند ہو جاتا ہے)

برکتے :۔ ہے آگ۔ ہائے میرے اللہ۔
چانن :۔ جب بھی میں یہ گھوگھو سنتا ہوں تو جی چاہتا ہے۔ سب لڑکوں کو لے کر واپس گاؤں چلا جاؤں۔ وہاں جا کر پھر سے اپنی جمین پر کام کریں۔ وہاں گھوگھو تو نہیں بجتے، وہاں اکسڈنٹ تو نہیں ہوتے نا۔ نہ کسی کا باجو کٹتا ہے نہ ٹانگ۔
برکتے :۔ پر جمین پر اب اپنا گجارہ کیسے ہوگا یہ بھی سوچا ہے تو نے کبھی؟
چانن :۔ سچ پوچھو دولے تو جمین پہ رہ کر سوکھی کھا لینی اچھی۔ یہاں سہر میں گوست کھانے سے وہ روکھی اچھی۔
دولہ :۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔
چانن :۔ یہاں سہر میں تو رولا ہی رولا ہے دولے۔ ہر کسی کو اپنی ہی پڑی ہے۔ ہر کوئی اپنے میں کھویا ہوا ہے۔ دوسرے کی کھبر نہیں کسی کو۔ پڑوسی کو پڑوسی کی کھبر نہیں۔ کوئی بھکیر کو روٹی دینے کا روادار نہیں۔ دوسرے کا حال پوچھنے کی کسی کو پھرست نہیں۔ بکھار چڑھا ہوا ہے بکھار۔ اپنے دوزخ کی بھٹی کو آپ گرم کرنے میں لگے رہتے ہیں یہ سہر والے۔ یہ کیا چیج بنائی ہے انھوں نے جسے سہر کہتے ہیں۔
دولہ :۔ بات تو تیری ٹھیک ہے چودھری۔
برکتے :۔ تو پھر اس کی باتوں میں لپٹ گیا دولے۔ میں کہتی ہوں اس کی باتیں نہ سُنا کر اس کی باتوں میں ہمیشہ ہیر پھیر ہے۔
چانن :۔ جنانی اور سہر بھی تو ایک ہی چیج ہے دولے۔ سہر کو بھی روپے کا بکھار چڑھا ہے اور جنانی کو بھی روپے کا بکھار چڑھا رہتا ہے پھر جنانی سہر کو چھوڑ کر کیسے جائے۔ اونسا یہ بھاگوان بھی نہیں جائے گی۔ انھیں تو آرام سے بیر ہے۔ یہ گاؤں میں کیسے کس رہ سکتی ہیں۔ انھیں تو رولا چاہیے۔ یہ آپ بھی تو رولا ہیں۔ ادھر یہ کارخانہ گھوگھو بجاتا رہتا ہے ادھر یہ میری بھاگوان گھوگھو بجاتی رہتی ہے۔
برکتے :۔ لو سن لو کون سا گھوگھو بجاتی ہوں میں؟
دولہ :۔ تو بھی عجیب باتیں کرتا ہے چودھری۔
چانن :۔ آخر تو جو آیا ہے یہاں ہمارے گھر اسی بھاگوان کا گھوگھو سن کر آیا ہے نا۔ واہی ابھی اس نے شیدے کا اکسڈنٹ کیا ہے۔
برکتے :۔ ہے اللہ۔ اس کی جان کے پیچھے پڑی ہیں۔

دولہ :- (ہنستا ہے) بہن تو باتوں میں اس سے نہ نپٹ سکے گی۔
برکتے :- یہ مجھے تو بات کرنے نہیں دیتا یہ۔
چانن :- تو اپنا کام کیے جاتی ہے بھاگوان میں تو کھالی باتیں کرتا ہوں۔ کیے جا اپنا کام تو۔
دولہ :- اچھا بھئی میں تو چلتا ہوں اب۔ (چل پڑتا ہے)
برکتے :- کبھی لوگوں کو تماشہ دکھاتا رہتا ہے تو ہر وقت؟ اس میں گھر کی ہیٹی ہوتی ہے۔ کب سمجھ آئے گی تجھے؟
چانن :- سدا ایسی تو تو ہی ہے بھاگوان میں تو تیرا بچہ جمورا ہوں۔
دولہ :- (ہنستا ہوا صحن کے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے) تم دونوں کا بھی جواب نہیں۔
چانن :- وہ جوڑ پڑا ہے کہ ———
برکتے :- بس اب چپ رہ ——— چل شیدے اندر چل۔ اس کے پاس نہ بیٹھا کر۔
شیدا :- نہ میں نہیں جاتا اندر۔
برکتے :- چل بھی نا کیا ہو گیا ہے تجھے جو کہا نہیں مانتا میرا۔
چانن :- مالم ہوتا ہے تیرا جادو اُتر گیا ہے جو شیدا آج تیرے سامنے یوں بول رہا ہے۔ آج گونگے کو جبان مل گئی ہے۔
برکتے :- تو نے ہی بگاڑ رکھا ہے سارے گھر کو۔
چانن :- تو سنوارنے والی جو ہے بھاگوان۔ کیے جا اپنا کام۔
دولہ :- (باہر سے، بآوازِ بلند) چودھری! میں نے کہا چودھری۔
برکتے :- کون ہے باہر؟
دولہ :- بہن برکتے۔ اے بہن برکتے۔
شیدا :- یہ تو دولہ ہے۔
برکتے :- کیا کہتا ہے یہ؟
چانن :- پتہ نہیں بلا رہا ہے تجھے۔
دولہ :- (باہر سے) میں نے کہا تیرے ناواں کا کھرچ آیا ہے۔

(برکتے باہر نکلتی ہے، سنتی ہے)

چانن :- کیا کہے ہے یہ کھرچ آیا ہے۔
برکتے :- باہر جا کر پوچھ تو۔ میرا منہ کیا دیکھے ہے۔
دولہ :- قلم شاہی لے آ۔ گوٹھا لگانا ہے۔
شیدا :- کیسا کھرچ؟
برکتے :- دو دن ہیں بیٹھے باتیں بنا رہے ہیں۔ بچا باہر جا کر تو دیکھ۔

چانن :- کیا بات ہے دولے؟ (بآواز بلند)
برکتے :- تو اندر کیوں نہیں آجاتا دولے؟
شیدا :- جا چا اندر آجا۔
دولہ :- (دروازے میں) تمھارے ناؤں کا کھرچہ آیا ہے (ہاتھ میں منی آرڈر فارم ہے)
چانن :- کھرچہ کیسا؟
دولہ :- ملی آڈر ہے۔ چٹھی رسان لایا ہے۔
شیدا :- چٹھی رسان!
چانن :- ملی آڈر کہاں سے آئے گا ہیں (زور سے) ناواں تو دیکھ کسی اور کا ہو گا بھی۔
دولہ :- مجھے نہیں مالم تو دیکھ شیدے۔

(شیدا اٹھتا ہے۔ دیکھتا ہے)

برکتے :- اے اب بتائے گا بھی یا نہیں۔ منہ سے بھی پھوٹ کچھ۔
شیدا :- یہ تو جھناں کے ناوں ہے۔
برکتے :- جے ناں کے ناوں۔
جے ناں :- ہے میرے ناوں۔ کس کی جان ہے جو میرے ناوں کھرچہ بھیجے۔
شیدا :- ہے تو جھناں کے ناوں۔
چانن :- کوئی اور جے ناں ہو گی۔
برکتے :- اور جے ناں کون ہے یہاں محلے میں کوئی بھی تو نہیں ——— دیکھ تو کتنے روپے کا ہے۔
شیدا :- پچاس ہیں۔
دولہ :- وہ تو کہتا تھا ادھ سو ہیں۔
چانن :- وہی ادھ سو ہوئے نا۔
برکتے :- پہ آیا کہاں سے ہے دیکھ تو۔
شیدا :- (شیدا غور سے دیکھتا ہے) پتہ نہیں چلتا کچھ۔
چانن :- تو جا بلا نا چٹھی رسان کو۔ اسے پتہ ہو گا۔
دولہ :- وہ کھت بانٹ رہا ہے آتا ہے ابھی۔
برکتے :- ہے ہیں ناواں کس نے بھیجا تھا اور پھر جے ناں کے ناوں۔
جے ناں :- میرا ناوں نہ لے کوئی۔ (غصے میں)
چانن :- تو کیوں گرم ہوتی ہے جے ناں۔

شیدا :۔ یہ تو کراچی سے آیا ہے (جوش میں)
برکتے :۔ اے کراچی سے کون ناواں بھیجے گا۔
دولہ :۔ دیکھ تو بھیجنے والا کون ہے۔
برکتے :۔ ہاں ہاں یہ دیکھ۔
شیدا :۔ آ آ - آلی - آلی - آ - آ — پڑھا نہیں جاتا پورا۔
چٹھی رساں :۔ سلام علیکم!
چانن :۔ وعلیکم السلام۔ کیوں بھئی چٹھی رساناں یہ ناواں کراچی سے آیا ہے کیا؟
چٹھی رساں :۔ کراچی سے علی احمد نے بھیجا ہے سجناں کے نام۔
برکتے :۔ ہے کہیں میرا علیہ نہ ہو۔
چانن :۔ بس تو پھر وہی ہے اپنا علیہ۔
دولہ :۔ چودھری تجھے مبارک ہو۔ بہن برکتے مبارک ہو تجھے۔
چانن :۔ میں کہتا تھا نا بھاگ گیا ہے علیہ، اور یہ مانتی ہی نہ تھی۔ اب بول۔
برکتے :۔ شکر ہے میرا علیہ کہیں سے ہے۔
چٹھی رساں :۔ سیاہی تو لے آؤ نا۔ انگوٹھا لگوانا ہے۔
چانن :۔ دیکھ لے بھیجا اس نے ہے ناں کے ناؤں ہی ہے۔ جدکا بڑا پکا ہے۔
برکتے :۔ پر یہ کراچی کیسے پہنچ گیا۔ اے پڑھو تو کچھ لکھا بھی ہے رسید پر۔
چٹھی رساں :۔ پڑھتا ہوں۔

(شیدا فارم دیتا ہے)

برکتے :۔ اے پتو: اندر سے سیاہی تو لے آ منہ کیا دیکھ رہی ہے میرا۔
چٹھی رساں :۔ لکھا ہے — میں خیریت سے ہوں، یہاں نوکری پہ ہوں۔ اگلے مہینے چھٹی پہ آؤں گا۔ سب کو سلام درجہ بدرجہ۔ علی احمد
برکتے :۔ ہے تو وہ کہیں سے ہے۔ اللہ جندگی دراج کرے۔ میں تو درگاہ پر گھیو کا دیا جلاؤں گی۔
دولہ :۔ اور ہمارا منہ میٹھا کب کرائے گی تو۔
برکتے :۔ ہے میرا بیٹا مل گیا میری تو جندگی پھر سے روشن ہو گئی۔ میرا نصیبا جاگ پڑا۔ میں سارے محلے میں بتاشے بانٹوں گی۔
دولہ :۔ میں تو لڈو کھاؤں گا بہن۔
برکتے :۔ تیرا ہی ہے۔
چانن :۔ دیکھ لو پہلے تھوڑی اسے بھگایا گھر سے اب بتاشے بانٹے گی۔
برکتے :۔ تو باز نہ آ تیوریات کرنے سے۔

چھٹی رسان - میں نے کہا بہن اب انگوٹھا بھی لگاؤنا۔
برکتے :- میں لگادوں۔
چھٹی رسان :- اس پہ جے ناں کا انگوٹھا لگے گا۔
جے ناں :- میں لگاؤں گی انگوٹھا - میں لگاؤں گی۔
چانن :- دیکھ لے روپے اس نے تجھے ہی بھیجے ہیں (ہنستا ہے) رانجھا جو تھا تیرا وہ۔
برکتے :- کسی کے ناوں بھیجے جیتا رہے۔
(دیوار پر دو لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں)
فاطاں :- اے مامی کیا بیٹے کا کھت آیا ہے؟
برکتے :- ہاں ہاں ملی آڈر بھیجا ہے۔
کرم بی بی :- تجھے مبارک ہو بہن۔
برکتے :- خیر مبارک ہو بہن! اللہ کا ہجار ہجار شکر ہے اتنی دیر کے بعد لڑکے کا پتہ چلا۔
فاطاں :- کب آ رہا ہے مامی؟
برکتے :- اگلے مہینے کی دس کو۔
چھٹی رسان :- یہاں لگا دے اور یہاں - بس یوں - ٹھیک ہے اب۔
جے ناں :- میرے ناوں بھی کچھ لکھا ہے بیٹے نے۔
چانن :- سب کچھ تیرے ناوں ہی ہے اور کسی کا تو ناوں ہی نہیں۔
برکتے :- میں نے کہا اسے چھٹی رسان کو دے دے اٹھنی - جے ناں سنتی ہے تو! اٹھنی دے دے اسے۔
جے ناں :- (دوپٹے کے پلو سے پیسے کھول کر دیتی ہے)
برکتے :- میں نے کہا دودھ کا گلاس پیتا جا۔
چھٹی رسان :- نہیں بہن - مہربانی ہے تیری - سلام علیکم - (جاتا ہے)
جے ناں :- ماں! میں آج ڈھولک رکھوں گی۔
برکتے :- آج بھی نہ رکھے گی تو ڈھولک تو کب رکھے گی؟
درولہ :- میں نے کہا فاطاں جری پکڑا دے اسے ڈھولک۔
فاطاں :- ابھی لاتی ہوں میاں (جاتی ہے)
کرم بی :- اسے تو ڈھولک رکھے گی تو ہم بھی آ جائیں تھوڑی دیر کے لیے - (اتر جاتی ہے)
درولہ :- لو یہ کیا پوچھنے کی بات ہے۔
چانن :- لو بھئی یہ تو ڈھولک رکھیں گی تو اپنے کو جرا تماکو ہی رکھ دو۔

برکتے :- بس تو سارا دن گڑگڑ کرتا رہو۔

چانن :- دیکھ لے دولے۔ محلے والوں کو بتاشے دینے کے لیے تیار ہے یہ۔ چٹھی رسان کو اٹھنی دی ہے اور گاؤں پر گھیکا دیا جا رہا ہے۔ پر میں تا خو مانگوں تو کھیا کورا جواب دیتی ہے۔

برکتے :- بس تو اپنی جد نہ چھوڑیو۔

(فاطاں اور کرم بی ڈھولک اٹھائے داخل ہوتی ہیں۔ سجاں بھاگ کر ڈھولک پکڑ لیتی ہے۔ وہ سب گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں۔ برکتے ان کے قریب چوکی پر بیٹھ جاتی ہے)

برکتے :- لڑکیو وہ گیت گاؤ۔

فاطاں :- کونسا مامی؟

برکتے :- وہ ———— اے جان سے ہی اتر گیا۔ ہاں وہ ————

(لڑکیاں گانے لگتی ہیں۔ مرد ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ حقہ پیتے ہیں۔ شیدا چوری چوری فاطاں کی طرف دیکھتا ہے۔ بے تاں جی لگا کر گاتی ہے)

(باہر سے ٹرک کے ہارن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انجن رکنے کی آواز آتی ہے۔ مردوں کے کان کھڑے ہوتے ہیں)

چانن :- یہ کیسی آواج ہے؟

دولہ :- ٹرک کی آواج مالم پڑے ہے۔

چانن :- یہ ٹرک یہاں کیسے آ گیا؟

شیدا :- میں دیکھتا ہوں جا کر۔ (جاتا ہے)

چانن :- تو جا دولے دیکھ تو۔ (دولہ دیوار پہ کھڑا ہو کر دیکھتا ہے)

دولہ :- یہ تو کرنخے کا ٹرک معلوم پڑتا ہے۔

چانن :- کرنخے کا ٹرک ——— تو وہ لکھو ——— یا اللہ!

دولہ :- چودھری (چلا کر)

(عورتیں رک جاتی ہیں)

چانن :- ہاں ——— کیا ہے؟

دولہ :- یہ تو ———

برکتے :- کیا ہے دولے! کیا ہے؟

دولہ :- یہ تو ایکسیڈنٹ معلوم پڑتا ہے۔ کسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

برکتے :- ہائے اللہ!

چانن :- وہی گمگھو۔ وہی۔

دولہ :- لڑکیو —— ڈھولک بند کر دو۔

(ڈھولک بند ہو جاتی ہے)

برکتے :- نہ جانے کس کے سر مصیبت ٹوٹی ہے۔ اللہ خیر کرے۔

دولہ :- وہ اسے ٹرک سے باہر نکال رہے ہیں۔

چانن :- کون ہے کس کا ایکسیڈنٹ ہوا؟

دولہ :- مالوم نہیں پڑتا۔

برکتے :- ہے اللہ خیر کرے۔

دولہ :- وہ چارپائی لا رہے ہیں۔ اوپر کمبل پڑا ہے۔

چانن :- کمبل پڑا ہے تو بچو تو ختم ہو گیا۔

کرم بی :- اے کون ختم ہو گیا؟

برکتے :- میں کہتی ہوں باہر جا کر دیکھو تو۔

پینو :- کیا ہوا ماں کیا ہوا؟

فاطاں :- کہتے ہیں کرخنے کا ٹرک ہے۔

شیدا :- (دروازے میں سے) ماں! (چیخ)

برکتے :- کیا ہے شیدے؟

شیدا :- ماں! (چیخ کر) ماں! اکبر ——

چانن :- اکبر ——

برکتے :- کیا ہوا میرے اکبر کو۔ بولو۔ بتاؤ۔

دولہ :- اکبر کا ایکسیڈنٹ۔

(دیوار سے چارپائی صاف دکھتی ہے)

شیدا :- (روتے ہوئے) مشین میں کچلا گیا۔

برکتے :- (چیخ) میرا اکبر۔ کیا ہوا میرے اکبر کو؟

چانن :- اکبر ——

برکتے :- اے بولو بھی کیا ہوا میرے اکبر کو۔

شیدا :- اکبر ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ماں۔

(لاش آمداتی ہے سب چیختے ہیں۔ بھتاں ایک لمبی چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے
[illegible] گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

وہی منظر - چار مہینے بعد -
صحن کے ایک کونے میں ایک چھوٹی دیگ پک چکی ہے - اوپر تھال ہے جس کے گرد کپڑا لپٹا ہوا ہے - نیچے کوئلے دہک رہے ہیں - حجام دیگ کے پاس بیٹھا ہے چلم میں کوئلے بھر رہا ہے - سامنے چولھے پر ایک بڑا دیگچہ چڑھا ہے - دیگ کھچڑی کی ہے - دیگچے میں شوربا پک رہا ہے - دیگچے کے پاس برکتے بیٹھی ہے - وہ سوچ میں کھوئی ہوئی ہے -
دو رہ دیگ کے قریب کھاٹ پر دولہ اور چانن بیٹھے ہیں -

چانن :- کیوں میاں جیرے! اب کیا دیر ہے؟

جیرا حجام :- (کوئلے رکھتے ہوئے) بس پانچ منٹ کے بعد دم آجائے گا -

دولہ :- اور شوربہ ——— (برکتے کی طرف دیکھتا ہے)

(برکتے چپ چاپ بیٹھی دور نہ جانے کدھر دیکھ رہی ہے - نہ اسے شوربے کا خیال ہے نہ دولے کی بات سنتی ہے)

دولہ :- کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے بہن برکتے -

چانن :- اللہ ہی خیر کرے - (آہ بھر کر)

دولہ :- بیچاری دکھی ہے - اکبر کے مرنے کے بعد غم کھا گیا ہے -

چانن :- اونہوں - اسے کوئی نہیں کھا سکتا -

دولہ :- (ہنستا ہے) تو تو چودھری کھوامکھواہ اس کے کھلاف ہو رہا ہے - دیکھ تو اسے اپنی سدھ بدھ نہیں - دیکھ تو -

چانن :- (دیکھتا ہے) نہ جانے کس تاک میں بیٹھی ہے - جب یہ سوچ میں ہو تو کچھ نہ کچھ جھگڑا چلے گا ——— (حجام پھونکیں مارتا ہوا چلم لاتا ہے) رکھ دے جیرے (حقہ سنبھال کر بیٹھ جاتا ہے)

دولہ :- تماخو کونسا رکھا ہے بھئی؟

جیرا :- وہی تھیلی والا میاں جی!

چانن :- (کش لیتا ہے) بھئی بڑا جوردار ہے یہ تماخو -

دولہ :- اچھا ہے نا - مرچوال سے منگایا ہے -

چانن :- سے واری سے تو (دھوئے سے)

جیرا :- میاں جی میں جری وجو کر آؤں (چل پڑتا ہے)

چانن :- جلدی آئیو بھئی - پہلے ہی دیر ہو رہی اسے ہیں۔

دولہ :- ہاں اس وخت تو ہمیں اکبر کی قبر پہ پہنچ جانا چیئے تھا۔

جیرا :- بس بارہ ملٹ کے اندر اندر آیا۔ (جاتا ہے، صحن کے دروازے سے)

دولہ :- چودھری یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔

چانن :- کیا؟

دولہ :- کھتم تو گھر پہ دیتے ہیں۔ قبرستان میں جا کر مجار پر ختم دینا ــــ؟ اپنی سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔

چانن :- (ہنس کر) تماری سمجھ میں تو ایک یہ بات نہیں آئی نا۔ اپنی سمجھ میں کوئی بات بھی نہیں آئی آج تک۔ اپنے گھر میں بیوقوف بنا بیٹھا ہوں دولے۔ جو چاہے کرتی ہے، کس کی مجال ہے کہ دم مار سکے۔ یہ تو اپنے وخت کی نور جہان ہے حکومت کرتی ہے۔

دولہ :- (ہنستا ہے) بھلا اکبر کو مرے کتنے مہینے ہوئے ہیں۔

چانن :- (انگلیوں پر گن کر) چار مہینے ہو گئے۔

دولہ :- چار مہینے کے بعد کھتم تو نہیں دیتے۔ سال کے بعد دیتے ہیں۔

چانن :- پوچھو اسی سے۔ مجھے کیا مالم۔ میں تو دولے بروا لا ہوں اس گھر کا۔ جو کام اس نے کما کر دیا۔ اب صبح شام اس بھاگوان سے کون لڑے۔

دولہ :- (ہنستا ہے)

چانن :- یہ اتنے نصم بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھ لو چاہے۔ ہر کوئی ایک نا ایک دن جلدی یا دیر سے گھر والی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور جو سیانے ہیں دولے وہ تو پہلے دن ہی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

دولہ :- (ہنستا ہے) پر تم تو اب تک لڑتے ہو۔ تم نے تو ہتھیار نہیں ڈالے۔

چانن :- بیوقوف ہوں نا، اس لیے۔

(دولہ ہنستا ہے، چانن حقہ پیتا ہے ــ وقفہ ــ برکتے ہنسی کی آواز سن کر چونکتی ہے فوراً دیگچہ اتارتی ہے۔ اٹھا کر اسے دیگ کے پاس لا رکھتی ہے، پھر دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر ان کے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہنس رہے ہیں۔ انھیں اس کی آمد کی خبر نہیں ہوتی)

برکتے :- میں کہتی ہوں یہ کیا ٹھٹھے کرنے کا موقع ہے۔ آج کے روز تو جبان سنبھال اپنی۔ آج تو میرے اکبر کا کھتم ہے (بھرائی آواز۔ آنسو پونچھتی ہے)

(دولہ چونک کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ چانن یوں مگن رہتا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو)

برکتے :- میں کہتی ہوں اب انتجار کس کا ہے۔ سورج چڑھ آئے تو کھتم دینا اچھا نہیں ہوتا۔ لاؤ اب بسم اللہ کرو۔

دولہ :- میں ابھی بلاتا ہوں بہن ۔ (چل پڑتا ہے)
برکتے :- اور وہ نائی کہاں گیا؟
چانن :- ابھی آتا ہے ۔ گرمی نہ کھا ۔ ابھی تو تیرا سائیں بیر نہیں آیا ۔
برکتے :- وہ تو وہیں پہنچ جائے گا ۔ اس کا فکر نہ کر تو ۔
چانن :- اور وہ علیہ کہاں ہے ۔
برکتے :- بیٹھا ہوگا اندر جے ناں کے پاس ۔ تین مہینے ہو گئے اسے آئے کو (چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے) ہر وقت جے ناں کے پاس بیٹھا رہتا ہے جیسے اُلّو بنا کر پاس بٹھا لیا ہو ۔
چانن :- تو اس کا بُرا نہ مان بھاگوان ۔ اسے جے ناں سے پیار ہے ۔
برکتے :- ہے پیار کی بھی حد ہوتی ہے کوئی ۔ لوگ کیا کہیں گے؟
چانن :- ہر وقت لوگ، لوگ، لوگ ۔ رسی جل گئی پر بل نہیں گیا ۔
برکتے :- اسے ہے آخر وہی کرنا چاہیے نا جو آتا آیا ہے ۔ مجھ سے تو دو اینٹ کی الگ مسجد بنائی نہیں جاتی ۔
چانن :- اب تو علیہ سے نہ کہیو یہ بات کہیں پھر بھاگ گیا تو ——
برکتے :- ہے بالکل ہی سر پھرا اپتر ہے ۔ تجھ پر گیا ہے نا ۔
چانن :- چل پھر روتی کیوں ہے ۔ دو تو نے اپنے آپ پر جنے تو چلو ایک مجھ پر سہی ۔ جی بُرا کیوں کرتی ہے تو ۔

(وقفہ ۔ چانن حقہ پیتا ہے)

چانن :- چار مہینے گجر بھی گئے ۔ (اپنے آپ)
برکتے :- (آہ) ہاں پورے چار مہینے ہو گئے آج ۔
چانن :- یقین نہیں آتا ۔
برکتے :- ہاں! دروازہ بجے تو یوں کھیاں آتا ہے جیسے بیرا اکبر آیا ہے کرخنے سے ۔ جی مانتا ہی نہیں کہ وہ ——
(آنکھیں پونچھتی ہے)
چانن :- (خاموشی، گہری سوچ) چار مہینے ۔ وقت کٹ بھی جاتا ہے اور نہیں بھی کٹتا ۔
برکتے :- تیرا کٹ جاتا ہوگا میرا تو اب نہیں کٹتا ۔
چانن :- کیسے کٹے تیرا وقت ۔ تو گھر میں رہتے ہوئے بھی گھر میں نہیں رہتی ۔
برکتے :- اور کہاں رہتی ہوں؟
چانن :- پتہ نہیں کہاں رہتی ہے ۔ دل کی بات کسی سے کرے بھی تو ۔ دیکھ لے اب نہ تو تو نے کبھی شیدے کا حال پوچھا ہے وہ بیچارہ تو یوں تڑپے ہے جیسے چین نہ ہو کسی طرح بھی، اور وہ جے ناں ۔ اس سے تو تو نے کبھی بات تک نہیں کی ۔ وہ اپنے غم میں ڈوبی رہتی ہے ۔ بھاگوان اسے کبھی سہارا ہی دیا ہوتا ۔

برکتے :۔ اسی کا غم تو کھائے جا رہا ہے مجھے۔ آ کر وہ گھر کی چھت ہے۔ تجھے کیا پتہ۔
چانن :۔ تیرا پتر چلا کسے ہے آج تک۔
برکتے :۔ ہر وقت اسی سوچ میں پڑی ہوں۔
چانن :۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ تو سوچ میں پڑتی ہے تو دل لرزتا ہے میرا۔

(وقفہ)

برکتے :۔ میں نے کہا ختم کے بعد تو نے جانا تو نہیں کہیں؟
چانن :۔ کیوں خیر تو ہے؟ میری کیا ضرورت پڑ گئی تجھے؟
برکتے :۔ گھر ہی رہے گا نا تو؟
چانن :۔ ہاں! میں نے کہاں جانا ہے ——— معلوم ہوتا ہے آج کچھ کرے گی تو۔
برکتے :۔ دیکھ تو اُلٹے پانی نہ چلا کر۔ سر چٹا ہو گیا پر عقل نہ آئی تجھے۔
چانن :۔ بھاگوان تو بھی نہ سکھا سکی۔
برکتے :۔ تو تو کوکڑو ہے۔ چاہے جتنی آگ جلاؤ گلتا نہیں۔
چانن :۔ تو نے جو بھٹی جلا رکھی ہے بھاگوان اس میں لوگ بھسم ہو جاتے ہیں۔ گلنے کی بات چھوڑ۔
برکتے :۔ پھر تجھ پر کیوں نہ ہوا اثر؟
چانن :۔ تو میری بات چھوڑ۔

(وقفہ)

برکتے :۔ ہے وہ دولہ نہیں آیا ابھی۔
چانن :۔ آ جاتا ہے۔ گھبراتی کیوں ہے تو۔ ابھی تو چاول کو دم لگا ہے۔
برکتے :۔ اسے دیر ہو رہی ہے۔
چانن :۔ دیر ہو گئی تو کیا ہو گا؟
برکتے :۔ کہتے ہیں ختم میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔
چانن :۔ کیوں؟ روح چھٹی کر جاتے ہیں کیا؟
برکتے :۔ تو اپنا ٹھٹھا نہ چھوڑیو۔ جو منہ میں آیا اُگل دیا۔ توبہ ہے۔

(چانن اُٹھ کر دیگ کی طرف جاتا ہے۔ اوپر جو کوئلے پڑے ہیں انھیں پھونکیں مارتا ہے جب تک برکتے سینی میں پیالے اور حلوا رکھتی ہے)

چانن :۔ دیکھ ایک بات کہوں۔
برکتے :۔ کیا ہے؟

چانن :- ٹھنڈے دل سے سُنیو۔ اُبال میں نہ آئیو۔
برکتے :- تو بات کر۔
چانن :- جو تو نے شیدے کا نکاح پینو سے کیا ہے اچھا نہیں کیا تو نے۔
برکتے :- اور کس سے کرتی؟
چانن :- اس کا جوڑ تو علیہ سے ٹھیک رہتا۔
برکتے :- علیہ اس وخت ہوتا تو تھا۔ اس وخت تو یہ بھی مالم نہ تھا کہ وہ جند بھی ہے یا نہیں۔
چانن :- تو انتجار کر لیتی۔
برکتے :- اور بہن پڑی تڑپتی رہتی۔ اسے موت نصیب نہ ہوتی۔
چانن :- چلو مان لیا اس وخت مزبوری تھی پر اب تو نہیں۔
برکتے :- اب کیا ہو سکے ہے؟
چانن :- شیدا سے طلاخ لے کر علیہ سے کر دو۔
برکتے :- سرم نہیں آتی تجھے؟
چانن :- کیوں؟
برکتے :- اب لڑکی کو طلاخ دلوائے گا تو۔ بھئی واہ۔ لوگ کہیں گے برکتے کے گھر میں بھی طلاخ ہو گئی۔ کچھ اپنی عجت کا بھی کھیال ہے تجھے؟
چانن :- پر بھاگوان!
برکتے :- نہ نہ۔ اس گھر میں چاہے کچھ ہو پر طلاخ نہ ہو گی کبھی۔ ہاں یاد رکھ اور یہ پر دُہائی کھدا کی بڑا بھائی طلاخ دے اور چھوٹا کر لے۔ کبھی سُنی ہے ایسی بات۔ تیرے مغز میں جانے کیا بھرا ہے جو تجھے ایسی ایسی اُلٹی باتیں سوجھتی ہیں۔
چانن :- تو اُبال کیوں کھاتی ہے؟
برکتے :- تو بات ہی ایسی کرتا ہے بے سری کی۔ مغز الٹا ہے تیرا۔
چانن :- تو بات کو سوچا بھی کر بھاگوان۔
برکتے :- نہ میں نہیں سوچتی اللہ بچائے ایسی سوچ سے۔ تو تو کافروں سی باتیں کرتا ہے۔ سوچ نے تجھے فرنگی بنا دیا ہے بے سرم ہو گیا ہے۔ اللہ کے حکم سے بھی منکر ہو گیا تو۔ نہ سنت نہ شریعت۔
چانن :- تو تو بھاگوان بھڑ کی طریوں چِڑ گئی۔
برکتے :- تو بچھو کی طریوں ڈنک مارنے سے باج نہ آئیو۔

(دروازے میں معزز صورت قسم کے آدمی کھڑے نظر آتے ہیں)

ایک :- چودھری! چیرے نائی نے بھیجا ہے ہمیں۔

دوسرا :- دیگ اٹھا کر لے جاتی ہے نا۔
برکتے :- وہ آپ نہیں آیا۔
ایک :- کتنا تھا ویں جا رہا ہوں۔
جانن :- اندر آ کر بیٹھ جاؤ۔ آئینے دو جیرے کو۔
برکتے :- رسہ اور بلم لے آئے ہو؟
دوسرا :- ہاں ہاں جی اسلے آئے ہیں۔

(اندر آ کر دیگ کو رسے سے باندھتے ہیں)

برکتے :- ہے وہ جیرے کو کیا ہوا؟

(دور سے سائیں کی آواز آتی ہے۔ گھنٹیاں بجتی ہیں)

سائیں :- مولا ای مولا۔ سب رولا ای رولا۔
جانن :- لے آ گیا تیرا پیر و مرشد۔
برکتے :- تجھے کیوں کھلتا ہے۔
جانن :- دونوں ہی مداری ہو۔ اک تو اک وہ۔
سائیں :- (دروازے میں رک جاتا ہے) مولا ای مولا۔

(پینو کمرے سے باہر نکل آتی ہے)

برکتے :- (اٹھ بیٹھتی ہے) بسم اللہ بسم اللہ۔ بیٹھو سائیں جی!

(سائیں چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ جانن بے پرواہی سے بیٹھا رہتا ہے)

سائیں :- شاباشے برکتے شاباشے۔ جانی ہے تو تو ہے۔ اک بار جو منہ سے کہہ دیا کر کے دکھا دیا۔ مولا علی مولا علی (نعرہ)

(دولہ اور جیرا داخل ہوتے ہیں)

دولہ :- آہا۔ سائیں جی بھی آ گئے۔

(ڈیوڑھی کی دیوار سے دو سر ابھرتے ہیں۔ فاطاں اور ساس کی ماں)

برکتے :- پر تم نے اتنی دیر کیوں لگائی؟
جیرا :- میں نے سوچا ہن دو ایک بالے چلیں ساتھ۔ اچھے ہوتے ہیں۔ (دیگ کا دم ٹوٹتے ہوئے) لے بھئی چاول تو ٹھیک ہو گئے۔
برکتے :- پر تو نے دھوکا کیا ہے کہ ویسے ہی اٹھا رکھا ہے دیگ میں۔
جیرا :- دھو کے ہی آیا تھا۔ کتنے کے چاول ویسے تو نہیں پکاتا ہیں ہم۔ لے بھئی لے چلو۔
سائیں :- (ہنس کر) کتنا کھیال ہے اسے پاک بندوں کی پاک باتیں۔ مولا علی ——

(دونوں آدمی دیگ کو اٹھاتے ہیں۔ جیرا بڑا سا گچھا اٹھاتا ہے۔ برکتے چنگیرا اٹھا لیتی ہے۔ دولہ سامان اٹھاتا ہے۔ چانن چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے)

چانن :۔ دولے اے محفہ بھی لے لے نا اور نانو کی تھیلی بھی۔

برکتے :۔ تو کیا تو نہیں جا رہا ہمارے ساتھ؟

چانن :۔ میں ابھی آتا ہوں۔ تم چلو۔

سائیں :۔ (اٹھ کر نعرہ مارتا ہے) یا پنج تن پاک۔ مولا ہی مولا۔

(پہلے سائیں باہر نکلتا ہے پھر دولہ پھر دیگ والے آخر میں جیرا)

(پڑوس سے جو دو عورتیں جھانک رہی تھیں وہ چلی جاتی ہیں۔ پینو دروازے سے انھیں جاتے ہوئے دیکھتی ہے)

برکتے :۔ کسی وخت تو ساتھ دیا کر تو۔

چانن :۔ کہہ جو دیا نیک بخت کہ ابھی آتا ہوں۔

برکتے :۔ اچھا شیدے اور علیے کو ساتھ لے آئیو۔

چانن :۔ وہ دونوں تو چلے بھی گئے قبرستان کو۔

برکتے :۔ سچ!

چانن :۔ اور کیا۔

پینو :۔ نہیں ماں علیہ تو اندر ہے۔

برکتے :۔ دیکھا نا لڑکے پہ جادو کر رکھا ہے ڈائن نے۔

چانن :۔ او ہو۔ تو اب جا۔ علیے کو کچھ نہ کہیو۔ سنا تو نے؟ میں جے ناں سے بات کر کے ابھی آیا۔

برکتے :۔ ایسی کیا بات ہے؟

چانن :۔ ہے۔ جا تو۔

برکتے :۔ (جاتے ہوئے) جلدی آئیو۔

چانن :۔ ہاں! ہاں ـــــ (وقفہ ـــــ بیٹھا سوچ میں کھویا ہوا ہے)

چانن :۔ (پینو کو اشارہ کرتا ہے) جا اندر جا کر جے ناں کو بلا۔ (پینو بھاگ جاتی ہے) اونہوں ـــــ اب یہاں گھر نہ ہوگا۔ (اپنے آپ سے دقتوں کے ساتھ) اس مہرے تو جن مرید بنا دیا ـــــ اپنی جانی کا بھڑوا بنا بیٹھا ہوں ـــــ اونہوں!

(جے ناں تباہ حالت لیکن بھرپور آنکھیں جھکائے آتی ہے۔ روتی روتی ہے)

(آکر رک جاتی ہے بولتی نہیں۔ چانن اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہتا ہے علیہ کمرے سے باہر نکل کر دور ہی رک جاتا ہے)

چانن :- دیکھ جے ناں! ہم کھتم پر جا رہے ہیں اب تو باہر بیٹھ آکر۔
جے ناں :- (سر ہلا دیتی ہے۔ ہاں)
چانن :- تو نہیں جائے گی کھتم پر؟
جے ناں :- (نفی میں سر ہلاتی ہے)
چانن :- اچھا تیری کھشی۔
جے ناں :- (چپ)
چانن :- دیکھ جے ناں! اب تو ایک دھیان میں ہی نڈھوبی رہ۔ کیوں اپنی جان کو روگ لگا رہی ہے تو۔
(جے ناں کے آنسو گرتے ہیں۔ پلّو سے پونچھتی ہے۔ ہچکی)
علیہ :- (قریب آکر) ہر وخت روتی رہتی ہے بابا۔
چانن :- تو اس کا دل بہلایا کرنا۔
علیہ :- میرا کہا نہیں سُنتی۔
چانن :- جا جا کر اس کا چرخہ لے آ باہر۔ بیٹھ جا تو۔
(جے ناں بیٹھ جاتی ہے)
چانن :- پینو! تو جائے گی کھتم پہ؟
پینو :- مجھے لے چلو بابا۔ میں جاؤں گی۔ میں ضرور جاؤں گی۔
چانن :- تو چل (اٹھ بیٹھتا ہے) شور نہ مچا۔
(علیہ چرخہ اور پونیوں کی ٹوکری لے آتا ہے)
چانن :- دیکھ علیہ تو نہ کہیں جائیو۔ جے ناں کو اکیلی نہ چھوڑیو۔
علیہ :- نہیں بابا۔
چانن :- اچھا تو میں چلتا ہوں۔ آ پینو! ابھی پندرہ منٹ میں تو آجائیں گے۔ مر پھر کھتم ہی پڑھنا ہے نا۔ چل لڑکی۔
(دونوں باہر چلے جاتے ہیں)
(کچھ دیر علیہ جے ناں کی طرف دیکھتا رہتا ہے پھر چرخہ اٹھا کر لاتا ہے، چرخہ مناسب جگہ رکھتا ہے۔ چھلیاں اور پونیاں سنبھال کر رکھتا ہے، پھر جے ناں کی طرف دیکھتا ہے)
علیہ :- بھابی! میں نے تیرے چرخے کو تیل دیا تھا آج۔
جے ناں :- اچھا! (بے دلی سے چارپائی پر بیٹھی رہتی ہے)
(وقفہ)
علیہ :- اور میں نے تیری ساری پونیاں بنا دیں۔ اندر پڑی ہیں۔ دکھاؤں؟

جے ناں :- اونہوں۔

(وقفہ)

علیہ :- یہ پھلیاں ٹوکری سے نکال لوں؟

جے ناں :- اونہوں۔

(وقفہ)

علیہ :- یہ چرکی اچھی نہیں تو دوسری لا دوں؟

جے ناں :- نہیں ملیے نہیں۔

علیہ :- تو پھر تو بیٹھتی کیوں نہیں؟

جے ناں :- بیٹھتی ہوں۔

علیہ :- نہیں جی کرتا تو نہ سہی، کیوں بھابی!

جیناں :- کرتا ہے۔ (اٹھ بیٹھتی ہے۔ چرخے پر بیٹھ جاتی ہے)

علیہ :- تو بولتی نہیں بھابی؟

جیناں :- کیا بولوں بتا؟

علیہ :- تو تو مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی جب۔

جیناں :- جب کی بات جب سے گئی۔

علیہ :- اب کیا ہے؟

جیناں :- (آہ بھر کر) ہاں اب کیا ہے۔

علیہ :- تو دکھ کیوں لگا بیٹھی ہے بھابی؟

جیناں :- اور کیا کروں ملیے؟ اب تو کچھ بھی نہیں۔

علیہ :- میں جو ہوں بھابی۔

جیناں :- ہاں!

علیہ :- میں جتنا کماؤں گا سب تجھے دوں گا۔ سب۔

جیناں :- اچھا!

علیہ :- ماں کو نہیں دوں گا۔

جیناں :- نہ ایسی بات نہ کر۔

علیہ :- کیوں نہ کروں؟

جیناں :- اچھی نہیں۔

علیہ :- پر بچی تو یہ ہے، میرے لیے تو یہ گھر تیری وجہ سے ہے۔ تو نہ ہو تو میں بھاگ جاؤں۔
جیناں :- نہ نہ یوں نہ کہا کر تیری ماں ہے، باپو ہے، بھائی ہیں۔
علیہ :- نہ بھابھی۔ بس تو ہی ہے صرف تو۔
جیناں :- نہ علیے ایسی بات نہیں کیا کرتے، میرے لال!
علیہ :- کیوں؟
جیناں :- ماں سنے گی تو کیا کہے گی؟
علیہ :- کیا کہے گی؟
جیناں :- بُرا مانے گی۔
علیہ :- پڑی مانے۔
جیناں :- نہ علیہ (منت سے) میری بات نہیں مانتا؟
علیہ :- مانتا ہوں۔
جیناں :- تو ماں کو بُرا نہ کہا کر۔
علیہ :- مجھے نہیں اچھی لگتی۔ ذرا اچھی نہیں لگتی۔
جیناں :- اتنا پیار کرتی ہے تجھے۔
علیہ :- تیرے پاس کیوں نہیں بیٹھتی وہ؟
جیناں :- (خاموشی سے اس کا منہ تکتی ہے)
علیہ :- تجھ سے بات بھی نہیں کرتی وہ۔
جیناں :- کھوا مکھواہ تو ایسی باتیں منہ سے نکالتا ہے جو ——
علیہ :- جو کیا؟
جیناں :- (غصے میں) بس کچھ نہیں۔
علیہ :- تو بات کیوں نہیں کرتی بھابھی؟
جیناں :- (آبدیدہ) علیہ تو ہر وقت میرے پاس نہ بیٹھا کر۔
علیہ :- کیوں؟ تو تنگ ہوتی ہے؟
جیناں :- نہیں نہیں علیہ۔
علیہ :- تو پھر؟
جیناں :- بس تجھ سے کہا جو ہے نہ بیٹھا کر۔
علیہ :- بُرا لگتا ہوں تجھے؟

جیناں :۔ (منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) نہ علیے ایسی بات نہ کر۔ تو تو بہت ہی اچھا ہے۔ بہت ہی اچھا۔
علیہ :۔ نہیں۔
جیناں :۔ سچ۔
علیہ :۔ تو مخول کرتی ہے بھابی۔ میں تو کچھ بھی نہیں اور تو اتنی اچھی ہے۔ تو بڑی اچھی ہے بھابی میں جندگی بھر تیرے ساتھ رہوں گا۔
جیناں :۔ ہے علیہ میں تجھے کیا کہوں؟ (ایک طرف اپنے آپ سے)
علیہ :۔ کیا کہتی ہے تو بھابی؟
جیناں :۔ کچھ نہیں کہتی۔ (آبدیدہ)
علیہ :۔ کچھ تو کہتی ہے تو۔
جیناں :۔ نہیں تو۔
علیہ :۔ مجھے پتہ ہے۔
جیناں :۔ کیا پتہ ہے تجھے؟
علیہ :۔ تو اس گھر میں دکھی ہے۔
جیناں :۔ نہیں علیے۔ میرا دانا پانی اٹھ گیا یہاں سے۔
علیہ :۔ چلو بھابی دونوں اکٹھے چلے جائیں۔
جیناں :۔ ہے میرے اللہ (گھبرا کر)
علیہ :۔ اب میں نوکری کر سکتا ہوں۔
جیناں :۔ پر علیہ۔ تیری ماں کیا کہے گی؟
علیہ :۔ مجھے نہیں اس کی پروا۔
جیناں :۔ تو ماں کی بات کیوں نہیں مانتا؟
علیہ :۔ اگر تو میری ماں ہوتی تو میں تیری ہر بات مانتا۔ گھر سے کبھی نہ بھاگتا۔
جیناں :۔ بھابی بھی تو ماں سمان ہوتی ہے۔
علیہ :۔ سچ! تو پھر تو مجھے اپنے پاس سے کیوں اٹھاتی ہے۔ بتا۔
جیناں :۔ تیری ماں بُرا مانتی ہے نا اس لیے۔
علیہ :۔ وہ تو جب بھی یہی کہتی تھی۔
جیناں :۔ کب؟
علیہ :۔ تو چھوڑ اس کی بات بھابی۔

(وقفہ)

جیناں :- ایک بات پوچھوں علیہ بتائے گا؟

علیہ :- پوچھ۔

جیناں :- تو گھر سے بھاگا کیوں تھا؟

علیہ :- نہ بہ نہ پوچھو بھابھی۔

جیناں :- کیوں؟

علیہ :- جو بتا دوں تو تو بُرا مانے گی۔

جیناں :- نہیں نہیں مانتی۔ بتا۔

علیہ :- تجھے دُکھ ہوگا بھابھی۔

جیناں :- (جھوٹی ہنسی) دُکھ کھوا لکھواہ کا۔ بتا بھی نا۔

علیہ :- ماں نے کہا تھا جیناں کے پاس نہ بیٹھا کر۔

جیناں :- میرے پاس؟

علیہ :- ہاں!

جیناں :- کیوں؟

علیہ :- کہتی تھی اب تو جوان ہو گیا ہے۔

جیناں :- (ہنستی ہے) اور تو نے کیا کہا؟

علیہ :- میں نے کہا بیٹھوں گا کر لے جو تیرا کرنا ہے۔ پھر مجھے غصہ آ گیا اور میں بھاگ گیا۔

(دور سے سائیں کا نعرہ سنائی دیتا ہے)

سائیں :- مولا ای مولا۔ سب مولا ای مولا۔ (دور سے)

جیناں :- لے وہ آ گئے۔ (اٹھ بیٹھتی ہے) تو میرا چرخہ اندر لے آ۔

علیہ :- تو یہاں کیوں نہیں بیٹھتی؟

جیناں :- نہیں نہیں بیٹھتی یہاں۔ (چل پڑتی ہے)

(علیہ چرخہ اٹھاتا ہے۔ سب لوگ داخل ہوتے ہیں۔ پہلے برکتے پھر دیگ اٹھانے والے پھر سائیں اور آخر میں دولہ اور چانن اور رشیدا)

دولہ :- یہاں رکھو بھئی دیگ۔ (خود دیگ بھی رکھتا ہے)

برکتے :- بیٹھ جاؤ سائیں جی۔

چانن :- دوسے ذرا تھا تو تو رکھوا دے چلم بھی۔

سائیں :- نہ بابا سب ہم جانتے ہیں۔ تیری خوشی پوری کر دی۔ مولا علی! (نعرہ)

(سائیں چل پڑتا ہے۔ باہر نکل جاتا ہے۔ دیگ رکھ کر دونوں آدمی چلے جاتے ہیں۔ دولہ چلم بھر کر لاتا ہے)

دولہ :۔ اچھا بہن تو میں چلتا ہوں۔ چاول تو شام کو ہی بانٹتے ہیں۔
(علیہ چرخہ چھوڑ کر باقی چیزیں اٹھانے آتا ہے)

برکتے :۔ ہاں! وہ تو شام کو ہی ہوگا۔
دولہ :۔ میں پھر آجاؤں گا۔ (چل پڑتا ہے)
برکتے :۔ ذرا ٹھہر تو سہی۔
دولہ :۔ (رک کر) کوئی کام ہے کیا؟
برکتے :۔ ہاں بیٹھ جا۔
چانن :۔ آ واری لے۔

(دولہ بیٹھ جاتا ہے)

برکتے :۔ شیدے! تو بھی چوکی لے لے اور بیٹھ جا۔
شیدا :۔ کیوں؟
برکتے :۔ (سختی سے) کہا جو ہے تجھ سے۔ بیٹھ جا یہاں۔
چانن :۔ اللہ خیر کرے۔ (اپنے آپ سے)
برکتے :۔ علیہ! او علیہ! (علیہ باہر آتا ہے)
" ذرا ادھر آ۔ (قریب آتا ہے۔ بازو پکڑ کر بٹھا لیتی ہے اسے)
" بیٹھ جا یہاں دو گھڑی کے لیے۔ پینو تو جا اندر جیناں کے پاس بیٹھ۔

(پینو برے دل سے چلی جاتی ہے)

دولہ :۔ چودھری بات کیا ہے؟
چانن :۔ مجھے کیا پتہ پوچھ اس مداری سے۔ پنڈال لگا لیا ہے اب تماشہ دکھائے گی۔
برکتے :۔ دیکھ ہر وقت ٹھٹھہ نہیں کرتے۔ ہر مذاق کا وقت نہیں۔ دیکھ دولے میں کہتی ہوں کوئی ایسا بھی وقت ہوتا ہے جب گھر میں بیٹھ کر انسان کچھ سوچتا ہے۔ مشورہ کرتا ہے۔

(خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ وقفہ)

دیکھ دولے تو سیانا ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ گھر کی عزت کیا چیز ہے۔ تجھے بڑوں کی ریت کا پتہ ہے۔ یہ شیدا اور علیہ تو دونوں بچے ہیں انھیں ابھی ان باتوں کا کیا پتہ۔ رہا ان کا باپو تو وہ سدا اُلٹے دھارے بہتا ہے۔

چانن :۔ تو اپنی بات کر بھاگوان میرا جگر چھوڑ۔

دولہ :- اب تو نہ بول چودھری۔ جھگڑا نہ ہو جائے۔
چانن :- میری تو بولتی بند کر رکھی ہے پہلے سے ہی اس نے۔
دولہ :- ہاں بہن تو اس کی بات کا دھیان نہ کر۔
چانن :- پہلے تو بہت کرتی ہے میرا دھیان جواب نہ کرے گی۔
شیدا :- کوئی کھاس بات ہے بابا؟
چانن :- (ہنس کر) مجھے کیا پتہ۔ تو دیکھتا جا اس مداری کو۔
برکتے :- دیکھ لے دولے ہر بات میں میری ہیٹی کرتا ہے، اور پھر میرے بیٹے جا بیٹھے ہیں لوگوں کے سامنے۔
شیدا :- ماں تو تو بات کرے گی ان سے (اٹھ بیٹھتا ہے) ہم نے کیا کرنا ہے یہاں؟
برکتے :- (رعب سے) بیٹھ جا بیٹھ جا تو۔
چانن :- بھاگوان کہتا تو یہ ٹھیک ہے۔ بات تو تو نے ہم سے کرنی ہے ان بیچاروں کو کیوں بٹھا لیا ہے تو نے؟
برکتے :- نہیں ان کا ہونا جروری ہے۔
چانن :- آکھر کیوں؟
برکتے :- بس کہہ جو دیا (رعب سے) بیٹھ جا شیدے۔
دولہ :- ہاں بھئی بیٹھ جا وہ جو کہتی ہے (شیدا بیٹھ جاتا ہے) ہاں تو اپنی بات کر بہن۔
برکتے :- یہ کرنے بھی دے بات۔
دولہ :- پھر وہی بات۔ تو چھوڑ اس کو، بات کر۔
برکتے :- بات تو تیرے سامنے ہے دولے۔ کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ ساری دنیا کی نجریں لگی ہوئی ہیں ہمارے گھر پر جب سے میرا اکبر اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ (آنسو پونچھتی ہے)
دولہ :- تو جیناں کی بات کر رہی ہے بہن۔
برکتے :- ہاں وہ اس گھر کی بہو ہے۔ عجت ہے۔
دولہ :- بے سک بے سک۔
برکتے :- اللہ رکھے وہ جوان ہے۔ وہ اس گھر میں رانڈ بن کر نہیں رہ سکتی۔ گھر میں جوان لڑکے ہیں، لوگوں کی جبان کون بند کر سکتا ہے۔ تو تو آپ سیانا ہے دولے۔
دولہ :- بے سک۔ بے سک۔
برکتے :- تو کیوں نہیں بولتا۔ چپ کیوں ہو گیا، کیا گلط کہہ رہی ہوں؟
چانن :- تو سن لو بھئی۔ بولوں تو کہتی ہے تو نہ بول، اور نہ بولوں تو کہتی ہے تو کیوں نہیں بول رہا۔
برکتے :- (ہنس کر) بات تو ٹھیک کر رہا ہے چودھری۔

ائن :- ہیش سچ کہا اور مار کھائی اپنی تو جندگی یونہی بیت گئی۔

برکتے :- (چھاتی بجاکر) پر میں کہے دیتی ہوں۔ ہاں! جیناں اس گھر کی بہو ہی رہے گی۔ رانڈ بہو نہیں، سہاگن بہو۔

دولہ :- شاباشے بہن!

برکتے :- یہ نہ کہے کوئی کہ برکتے کے گھر میں ایسی بات ہوئی جس میں گھر کی ہیٹی تھی۔ نہ نہ میں تو مر جاؤں گی گھر پہ حرف نہ آنے دوں گی۔

چانن :- تو پھر کیا کرے گی تو؟

دولہ :- ہاں ہاں بات سمجھ میں نہیں آتی۔

برکتے :- جیناں کی عدت ختم ہو چکی ہے۔ آج اس کا نکاح ہو جائے گا۔

چانن :- نکاح؟

دولہ :- پر کس سے؟

برکتے :- میرے علیے سے۔

دولہ :- علیے سے؟

علیہ :- ماں! میں ——(کھڑا ہو جاتا ہے)

چانن :- تو اپنی بات سے باز نہ آئی نا؟

دولہ :- لیکن علیے سے؟

چانن :- میں نے لاکھ سمجھایا کہ تحمل کر۔

برکتے :- تو تو خود بے عقلی کی بات کرتا ہے۔ سن لے دولے یہ کہتا ہے کہ شیدا اپنی بہو کو طلاق دے دے اور ——

دولہ :- پر بہن ——

برکتے :- نہیں نہیں اس گھر میں طلاق نہیں ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ جب تک میرے دم میں دم ہے نہیں ہوگی۔ (چھاتی بجاکر)

علیہ :- پر ماں ——

برکتے :- تو چپ کر۔ دیکھ نا دولے اب میرے پاس ہے ہی کون؟ بس لے دے کر یہی ایک جگر کی بوٹی ہے میرا علیہ۔ اللہ رکھے بارہ سال کا گھبرو ہے۔ کوئی بچہ نہیں۔

علیہ :- (غصے میں) نہیں ماں ——

(دروازے میں جے ناں آکھڑی ہوتی ہے)

برکتے :- نہیں نہیں کیا کرتا ہے تو۔ کیا تو چاہتا ہے کہ جے ناں ساری عمر رانڈ رہے؟ ساری عمر دکھی رہے۔ بول!

علیہ :- پر ماں میں ——

دولہ :- چپ کر تو بڑوں کی باتوں میں بولنا اچھا لگتا ہے کیا۔

چانن :- پر اس نیک بخت سے کوئی پوچھے کہ تیرا کیسا نیائے ہے کہ سات سال کی چھوکری کو تو نے بیس سال کے گھبرو کی دم سے باندھ دیا اور اب بارہ سال کے بال کو پچیس سال کی مٹیار کی گود میں ڈال رہی ہے۔

دولہ :- بات تو یہ سچ کہہ رہا اے بہن!

برکتے :- اس میں میرا کیا دوش بھائی دولے۔ ان کے نصیب ہی ایسے تھے۔ اگر اس وخت علیہ گھر میں ہوتا تو تھا۔ اب میں اس کے سوا کر ہی کیا سکتی ہوں؟

چانن :- اب نصیبے کو کوس رہی ہے۔ اس گھر کی تقدیر تو یہ کھد ہے۔ گڈیاں سمجھ رکھی ہیں اس نے کھیل رہی ہے۔

برکتے :- ہے تو نے کبھی میرے دل میں نہ جھانکا۔

چانن :- اس کال کوٹھڑی میں کون جھانک سکے ہے؟

برکتے :- (آہ بھر کر) ساری جندگی بتا دی میں نے اس گھر کے بھلے کے لیے۔ کیا کیا نہ کیا میں نے دولے اس گھر کے لیے جان ماری، چوچوں کو پروں تلے لیے بیٹھی رہی، انھیں پالا، اس کی کھدمت کی، اس پر جان چھڑکی، گھر کی عجت کو سینے سے لگا کر بیٹھی رہی اور دولے یہ کہے ہے کہ کھیل رہی ہوں میں ان سے۔ جیتے جی اس اللہ کے بندے نے میری قدر نہ کی۔ (آنسو پونچھتی ہے) مر جاؤں گی تو سمجھ میں آئے گا اس کے۔

دولہ :- سچ کہہ رہی ہے تو بہن۔

برکتے :- بھلا اس سے کوئی پوچھے میرے اپنے پیٹ جائے مجھے پیارے نہیں کیا۔ کیا میں ان کا برا چاہتی ہوں بھلا۔ کیا ان کی تکلیف سے مجھے تکلیف نہیں ہوتی؟ یہ سمجھے ہے مجھے جیناں سے بیر ہے۔ پر دولے تو ہی بتا، جو بیر ہوتا تو کیا میں اپنے علیے کو اس کے قدموں میں ڈال دیتی۔ کیا مجھے اپنے علیے سے پیار نہیں۔ کیا میں شیدے کے دکھ کو نہیں جانوں ہوں؟

شیدا :- تو میری بات چھوڑ ماں!

(جیناں دروازہ بند کر لیتی ہے پر درز میں سے دیکھتی رہتی ہے)

برکتے :- مجھے پتہ ہے یہ پہنو کا انجار کرتے کرتے تھک گیا ہے پر میں پہنو کو کیسے اپناتی؟ اپنی بہن کا دل کیسے ٹھنڈا کرتی — ہاں اس وخت علیہ ہوتا پر —— (ہچکی)

چانن :- پر اب کر لے ٹھیک۔ ابھی تو ہاتھ سے کچھ نہیں گیا۔ جیناں پر بیری گرے ہیں نا آٹا تو نہیں گرا جو اٹھایا نہ جا سکے۔

برکتے :- سن لے دولے کیا کہہ رہا ہے یہ؟

دولہ :- سن رہا ہوں۔

چانن :- اس میں برا کیا ہے؟ عقل کی بات ہے۔ شریعت کے کھلاف تو نہیں۔

برکتے :- پر تو یہ بتا کبھی ایسا ہوا بھی ہے کہ ایک بھائی نے طلاق دی اور دوسرے نے کر لی۔ نہ یہ نہ ہوگا کبھی اس گھر میں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کہیں گے برکتے کے گھر میں طلاق ہوئی۔

دولہ :- یہ بھی شریعت کی نوازش ہے۔

برکتے :- شریعت کی اور بات ہے دولے گھر کی عزت کی اور بات ہے۔

چانن :- اس کے سامنے کون بول سکتا ہے دولے۔ کسی کی نہیں چلی، کسی کی نہیں چلے گی۔ جو کہے گی وہی ہوگا۔ پہلے بڑے کے گلے میں گھنٹی باندھ دی اب چھوٹے کی گود میں ڈھول رکھ دیا اور وہ بیچاری جیناں اس کی تو وہ حالت ہے کہ نہ ہنس سکے نہ رو سکے۔

علیہ :- (اٹھ بیٹھتا ہے) ماں! ماں!

چانن :- بھاگوان تو وہ مذاق کر رہی ہے وہ ٹھٹھا کر رہی ہے کہ ـــــ

علیہ :- ماں!

چانن :- کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہنسیں کہ روئیں۔

علیہ :- ماں میری بات سُن۔

برکتے :- بول تو کیا کہتا ہے۔

علیہ :- میں بیاہ نہیں کروں گا بھابھی سے۔

برکتے :- (رعب) کیوں نہیں کرے گا تو؟

علیہ :- نہیں کروں گا۔

برکتے :- آخر کیوں نہیں؟

علیہ :- کہہ جو دیا ماں۔

برکتے :- آ میرے لال اِدھر۔

علیہ :- نہیں میں نہیں آتا۔

برکتے :- میری بات تو سُن! (پکڑ کر پیار کرتی ہے) بتا مجھے کیوں نہ کرے گا تو؟

(علیہ جذبات سے پھوٹ پڑتا ہے۔ روتی آواز)

علیہ :- مجھے بھابھی سے پیار ہے ماں!

دولہ :- (سب ہنستے ہیں) پگلا لڑکا۔

علیہ :- سچ ماں! میں جھوٹ نہیں کہتا۔

برکتے :- (پیار کرتے ہوئے) اسی سے بیاہ کرتے ہیں پتر جس سے پیار ہو۔

علیہ :- نہیں ماں میں نہیں کروں گا۔

دولہ :- کتنا سیدھا ہے یہ علیہ ہمارا۔
برکتے :- اس میں کوئی بریائی ہے جو تو انکار کر رہا ہے۔ واہ!
علیہ :- اس میں بریائی نہیں ماں! (تڑپ کر)
برکتے :- تو پھر؟
علیہ :- میں اس کے بیخ نہیں ہوں ماں!
برکتے :- کیوں کیا کمی ہے تجھ میں؟
علیہ :- کمی نہیں ماں!
برکتے :- تو پھر؟
علیہ :- وہ بڑی اچھی ہے ماں! بڑی اچھی اور رہی' میں تو کچھ بھی نہیں۔

(ہچکی کی آواز سنائی دیتی ہے سب کمرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ دروازے میں جیناں کھڑی رو رہی ہے۔ پاس ٹرنک پڑا ہے)

(بینو باہر نکل کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے)

چانن :- کون جیناں ہے؟
برکتے :- تو یہاں کھڑی ہے دروازے میں۔
جیناں :- ہاں! میں ہوں (ہچکی)
برکتے :- تو جا ادھر۔ یہاں کیوں کھڑی ہے تو؟
جیناں :- ہیں! میں جا رہی ہوں۔
چانن :- جا رہی ہے؟
برکتے :- کہاں جا رہی ہے تو؟
جیناں :- میرا ٹرنک اٹھوا دے بابا۔
دولہ :- پر تو کہاں جا رہی ہے؟
جیناں :- مالوم نہیں۔
چانن :- مالوم نہیں؟
شیدا :- جیناں!
جیناں :- یہاں سے جا رہی ہوں۔ یہاں میرا دانہ پانی کھتم ہو گیا۔
برکتے :- تو نہیں جا سکتی اس گھر سے۔ تو اس گھر کی عجت ہے تو باہر پاؤں رکھے گی تو میں جہر کھا لوں گی۔
چانن :- اسے دھمکی کیوں دے رہی ہے تو؟
برکتے :- تیرا تو نکاح ہے آج تو کہاں جائے گی؟

جیناں :- بس ہو چکا اک بار۔
برکتے :- پر تو جا نہیں سکتی۔
جیناں :- مجھے کون روک سکتا ہے؟
برکتے :- لوگ کیا کہیں گے جیناں؟
جیناں :- مجھے نہیں پروا کسی کی۔
برکتے :- ہمیں تو ہے۔ تو اس گھر کی بہو نہیں کیا؟ اس گھر کی عزت نہیں؟ بول!
دولہ :- تحمل کر لڑکی۔
چانن :- جیناں کیا تو غصے ہے؟
جیناں :- نہیں۔ (ڈیوڑھی میں دیوار پہ دو عورتوں کے سر ابھرتے ہیں۔ خاطاں اور اس کی ماں دیکھتی ہیں)
چانن :- تو پھر؟
جیناں :- میں کسی سے بیاہ نہیں کروں گی۔ (چل پڑتی ہے)
علیہ :- بھابھی نہ جا۔ نہ جا بھابھی! میں تجھ سے بیاہ نہیں کروں گا۔ میں تیرے لئے نہیں پھر تو کیوں جا رہی ہے؟
جیناں :- (بڑھ کر علیہ کو پکڑ لیتی ہے) ایسی باتیں نہ کیا کر علیہ (زیرِ لب)
علیہ :- تو پھر تو کیوں جا رہی ہے؟
جیناں :- مجھے جانا ہی ہو گا علیہ۔
علیہ :- تو مجھے ساتھ لے چل۔ لے چلے گی؟ لے چل۔ بھابھی!
جیناں :- (رو پڑتی ہے)
پینو :- میں بھی جیناں کے ساتھ جاؤں گی۔ کیوں بابا میں جاؤں؟ بابا بول!
چانن :- میں تو کُھدائی جیبن پہ جا رہا ہوں اپنے موجووال۔ (اٹھ بیٹھتا ہے)
دولہ :- تحمل کر چوہدری ــــ تو بھی۔
برکتے :- جیناں کیوں میری عزت دھول میں ملاتی ہے۔
جیناں :- بس میں تیرے گھر میں نہیں رہوں گی۔ نہیں رہوں گی۔
برکتے :- میرے گھر میں نہ رہے گی؟ میں نے تجھے کون سا دکھ دیا ہے بہو جو میرے گھر میں نہ رہے گی؟ میرا ایک ہی ہیرا تھا سو
اسے میں نے تیرے قدموں میں ڈال دیا۔ تجھے میرا علیہ منظور نہیں کیا؟
جیناں :- (چپ)
علیہ :- نہ ماں نہ کہہ۔ نہ کہہ ماں! (رو کر) اسے تکلیف ہوتی ہے۔
دولہ :- بول بھی لڑکی!
برکتے :- تو بے شک نہ کہہ دے پر کچھ کہہ تو۔ کیا تجھے میرا علیہ ــــ

جیناں :- (چیخ کر) نہ کہہ نہ کہہ۔ یہ بات نہ کہہ مجھ سے۔

چانن :- تو پھر تو جا کیوں رہی ہے؟ (بیٹھ جاتا ہے)

جیناں :- میں اس کے گھر میں نہ رہوں گی۔

برکتے :- اچھا تو تو میرے گھر نہ رہے گی یہ ـــــ سن لے تو اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ سنا تو نے؟ میرے گھر میں ہی نہیں نہ رہنا تو نے ـــــ تو لے سنبھال اپنے خصم کو اور اپنے گھر کو ـــــ اور دیکھ علیہ تو نے جو جیناں کو تکلیف پہنچائی کچھ، جو گھر کی محبت کھر اب کی تو میری روح بددعا دے گی تجھے۔

چانن :- کیا کہہ رہی ہے تو بھاگوان؟

برکتے :- چل اٹھ تو کیا سنہ دیکھ رہا ہے میرا۔ چل کب سے کہہ رہا تھا تو اپنی جھین پر جاؤں گا۔ چل ہم دونوں گاؤں چلتے ہیں اپنی جھین پر۔ میرے گھر میں ہی نہیں رہنا چاہتی یہ۔ اپنے گھر میں تو رہے گی نا۔ چل ہم دونوں گاؤں چلیں۔ لے بہو سنبھال اپنا گھر۔

دولہ :- شاباشے بہن، شاباشے بھئی۔

چانن :- بھاگوان! یہ تو کہہ رہی ہے۔ تو! مجھے یقین نہیں پڑتا۔ دولے ذرا چٹکی بھر مجھے کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

برکتے :- اندھا ہے تو کیا؟ دیکھتا نہیں گھر کی محبت کا سوال ہے۔ بڑوں کی ریت ہو کے رہے گی۔

دولہ :- واہ بہن! واہ بہن!

چانن :- رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ ریت ہاتھ سے نہ جائے آپ ٹوٹ جائے، کھاک ہو جائے۔ چل پھر میں تو کب سے تیار ہوں۔

رشیدا :- پہلاں نکاح تو کروا کر جاتو۔ ماں!

برکتے :- (مڑ کر) کیوں جیناں ـــــ کیا کہتی ہے تو؟

جیناں :- (چیخ مار کر۔ فرطِ محبت سے دونوں بازو بڑھا کر) ماں!

علیہ :- (رو کر) پر ماں میں تو بھابھی کے بیچ نہیں۔ ماں!

(اس دوران میں پڑوس سے عورتیں ڈھولک لے کر آجاتی ہیں)

جیناں :- (جیناں علیہ کی طرف فرطِ محبت سے بڑھتی ہے) ہے علیہ! (پھر دفعتاً شرما کر پیچھے ہٹ جاتی ہے)

(ڈھولک بج رہی ہے۔ جیناں شرما کر گٹھڑی بن جاتی ہے۔ بیٹھ جاتی ہے)

چانن :- واہ بھاگوان! آج تو کلش کر دیا۔

(پردہ)

خونی

ابوالفضل صدیقی

خاں صاحب محمود خاں کی فوری طلبی قسم کی دعوت پر جب ہم جنگل میں ان کے کیمپ پر پہنچے تو ان کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ حادثہ کی ڈرامائی ستم ظریفی کے باوجود ہم میں سے کسی کی ہمت ہنسنے کی نہ پڑی اگرچہ ہر ایک کے پیٹ میں ہنسی کی ہالوریں اٹھ رہی تھیں لیکن ہر شخص خشک چہرہ بنا کر خانصاحب کو پرسا ہی دے رہا تھا۔ میں نزاکت کو اغوا ہوئے آج آٹھواں روز تھا اور میں نے غور کیا کہ بوڑھے خاں صاحب پر آج تک اتنا شدید اثر تھا جیسے کسی نوجوان کی ناکتخدا محبوبہ کو کوئی رقیب اغوا کر کے لے جائے۔ اندھیری رات میں اغوا ہونے کا واقعہ، پھر صبح کو پتہ کرنے کی داستان انھوں نے ہم سب کے سامنے بڑے پُر درد انداز کے ساتھ فریاد کی آوازیں سنائی۔ انہیں ذاتی طور پر نزاکت کے جانے کا اس قدر شدید ملال تھا کہ حادثہ کے اس پہلو کا قطعاً احساس نہ تھا کہ ان سے جواب طلبی بھی ہوگی۔ حقہ کے کشوں کے ساتھ وہ اپنی بھاری آوازیں لیے چلے جا رہے تھے۔ ہر دو لفظوں کے آگے اور پیچھے چار چار گالیاں لگا کر اپنی فصیح گفتگو میں بلاغت پیدا کر رہے تھے ..... خود کو گالیاں، حرامی بچے چوکیداروں کو گالیاں، سؤر کے بچے فیل بانوں کو گالیاں، گیدڑ کے بچے کتوں کو گالیاں، حرام زادہ جنگل اور حرام زادی اندھیری رات کو گالیاں اور نزاکت اور اکڑا کو تو نہ معلوم کتنی گالیاں، بس گالیاں ہی گالیاں اور کچھ نہیں، یوں بھی بعض فربہ قسم کی عجیب الطرفین گالیاں تو ان کی زبان کو شیر مادر تھیں لہٰذا ان کی بات چیت کے لغت میں ان کے معنی گالی کے نہ تھے اور اکڑا اور نزاکت کی بات تو سچ مچ گالی کی بات تھی اور خانصاحب کا جی جلا ہوا تھا لہٰذا اعصاب آلود پٹھانی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے لال لال ہونٹوں کے اندر سے مشینی انداز میں کٹ کٹ کر اور چھل چھل کر بڑی سڈول اور جسیم گالیاں ٹپک رہی تھیں اور یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ یہ ہونٹوں میں سے پھسل رہی ہیں یا حقہ کے غلیظ دھوئیں کے ہالے آواز کا روپ دھار لیتے ہیں، اور کسی وقت حقہ کی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ایسی مدغم ہو جاتی کہ جیسے یہ بھی گالیاں ہیں۔

ہم لوگ بخشنے والے نہ تھے مگر کیا کرتے اول تو خانصاحب کا رنج اور پھر اس سے زیادہ جواب طلبی والا پہلو ہم کو ذرا نازک سا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ خیر خانصاحب کو جو نزاکت کے ساتھ شغف تھا وہ تو تھا ہی لیکن بذاتِ خود سرکار کو اس کے ساتھ مخصوص دلچسپیاں وابستہ تھیں۔ کم از کم ہم سب لوگ یہ جانتے تھے کہ سرکار نزاکت کے اغوا ہونے کی خبر سن کر بہت برہم ہوں گے اور یہ معلوم نہ تھا کہ کدھر رجوع ہو جائے لیکن خانصاحب کے دل پر نزاکت کی جدائی کا تیر اتنا شدید پڑا تھا کہ انھیں اس کا قطعاً احساس نہ تھا۔ میں نے اتنا البتہ کہا کہ میاں خانصاحب اس وقت اگر تم نے ہمارا کہا مان لیا ہوتا اور بس ایک کیمپ کا انتظام کر دیا ہوتا تو

یہ وہاں کیوں دیکھتے، خیر ہم لوگ مار نہ سکتے تو سالے کو بھگا تو ضرور ہی دیتے اور وہ سالا مرتا یا نہ مرتا آج تمہاری مس نزاکت کو بھگانے کے لیے تو یہاں نہ ہوتا۔ اس پر خانصاحب نے اپنی گل مچھوں دار داڑھی سے ڈھکے ہوئے سُرخ رخساروں پر کئی چپت اپنے ہاتھوں سے مارے اور روہانسی آواز میں گالیاں در گالیاں گالیوں میں لچھے سے پڑنے لگے اور گالیوں کے جتنے قدیم و جدید مصدر ہیں ان سب کی گردان ایک سانس میں اپنے اوپر کر ڈالی اور اس طریقہ سے ہمارے سامنے اظہارِ ندامت و عفو کیا اور انداز ایسا ہو گیا کہ جیسے عنقریب اپنی کلائیاں جھنجھوڑ اٹھیں گے اور خیر ہم لوگ ہی کیا خوش باش اور بذلہ سنج خانصاحب کے وسیع دائرۂ احباب میں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو ان سے سنجیدگی سے بات کرنا گناہ نہ خیال کرتا ہو اور جس سے وہ سیدھے سادے بات کرتے ہوں اور نزاکت کے بھگا کر لے جانے کی خبر پر ہم لوگ ان کی دعوت پر مذاق کرنے آئے تھے مگر ان کی حالت دیکھ کر ہم کو بھی سنجیدگی کا روپ بھرنا پڑا۔

وہ ریاست رامپور کے فوجی افسر تھے اور مہتمم سواری اور انچارج فیل خانہ، اصطبل، گئوخانہ وغیرہ تھے اور ہز ہائی نس کی ہوائی کی موٹر گاڑیاں اور شکاری اسلحہ خانہ بھی انہی کی سپردگی میں تھا جس میں بے شمار پرانے ہتھیاروں کے علاوہ جدید ترین ولایتی ساخت کے اعلیٰ شکاری رائفل اور بہترین بندوقیں تھیں جن میں سے اکثر بڑے انگریزی کارخانوں میں خاص آرڈر دے کر تیار کرائے گئے تھے مگر اس سازو سامان کے باوجود اور ایک بڑے اچھے نشانہ باز ہونے ہوئے بھی حضرت کو خود شکار سے شوق نہ تھا اگرچہ سرکار اور سرکار کے معزز مہمانوں کے لیے شکار کیمپ کا انتظام کرانا بھی آپ کے فرائضِ منصبی میں تھا جس کو بڑی خوش اسلوبی اور حُسنِ انتظام کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

اکڑا کی تباہ کاریوں کی اطلاعات جب ضلع نینی تال کے محکمہ جنگلات کے عمّال نے ریاست کے عمال کو دے کر متنبہ کیا اور ریاست کے محکمہ جنگلات سے خبروں کے تبادلہ کی درخواست کی اور شہر میں طرح طرح کی افواہیں اڑیں تو ہم نے خانصاحب سے کہا کہ ایک کیمپ کا انتظام کر دیں، کچھ بڑے رائفل اور اچھے کارتوس نکال دیں لیکن انھوں نے صاف اڑا دیا اور بہرصورت سے شکار کو جانے سے باز رکھا، یہاں تک کہ آج یہ دن دیکھا کہ اکڑا ان کی محبوب ترین فیل خانہ کی شہزادی قسم کی لاڈلی ہتھنی پر ہاتھ صاف کر گیا، جس کی پشت پر پالتو ہاتھی کی ایک تاریخ تھی اور جو اپنی جگہ مستثنیات میں تھی۔

ہی پارٹی میں بڑے بڑے شکاری تھے۔ ریاست کے انجینئر RITE صاحب، سنگھ بالو اور ہز ہائی نس کے میر شکار جمامیاں بھی تھے جنھوں نے بیسیوں شیر مارے تھے اور کئی آدم خور شکار کیے تھے۔ خود سرکار یا سرکار کے معزز مہمانوں کے شکار کی کامیابی انہی کے دم قدم سے تھی۔ مشہور بات تھی کہ ان کا ہاتھ موت کا طمانچہ بن کر پڑتا تھا اور بہت کم خالی جایا کرتا تھا۔ جمال خاں نام تھا اور جمامیاں عرف، سرکار نے آدم خور شیروں کے شکار کی بہادریوں سے خوش ہو کر جمال شیر خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور پھر اسی نام سے ریاست کے اندر کاغذات سرکاری میں لکھے جانے لگے۔ یوں تو مکمل شکاری تھے اور ہر قسم کے شکار کا بڑا شوق تھا لیکن ہاتھی کے شکار سے کوئی مس نہ تھا ویسے وہ ہم سب کے استاد تھے اور ہمارے ساتھ موجود تھے لیکن باوجود ہر چند ترغیب دلانے کے ان کے اندر ہاتھی کے شکار کی گدگدی پیدا نہ ہو سکی۔ خیر ان کا ساتھ ہونا ہی ہمارے لیے بڑی تقویت تھی کیونکہ ہاتھی کے شکار کا اور بالخصوص خونی ہاتھی کے شکار کا تجربہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ ویسے RITE صاحب دعویٰ کرتے تھے کہ وہ برما اور آسام میں ہاتھی کا شکار کھیل چکے ہیں لیکن وہ بھی خونی ہاتھی کے شکار کا تجربہ ہونے کا دعویٰ نہ کرتے تھے۔

اکڑا کی بانڈی گاہ کا جغرافیہ میرے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے دماغ میں تھا اور جو کچھ چیزیں دھندلی تھیں وہ جامیاں نے واضح کر دی تھیں۔ وہ ضلع نینی تال کی تحصیل ہلاس پور اور ریاست رام پور کی ایک تحصیل شاہ آباد کے رقبہ کے اندر دریائے کوسی کے دونوں کناروں پر مار دھاڑ کر رہا تھا اور تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مربع میل میں ہراس پھیلائے ہوئے تھا۔ تباہ کاری کی تفصیل میں جانے سے قبل ہم نے اس کی جبلت اور شکل و صورت کے متعلق معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دانت والا ہاتھی ہے اور مقامی بولی میں اکڑا اکیلے کو کہتے ہیں، اس کے علاوہ جبلت کے لحاظ سے بھی عام ہاتھیوں سے منفرد ہے، پھر ہمیشہ تنہا نظر پڑتا ہے چنانچہ وہ داخلی و خارجی ہر اعتبار سے اکڑا تھا اور دیہاتیوں نے یہ نام اس کو بڑا مکمل دیا تھا اگرچہ عام لوگ صرف ایک دانت ہونے کی مناسبت سے اس کو اکڑا کہتے تھے اور جب وہ خونی نہ ہوا تھا اس وقت سے اس کی بعض مخصوص عادتوں اور اکیلے دانت کے سبب خوب پہچانتے تھے۔ یہ اکیلا دانت جنگل بھر میں اس کو ممیز کرتا تھا۔ اس کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ چونکہ بہت نٹ کھٹ اور لڑاکا ہے لہٰذا کسی لڑائی میں دوسرا دانت جھڑ گیا ہے یعنی اچھے خاصے پُرامن دور میں جب آدمیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع نہ کیا تھا ہاتھیوں سے روزانہ بغیر ایک دو ڈبول لڑے اس کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ پھر یہ دانت! یہ دانت دیکھنے کو تو ایک کڈھنگا بے ڈول دانت تھا مگر دراصل چار دانتوں کا ایک دانت تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا، شروع میں ہمارا بھی یہی خیال رہا کہ دوسرا دانت کسی لڑائی میں جھڑ گیا ہے مگر پہلے دیکھ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مادر زاد عیب ہے اور پھر انکشاف ہوا کہ دوسرے دانت کی جگہ ایک گڑھی سی ہے جیسے نکلنے کی کوشش میں دوسرا دانت سٹر اکر جہاں کا تہاں رہ گیا ہے۔ اکڑا کا یہ ایک دانت موٹے سے موٹے دانت سے سوایا ڈیوڑھا موٹا اور ایسا ہی غیر معمولی لمبا تھا اور بڑا مضبوط اور نوکدار تھا۔ عام ہاتھیوں کے دانتوں سے بالکل مختلف خم کے ساتھ جما ہوا تھا پھر اکڑا اچھے تن و توش والے ہاتھیوں میں تھا جسم کا گٹھاؤ بڑا اچھا تھا اگرچہ بھدا تھا لیکن بلا کا مضبوط۔ ٹانگوں میں عجیب قسم کا خم تھا جیسے گھٹنوں کے جوڑ ٹیڑھے میڑھے تھے اور ان ٹانگوں کے عجیب سے خم اور اس دانت کی نوک کے زاویہ نے شاید اس کے حملہ کو بڑا شدید اور بے پناہ بنا دیا تھا یا یوں کہئے کہ اپنے مقابل پر اس کا حملہ کچھ ایسے نادر قسم کے داؤ پیچ کے ساتھ پڑتا کہ وہ اس کا بچاؤ نہ کر پاتا، دوسرے الفاظ میں قدرت نے عام ہاتھیوں کے حملہ کا بچاؤ تو سب ہاتھیوں کو سکھایا تھا مگر اس کے حملہ سے بچنے کا طریقہ اور اس کے مقابلہ پر اپنی مدافعت کوئی ہاتھی نہ جانتا تھا کیونکہ اس کی جسمانی ساخت عام ہاتھیوں سے مختلف تھی پھر ستم بالائے ستم یہ کہ مزاج میں شورش اور جبلت میں شرارت تھی گویا ہاتھ، پاؤں اور دانت کے خموں کے ساتھ فطرت بھی کج تھی اور خصلت میں مادر زاد حرامی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کھردرا، کینہ پرور، غصہ ور، شورش زا اور تخریب پسند واقع ہوا تھا نتیجہ میں بڑے بڑے پہاڑ سے چودھری اور ذی وقار سردار اس کی کج فطرت اور بے ڈھب دانت کے مقابلہ پر ایک پکڑ بھی اچھی طرح نہ لے پاتے اور پہلے ہی حملہ میں دم دبا کر میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے اور یہ بلا وجہ اور بغیر لحاظ عمر و مرتبہ کے ہر ایک پر حملہ کر بیٹھتا اور مار بھگاتا لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنا کھرا اور بھدے دماغ کا واقع ہوا تھا کہ غول کی سیادت سنبھالنے کی صلاحیت ہی تھی اور نہ کبھی اس پہلو کی جانب توجہ ہی جاتی۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک کسی سے بنا کر چلنا نہ جانتا لہٰذا غول کے اندر نر تو درکنار ماداؤں پر بھی کوئی رعب و وقار نہ تھا، اور ہوتا کیسے بڑوں کو چھوڑیئے وہ تو خیر پٹنے کٹنے کے لیے تھے ہی یہاں چھوٹوں کا بھی لحاظ نہ تھا۔ ماداؤں سے منہ بات کرنے کا

سلیقہ نہ لبھانے کا ڈھنگ مغلوب الغضب ایسا کہ خبر ہاتھیوں غریبوں کے غضب بے پناہ دانت کے بھالے سے پرخچے اڑتے ہی تھے ہتھنیوں کو بھی نہ بخشتا۔ جنگل بھر میں کوئی جوان بوڑھی ہتھنی ایسی نہ تھی جو شوں شوں کرکے ڈرائی دھمکائی نہ جاتی ہو اور ریفتہ عشوہ پیچھے وجاتکے آپ کی سونڈ کے نہ کھا لیتی ہو۔ اس فطرت وجبلت کے ساتھ جسم میں مناسب طاقت تھی، پھر بے پناہ ہتھیار سے مسلح اور حملہ کے نادر طریقہ سے آشنا تھا لہٰذا خود کو بہادر خیال کر لینا لازمی امر تھا۔

جب مستی کا زمانہ آتا تو جنگل کی ہوا آپ کو بھی لگتی۔ غول میں نئی جوان بٹھورنیں بھی ہوتیں، دو ایک اچھوتی کنواریاں بھی ہوتیں، اچھی کاٹھی پنڈے کی درست کسی بن ادھیڑیں بھی ہوتیں لیکن لبھانا پٹانا تو درکنار آپ سیدھی سادی بات کرنے کے سلیقہ سے بھی نابلد تھے اور نئی بٹھورنیں تو اس وقت بڑے نخرے دکھاتی ہیں اور ادھیڑیں بھی ناز برداریاں کراتی ہیں، اچھوتی کنواریاں بھولی بھالی ضرور ہوتی ہیں لیکن بیچاریاں مستی کی پہلی گت اپنے اندر بجتے سن کر اس قدر گھبرائی ہوئی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے عاشق سے اور ساتھ والیوں سے غمزہ اور عشوہ طرازیاں سیکھنا چاہتی ہیں اور یہاں رجوع ہونے کا طریقہ ہی اتنا بھونڈا تھا کہ جوان اور کنواریاں تو درکنار کوئی ادھیڑ بھی منہ نہ لگاتی اور اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے جوڑے بنا لیتے اور آپ نوجوان تھے یہاں بوڑھے بوڑھے تک جوانوں اور کنواریوں کو پٹا کر فرار کر لے جاتے اور آپ اپنے بلوں میں اینٹھتے ہی رہتے۔ یہاں تک کہ کوئی بڑی بوڑھی جو کہیں آپ کی دادی نانی لگتی ہوگی اور جس میں اپنے وقت پر تھوڑا سا دھواں سلگ اٹھا اور آگ واگ مستی وستی کیا اور وں کی دیکھا دیکھی کسی کونے کھدرے میں کوئی چنگاری چمک اٹھتی اور جس کو کوئی جوان ہاتھی تو درکنار سوکھا پلپلا بوڑھا بھی نہ سونگھتا وہ آپ کو تاڑ لیتی اور احمق بنا کر لے بھاگتی اور آپ کی بھرا بھر نوجوانی کی دہکتی آگ کے ساتھ اپنے بجھے بجھائے خالی خولی بڑھاپے کی کوئلے اور راکھ کو خوب دہکاتی اور بھرپور دادِ عیش دیتی اور ان گدھے کو پتہ بھی نہ چلتا کہ سچ مچ صنفِ نازک کیا ہوتی ہے اور اتنے بڑے فاتح ہونے کے باوجود کبھی ڈھنگ کا جوڑا ملنا تو درکنار اچھی طرح ایک بوسہ بھی نہ ملا اور کنواری تو بڑی چیز ہے وہ تو بھلا ہاتھ آتی ہی کیسے کبھی کسی ڈھنگ کی ادھیڑ نے بھی منہ نہ لگایا، اور جب ہاتھ آئی اچھوتی کنواری تو ایسی نحس ثابت ہوئی کہ اسی کے بھینٹ چڑھ گئے۔

ہمارے خاں صاحب محمود خاں ضلع نینی تال کے موضع بجے پور میں کیمپ کیے ہوئے تھے۔ یہ گاؤں کمایوں ڈویژن کی سب سے اہم شکارگاہ میں واقع ہے۔ ہز ہائی نس نواب یوسف علی خاں ناظم خوش گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے شوقین شکاری بھی تھے اور مناظرِ فطرت اور صحرائی زندگی کے شیدائی تھے۔ انھوں نے یہاں جملہ اقسام کے جنگلی جانوروں کی کثرت دیکھ کر یہ رقبہ اپنی شکارگاہ کے لیے منتخب کیا اور برٹش گورنمنٹ سے خرید کر یہ گاؤں آباد کر دیا۔ ریاست کی حدود سے تو باہر ہے لیکن شمالی سرحد سے چند میل دور ہے، جب سے یہ ریاست کی شکارگاہ چلی آتی ہے اور اس گاؤں کی رعایا سے صرف کیمپ اور شکار کی خدمات لی جاتی ہیں جس میں انھیں بڑی مہارت ہوگئی ہے کیونکہ وہ انہی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو نیم خانہ بدوش نیم کاشتکار رہے ہیں۔

خاں صاحب کو فیل خانہ بھر میں نرآلی اور اس کی بیٹی نزاکت سے بڑی انسیت تھی اور دونوں کو اپنی خاص سواری میں رکھا کرتے تھے اور اس وقت بھی کیمپ میں وہ دونوں ان کے ساتھ سواری میں تھیں۔ دونوں ہتھنیاں اپنی صورت شکل خصلت جبلت کے لحاظ سے خاں صاحب کو بے نظیر معلوم ہوتی تھیں اور اپنی مخصوص روایات رکھتی تھیں۔

پالتو ہتھنی بچہ نہیں دیا کرتی یا ہاتھیوں سے نسل کشی نہیں کرائی جاتی اور نرآلی کے بطن سے خاص فیل خانہ کے اندر نزاکت

پیدا ہوئی تھی۔ خیر پہلی مجوبہ چیز یا لو ہتھنی کا بچہ بنا ہی تھا، پھر یہ کہ نزاکت کھیدے میں پکڑی گئی تھی اور جنگل سے تقریباً آدھے دنوں سے کچھ اوپر حاملہ آئی تھی۔ بالعموم کھیدے میں جو ہتھنیاں گابھن آیا کرتی ہیں ان کے حمل کھیدے سے لے کر سدھانے تک کی چپقلش برداشت نہیں کرتے اور یہی دیکھا گیا کہ اسقاط ہو جاتے ہیں اور اگر خاص احتیاط نہ کی جائے تو حاملہ ہتھنی بھی مر جاتی ہے کیونکہ کھیدے میں پکڑ کر مانوس ہونے تک جو مار دھاڑ اور تکالیف پہنچائی جاتی ہیں اس میں ہاتھی ادھ مرا ہو جاتا ہے جب وحشت دور ہو پاتی ہے اور اس کے بعد پھر ایک مدت میں کام پہ لگ پاتا ہے۔ لیکن شاید نزاکت غیر معمولی سخت جان بھی تھی اور خلقی طور پر شائستہ جبلت تھی۔ بڑی جلدی سدھ گئی۔ یوں بھی "سانٹھ ماروں" نے بھانپ لیا تھا کہ حاملہ ہے لہٰذا مخصوص احتیاطیں شروع ہی سے برت رہے تھے۔ شائستہ جبلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود تکلیفیں بھی کم اٹھائیں اور پیٹ کا بچہ بھی زندہ بچ گیا۔ پوری مدتِ حمل سے کچھ دنوں قبل پیدائش ہو گئی اسی لیے نزاکت بہت کمزور تھی۔ چند روز تو زندگی کی امید نہ رہی مگر ریاست کے اندر بڑی اچھی طبی امداد موجود تھی۔ بہترین ویٹنری ڈاکٹر اور بڑے بڑے تجربہ کار اور ماہر مہاوت پڑے ہوتے تھے۔ اور بچہ بیمار تو نہ تھا صرف پیدائشی کمزور تھا، یہ ہفتہ بھر سسکتی سی رہی انھیں علاج معالجہ، غذائیں پہنچانے کا وقت ملا اور یہ کھڑی ہو گئی، نہایت لاغر اور بڑی نحیف، جب ذرا اچھلنے کودنے لگی تو خاں صاحب نے اسی رعایت سے نزاکت نام رکھ دیا۔ پرورش کے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ گاؤ خانہ میں سیکڑوں من دودھ ہوتا تھا، خاں صاحب کی نظرِ شوق تھی۔ خود نزاکت ذرا انوکھے مزاج کی ہتھنی تھی اور اسی بنا پر خاں صاحب نے یہ نام دیا تھا اور اسی وجہ سے خاں صاحب کی بڑی محبوب سواری تھی اور کچھ اس کی بیٹی ہونے کے سبب اور کچھ خانہ زاد ہونے کی وجہ سے نزاکت فیل خانہ کی لاڈلی بن گئی اور شاید انہی ناز برداریوں کے سبب بڑی شوخ و شنگ اور چلبلی ہتھنی اٹھان اٹھ رہی تھی اور بڑی جلدی عمر کے اس دور میں پہنچ گئی جب بچپن جوانی کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔ خاں صاحب محمود خاں نے اس کو بھی ٹریِن کرنا شروع کر دیا اور جب نزاکت نے اک ذرا اور پر پرزے نکالے تو خاں صاحب کی نگاہِ شوق ماں سے زیادہ بیٹی پہ گڑی ہو گئی اور کبھی کبھی اس پر بھی ہلکی پھلکی سواری لے لیا کرتے جس میں انھیں بڑا لطف آیا کرتا۔

جس رات کی یہ بات ہے وہ بڑی اندھیری رات تھی۔ جاڑے کی مانسون خلیج بنگال سے اٹھ کر ہمالیہ سے ٹکرائی تھی اور بادلوں نے بارش کے بجائے کہرے کی شکل اختیار کر لی تھی پھر زوال ماہ کی اخیر تاریخیں تھیں، پوری کی پوری چوبیس گھنٹہ کی طویل راتیں اندھیری ہی اندھیری ہو رہی تھیں اس پہ سیاہ کہرا اوپر کمایوں اور گڑھوالی کی بلندیوں سے اترتے ہوئے کالے کالے بادلوں کا سلسلہ، نیچے نم سیاہ زمین آسمان سے جیسے سیاہی کے تودے زمین کی جانب لڑھک رہے تھے۔ زمین پہ گویا بحرِ ظلمات میں طوفان اٹھ رہا تھا اور فضائے بسیط میں سیاہیوں سے سیاہیوں کا تصادم ہو رہا تھا۔ ہوا دم بخود تھی، مستقل تمام رات نغمہ سرائی کرنے والے جنگلی پرند خاموش تھے حتیٰ کہ جھینگر بھی چپ تھے۔ کہیں سے کانکڑ، سانبھر، چیتل کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ دور کہیں پر کوئی اُلّو کڑکڑاتا تو غلیظ کہرے اور نمی سے بھری ہوئی فضا میں آواز پھیل نہ پاتی اور وہیں کی وہیں مسخ ہو کر اور گھٹ کر رہ جاتی۔

جنگل، میدان، آبادی، کیمپ ہر چیز سیاہیوں میں گم تھی، صحیح صحیح لفظوں میں ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے رہا تھا اور مہیب خاموشی اس تاریکی کو سیاہ تر بنا رہی تھی اور خاموشی اور تاریکی کچھ ایسی مدغم تھیں کہ جیسے دونوں ایک ہی کیفیت سے معمور ہیں، گویا

ایک ہی چیز ہیں۔ خانصاحب محمود خاں کا کیمپ گاؤں سے تھوڑی دور کے فاصلہ پہ لگا ہوا تھا اور تاریکی میں ہر چیز گم تھی، حتیٰ کہ خاں صاحب کے خاص خیمہ کے سامنے جو مٹی کے تیل کی لالٹین نصب تھی وہ بھی غلیظ کہرے کی تہوں میں روشنی پھینکنے سے معذور تھی۔ کیمپ سے دو سو گز پر ایک برگد کے درخت کے نیچے نزاکت بندھی ہوئی تھی اور عین اس کے مدِ مقابل دو سو گز مخالف سمت پر ایک اور برگد کھڑا تھا جس کے نیچے نرآلی بندھی ہوئی تھی درمیان میں کیمپ کی چھولداریاں حائل تھیں۔ دونوں کو ایک دوسری سے علیحدہ اور اتنی دور اس لیے باندھا جاتا تھا کہ اگر ایک جگہ باندھی جائیں یا قریب قریب ہوں تو تمام رات شور کریں اور اسی لیے کہ یہ چار سو گز کے فاصلہ سے بھی باتوں کی جھڑی لگا دیں گی یہ اہتمام کیا تھا کہ درمیان میں چھولداریاں تھیں اور یہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل بھی تھیں۔

تقریباً چھ ماہ سے نزاکت کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ چنچل پن اور سیمابی کیفیت کم ہو رہی تھی اور جبلی طور پر انداز مائل بہ شائستگی ہوتا جا رہا تھا۔ یہ چیز مستی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے مگر اس کو نہ تو خانصاحب ہی سمجھے اور نہ کوئی فیل بان وغیرہ ہی، دراصل یہ سب لوگ ان علامات سے ہی واقف نہ تھے جو ہتھنی میں بالغ ہونے کے بعد پہلی مرتبہ مستی آنے پر پیدا ہوتی ہیں ورنہ اس زمانہ میں جب ہاتھی ہتھنیاں مستی پر ہوا کرتے ہیں احتیاط کی جاتی ہے اور کیترا وغیرہ بارد اور مسکن دوائیں اور ایسی ہی مخصوص غذائیں دے کر بہت جلد اس کیفیت کو ختم کر دیا جاتا ہے، کیونکہ ایسی حالت سواری وغیرہ میں حارج ہوتی ہے۔

اور نزاکت کی ننھی ننھی آنکھوں میں مدتوں سے نشہ سا بھر رہا تھا، چلتے چلتے جھومتے جھومتے ایک دو قدم رقص جیسے ڈال جاتی۔ ہوا میں ہمہ وقت سونڈ لہرا لہرا کر دور دور کی خوشبو لینے کی کوشش کرتی، کان بار بار ساکت کر کے جیسے کسی دور کی آتی آواز پہ لگاتی، انداز ایسا تھا کہ جیسے کسی بڑی دور سے آنے والے کی ہمہ وقت منتظر ہے ——— ہمہ تن مشتاق ——— اور آج کی رات میں اس کی کشش نے جو زور مارا تو دور کا آنے والا سچ مچ پہنچ ہی گیا۔

حسنِ اتفاق سے اکڑا ان دنوں ادھر ہی تھا، مستی کا زمانہ تھا اور اکڑا بھی بھرپور مستی پر تھا۔ اب کی مرتبہ غول میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے اور سخت ڈیل ڈول لڑنے کے بعد بھی کوئی ہاتھ نہ آئی تھی اور محرومی در محرومی اور بدنصیبی در بدنصیبی یہ تھی کہ اکڑا جس مال زادی کے لیے لڑتا تھا وہ بجائے اس کے ہاتھ آنے کے اسی بھاگے ہوئے رقیب کے ساتھ بھاگ جاتی تھی یہاں تک کہ اب کی مرتبہ اس بڑھیا ٹھریا نے بھی منہ نہ لگایا جو ہمیشہ بچی بچائی رہ جایا کرتی تھی۔

سب کے سب اپنے جوڑے بنا بنا کر غائب ہو گئے اور غول منتشر ہو گیا اور اکڑا تنہا رہ گیا اور عشق کی ناکامی میں دیوانہ سا ہو گیا، جو اس غصہ بڑے زور سے بروئے کار آ گئے، ہجر میں عشق کا جوش انتہا کو پہنچ گیا مگر جنگل میں دور دور کہیں محبوب کی خوشبو نہ تھی بجز اس کے کہ مہوا اور رسال کے دیو پیکر درختوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر رہ جائے چارہ نہ تھا۔ اور اسی بے تابی میں وہ آنکھ ناک کان سے تلاش کرتا ہوا ادھر کو بھی منہ اٹھا دیوانہ وار لپکتا رہا ——— نامعلوم شے کی جستجو ——— تلاش و جستجو، جستجو و آرزو ——— نہ چال ہی میں توازن نہ سمت اور منزل ہی کا تعین، بس تلاش ہی تلاش، یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر بڑی بھینی بھینی خوشبو ناک میں پہنچی شاید بالکل ایسی جیسی مٹی کے کورے برتن میں پہلی مرتبہ پانی پڑنے کے بعد ہماری ناک میں پہنچا کرتی ہے اور یہ خوشبو ہر سال اکڑا سونگھا کرتے تھے مگر اتنی عمر

ہونے کو آئی اور اتنے بڑے بہادر سردار واقع ہوئے تھے مگر کبھی اس کی لذت سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ عمر میں پہلی مرتبہ تقدیر کا ستارہ ایسی تابناکی کے ساتھ چمکا اور پانچ میل سے نزاکت کی کنواری خوشبو لے کر ہوا کے رُخ پہ ناک کی سیدھ لپکا، چال میں چلنے کے بجائے جیسے کچھ کھنچنے والا انداز تھا اور سچ مچ گویا مقناطیس کی چٹان لوہے کے تودے کو کھینچ رہی تھی اور اکڑا نے آناً فاناً میں یہ چند میل کا فاصلہ پاؤں میں لپیٹ لیا۔ کُہرے کی سیاہ اور نرم چادر سے نمودار ہوتے ہوئے جوں ہی کنواری اچھوتی نزاکت نے اپنے مطلوب کو دیکھا تو سینہ کے اندر بڑے زور سے کوئی چیز پھڑپھڑا پڑی —— خوشبوؤں سے ساری فضا مہک اٹھی۔ مخصوص پیار کی آواز بڑے ناز کے لہجہ میں آہستہ سے نکالی، اور یہ آواز جیسے اس نے یکدم ابھی ابھی سیکھ لی تھی، ادھر سے اکڑا نے اپنی ذرا اکھڑ قسم کی ناز برداری والی آواز میں صدائے لبیک دی اور اکڑا بیچارے کو تو آج تک اس آواز میں کسی نے خطاب ہی نہ کیا تھا جس میں نزاکت نے پکارا تھا دعوتِ وصل کا یہ شیریں ترنم سُن کر اکڑا نہ تو کیمپ دیکھ سکا، نہ اتنی گہری قسم کی آدمی کی بُو لے سکا نہ سوتے آدمیوں کے خراٹے اور سانسیں سُن سکا، اسے اپنا ہی آگا پیچھا سجھائی نہ دیا جیسے اس کی جبلت اس کے حواسِ خمسہ اور چھٹی حس سب کے سب ایک نزاکت کے مرکز پر جمع ہو گئے۔ دو ازل کے بچھڑے مل گئے، پہلے دونوں سونڈوں سے مصافحہ ہوا، پھر یہ اک ذرا کھسکا اور وہ جھومی اور جھوم کر وجد کر گئی۔ کچھ ناچنے کا سا انداز بنایا، دونوں سونڈیں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور ایک ہلکی سی جنبش نے اور قریب کر دیا، اور سونڈوں میں ایک اور بل پڑ گیا۔ سینوں کے اندر سے فیں، فیں، فیں، پریم بھری آواز بڑے مدھم سُر میں نکلتی رہی، دونوں جانب ایک جھرجھری سی آ گئی یہاں تک کہ سونڈوں کے لوچ میں جتنی گنجائش تھی ایک دوسری سے لپٹ گئیں اور شاداب نم ناک ہونٹ، ہونٹ سے آ ملا۔ اندر سے گرم گرم نم زبانیں لپک پڑیں اور ایک دوسری کو رگڑنے لگی اور رگڑتے رگڑتے ہونٹوں کے ساتھ مل کر چسکیاں بھرنے لگی۔ امرت کی چسکیاں —— آبِ حیات کے گھونٹ وہ غٹاغٹ پیتے رہے، مشکبو سانسیں تند نشے کی لہروں کی صورت ایک دوسرے کی رگ و پے میں اترتی رہیں۔ نہ معلوم کتنی دیر یہ من تو شدم تو من شدی کے طویل بوسہ کا تسلسل چلا یہاں تک کہ خون میں اٹھتے ہوئے جھاگ پھٹ پڑنے کی حد تک چڑھ گئے تو سونڈیں بوسہ کا سلسلہ ختم کر کے جسم کی دوسری گولائیوں کا جائزہ لینے لگیں۔ نزاکت کو زلزلہ سا محسوس ہوا جیسے اسی ارتعاش میں جھومتے ہوئے اکڑا کو اپنی رگ رگ میں سمو لے یا خود اس کے وجود میں ضم ہو جائے۔ ڈھیلی ڈھالی بڑی بوڑھیوں کے ٹھنڈے لٹکتے کھردرے جسموں کی روکھی پھیکی بے کیف و روح لذت کے آشنا اکڑا نے آج عمر میں پہلی مرتبہ کسی اچھوتی کم سن کا کورا پنڈا چھوا تو دیوانہ سا ہو گیا جیسے سب کچھ کلیجہ میں اتار لینے کو جی چاہا....

دو اُبلتے ہوئے وجودوں میں ایک دوسرے سے جتنی قربت کی گنجائش تھی وہ مل گئے اور فیل خانہ کی لاڈلی نزاکت پر شاید شبِ عروسی کی دلہن والی سب کچھ ابھی یہیں پر بیت جاتی مگر اکڑا کی بدنصیبی، پٹھوں سے ملحق پیچھے برگد کا موٹا تنا تھا اور نیچے پھیلی ہوئی جڑوں میں دو موٹی زنجیروں کے ذریعہ نزاکت کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے اور رونگٹا رونگٹا ایک دوسرے سے چمٹے ہونے کے باوجود اکڑا نزاکت سے بہت دور تھا اور نزاکت اکڑا کی دسترس سے بالکل باہر تھی۔ بعض بعض گرم گرم سانسیں جو ایک مرتبہ ملیں تو اکڑا کا اُبال بڑھتے بڑھتے جیسے ابھر سا پڑا۔ نزاکت کا وجود بڑے زور سے ہل گیا اور اس دوری کو قربت میں بدلنے کے لیے جیسے انھیں نے اندر ہی اندر ایک بل سا کھایا، ان کی روحیں پھریریاں لے اٹھیں۔ اکڑا نے پینترا سا بدل کر اپنی سونڈ نیچے سے ڈال کر نزاکت کے سینہ اور پسلیوں کو لپیٹ میں بھر لیا اور ایک اکھیڑ لگائی جیسے سو ہزار سالہ بوڑھے برگد کے شاید اس قطعۂ زمین ہی کو اس اندھیرے ماحول کو

جہاں نزاکت کھڑی ہے سب کچھ کھینچ کر لے جاتے گا۔ اس رستخیز میں پچاس من کے اکڑا اور پینتیس من کی نزاکت دونوں چٹانوں کے اندر لاوا پورے زور سے بھڑ بھڑا اٹھا ـــــ اب نہ معلوم اس میں کچھ اکڑا کے جناتی عشق کی قوت و کشش کو بھی دخل تھا یا نزاکت ہی کے جوشِ جنوں کے ایک جھٹکے نے دونوں زنجیریں توڑ کر ہاتھی کے زنجیر توڑنے کا ریکارڈ توڑ دیا، اور چل پڑے۔

اوّل تو جو کچھ ہوا وہ بہت ہی مدھم آوازوں میں ہوا، رازو نیاز ہی جو تھے، پھر اخیر رات کی نیند اور سردی کا موسم چوکیدار اور فیل بان پہلے تو چونکے نہیں اور جو ایک آدھ کے نیند میں غلطاں دماغ کے اندر کچھ ہلکی ہلکی آوازیں پڑیں بھی تو یہ خیال کر کے کہ نرالی کھل کر نزاکت کے پاس چلی آئی ہے اور ماں بیٹی باتیں کر رہی ہیں اور یہ فیل خانہ کے اندر نرالی اور نزاکت کا اکثر معمول تھا اور ابھی سال ڈیڑھ سال پیشتر تک تو نزاکت کے پاؤں میں پابندی کے ساتھ زنجیر ڈالی بھی نہ جاتی تھی اور صبح سے شام تک اکثر و بیشتر وقت نزاکت کا ماں کے پاس ہی گزرا کرتا تھا۔ لہٰذا جاڑوں کی نیند میں ان کا قیاس صحیح ہی تھا اور وہ کروٹ بدل کر بدستور سوتے رہے مگر صبح کو جو دیکھا تو نرالی اپنی جگہ پر بندھی تھی اور نزاکت غائب تھی۔ میدان پر جو نظر کی تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، سب کے سب جمع ہو گئے نم زمین پر ایک بہت بڑے ہاتھی کے پاؤں کے نشان کے ساتھ نزاکت کے کھوج بنے ہوئے تھے اور دونوں بڑی تیز رفتار سے جنگل کی جانب کو گئے تھے۔ کچھ دور ان کھوجوں پر چلے اور جب سب کچھ جو گزری تھی سمجھ لی تو خانصاحب کو بستر پر اطلاع دی کہ رات نزاکت کسی جنگلی ہاتھی کے ساتھ بھاگ گئی۔ خانصاحب نے سر پیٹ لیا۔ پہلے اپنا فتح پوری کوٹا لے کر پورے اسٹاف پر اکھاڑا لتھ جھاڑ دیا، پھر فیل بانوں اور چوکیداروں کو لوٹ کی ٹھوکروں سے مار مار کر فٹ بال بنا دیا اور دوبارہ کوڑے کی گردان کر دی، چمڑی ادھیڑ کر پھینک دی۔ جب ذرا دھیمے ہوئے تو غصہ نے غم کی سی شکل اختیار کر لی۔ سو گز تک نزاکت اور اکڑا کے کھوجوں پہ دوڑتے چلے گئے، پھر بھاگتے ہوئے پلٹے، زور سے چلائے۔

"ارے حرامیو! کوئی میرا بڑا رائفل تو دو۔"

کسی کانپتے ہانپتے نوکر نے دوڑ کر رائفل دیا تو اضطراری کیفیت میں دونوں نالوں میں کارتوس بھر کے پھر کھوجوں پر لپک کر چلنے لگے جیسے یہیں کہیں پر سو پچاس قدم کے اندر ہاتھی نزاکت کو پکڑے بیٹھا ہے، پھر اسی رفتار سے پلٹے اور بڑے زور سے گالیوں کا ایک موٹا سا آبشار ہونٹوں سے بہا کر لوگوں کو ساتھ چلنے کے لیے آواز دی، اس کیفیت میں اور پھر ہاتھی مارنے کی بندوق ہاتھ میں دیکھ کر ہر شخص لرزہ براندام تھا، آواز کے ساتھ ہر ایک چل پڑا۔ تقریباً میل بھر چلنے کے بعد ذرا اور سکون پر آئے تو دس بارہ چیدہ چیدہ آدمی ساتھ لے لیے اور باقی لوگ واپس کر دیے کیونکہ انھوں نے کھوجوں سے رفتار کا اندازہ کر لیا، ہاتھی صحیح معنی میں نزاکت کو بھگا کر لے گیا تھا، صبح سے چل کر دوپہر ہو گئی اور وہ کھوجوں ہی کھوجوں کیمپ سے پندرہ سولہ میل دور پہنچ گئے تو اتنی دور ٹانگوں کو حرکت دینے کے بعد غالباً نجیب الطرفین خانصاحب کا دماغ کھدا اور شاید یہ سوچ کر کہ اگر مل گیا تو مارے گا کون، پلٹ پڑے اور واپسی میں پتہ چلا کہ اکڑا دو تین روز سے اس نواح میں دیکھا گیا ہے، مزید تیقن کے لیے جس جس جگہ اکڑا کا دیکھنا دیہاتیوں نے بتایا تھا وہاں پہنچ کر کھوج بھی دیکھے تو وہ ان کھوجوں کے بالکل مطابق تھے لہٰذا یہ بات پلئے تحقیق کو پہنچ گئی کہ رات والا ہاتھی وہی ہے جس کے کھوج دیہاتیوں نے دکھلائے اور ساتھ ہی ساتھ دیہاتیوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ایک دانت والا ہاتھی تھا اور اسی وجہ سے دیہات میں تھوڑا سا ہراس بھی تھا۔

اکڑا اس وقت تک کئی خون کر چکا تھا۔ محکمہ جنگلات والوں نے اس کے استیصال کے احکام اوپر سے منگوائے تھے مگر دیہات کی افواہیں دو کی نو اور نو کی ننانوے بن کر اڑا کرتی ہیں۔ پھر ہم کو جو اطلاعات ریاست کے محکمہ جنگلات سے پہنچی تھیں وہ بھی گورنمنٹ کے محکمہ جنگلات کی اطلاعات سے علیحدہ تھیں اور دیہاتی افواہوں کو کیا کہیں جب دو حکومتوں کے محکموں کی اطلاعات ہی مختلف تھیں لہٰذا ہماری نگاہ میں ان کی بھی کوئی وقعت نہ رہی اور قاعدے کے مطابق شکار کو جانے سے قبل ہر قسم کی صحیح تحقیقات کر کے قدم اٹھانا تھا۔ اب ہم سب موقع پر پہنچ گئے تھے اور نقشہ باقاعدہ ہی جم رہا تھا۔ خانصاحب شکار کے انتظام میں بڑے صاحبِ فن قسم کے منتظم آدمی تھے اور کیوں نہ ہوتے ساری عمر کیا ہی کیا تھا اور پھر اس وقت ان کی دلچسپی ظاہر تھی، وہ جانتے تھے کہ اب اکٹ کے ہاتھ آنے کی جبھی امید ہو سکتی ہے جب اکڑا مارا جائے لہٰذا اس شکار کا انتظام کچھ اس ٹھاٹ کے ساتھ کر رہے تھے جیسے سرکار کے یہاں وائسرائے بہادر مہمان ہوا کرتے تو ہوتا تھا۔ انھوں نے نہایت سائنٹیفک طریقہ پر پروگرام ترتیب دیا اور اس کے مطابق انتظام کیا، یہ پروگرام سب پارٹی کی مجلسِ شوریٰ نے کافی بحث و تمحیص کے بعد منظور کیا اور حسبِ ذیل قرارداد میں طے پائیں:۔

(۱) اکڑا کی جبلت کے متعلق کما حقہٗ واقفیت حاصل کرنا (۲) افواہوں میں سے اصلیت کو چھانٹنا (۳) ہر واقعہ کی تحقیقات بذاتِ خود کرنا اور ہر جائے وقوعہ کا معائنہ کرنا (۴) اکڑا کی بازی گاہ کا صحیح تعین کرنا (۵) اس کے بعد اکڑا کا تعاقب کرنا اور شکار کرنا ——— اس کے علاوہ ریاست سے دو ہاتھی، چھ گھوڑے، ایک اسپورٹنگ فورڈ اور چھ ۴۰۰/۴۵۰ بور کے رائفل اور کارتوس منگانا۔

یہ اسکیم بنا کر انھوں نے بجی پور کے تقریباً تمام جوانوں کو طلب کیا۔ یہ کاشتکار تو ایسے ہی ویسے تھے مگر بہترین کھوج لگانے والے شکاری تھے اور گلہ بان اور لکڑہارے، شہد توڑنے والے کنجڑ پاسی اور بھیل وغیرہ نیم خانہ بدوش قسم کے لوگ تھے اور آناً فاناً میں ہزاروں مربع میل پر یہ جاسوسوں کا جال پھیل گیا اور دوسرے ساتھیوں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ شکار کا اتنا مکمل اور محیط انتظام دیکھا۔ شکار سے زیادہ جیسے کچھ جنگ کا جیسا اہتمام تھا۔ ہم نے چند ہی روز میں اپنی تحقیقات مکمل کر لیں۔ افواہیں چھانٹ دیں، محکمہ جنگلات کے کاغذات میں صحت کرائی۔ اکڑا کے خونی ہو جانے کی وجہ بھی روشن ہو گئی اور ہر چیز صاف ہو گئی۔ ہر جائے وقوعہ بھی اپنی آنکھ سے جا کر دیکھی۔ ہاتھی کے کھوج تو مہینوں نہیں ملتے ہیں، اکثر سنگ کھوج بھی دیکھے۔ تقریباً تمام مقتولین کے ورثاء سے ملے، چشم دید گواہوں کے بیانات اکثر جائے وقوعہ پہلے جا کر لیے اور چپہ چپہ دیکھا۔

(۲)

جنتا ہاتھی صلح پسند جانور ہے یہاں تک کہ جنگل سے پکڑ کر آتا ہے اور پھر انسان کی خدمت اور محبت میں عمر کاٹ دیتا ہے لیکن اکڑا پیدائشی طور پر رعب دار تھا، عام ہاتھیوں کی فطرت کے خلاف اس کے اندر [illegible] عداوت تھا اور اس میں اس کا ایک ہی لمبا چاہ دانت اور نرور عجیب انداز سے مڑی ہوئی ٹانگیں [illegible]

تھیں بلکہ ماہرین جبلتِ حیوانات تو یہ کہیں گے کہ چونکہ یہ بے پناہ ہتھیار سے مسلح تھا اس لیے اس کی یہ جبلت مرتب ہو گئی تھی غول سے علیحدہ بھی رہتا لیکن غول کا پنڈ بھی نہ چھوڑتا۔ غول کے ساتھ چلتا تو اپنی من مانی کرانا چاہتا۔ کوئی غول سے اس کو علیحدہ تو کر ہی نہ سکتا تھا بلکہ جس کو وہ جب چاہتا غول سے مار کر بھگا دیتا۔ چرائی کے وقت غول سے علیحدہ ہو جاتا اس لیے کہ وہ کاشتہ رقبوں پر ڈکیتی مارنے جایا کرتا اور پورا غول جنگلی چارہ سے پیٹ بھرتا اور کاشتہ رقبوں پر اکثر بڑی جلدی شکم سیر ہو جایا کرتا اور پھر اودھم مچانے کے لیے غول میں آدھمکتا۔ یہ بیچارے کہیں بہڑ، ٹانٹر، چاندر کے قطعوں میں پیٹ بھرتے ہوتے، یا کہیں کسی جوہڑ جھیل میں لڑسی گیسو منہ مارتے ہوتے ورنہ کہیں برگد، پیپل، پاکھڑ وغیرہ جنگلی درختوں کے جھنڈ میں شاخ شاخ توڑ کر اور محنت کر کر کے آہستہ آہستہ کھاتے ہوتے لیکن اکثر جتنے فسادی واقع ہوتے تھے اتنے ہی کام چور اور حرام خور بھی۔ لڑائی جھگڑے میں تو صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ڈٹ کر خون پسینہ ایک کر سکتے تھے مگر جنگلی چارہ توڑ کر اور سنبھال کر کھانا اپنے بس کا روگ نہ تھا محنت سے یہ تھا چرائی کے لیے آپ کاشتہ رقبوں کا رُخ کرتے، جہاں مال ہی مال پھیلا ہوتا ہے اور محنت کے بغیر سب کچھ ہاتھ آتا ہے۔ ہرے بھرے میٹھے میٹھے شاداب گنے، دودھ بھرے گیہوں، جو، سوندھے سوندھے چنے، نرم نرم مٹر، خوشبودار دھان، میٹھی میٹھی جوار باجرہ، پھر جہاں کہیں بھی ہاتھ ڈال دو بھرا ہی بھرا پڑا ہے، پھر بھر منہ کھاتے چلے جاؤ، نہ توڑنا کھیڑنا، چھیلنا صاف کرنا، نہ تلاش کرنا اس حرام خوری اور چوری کی عادت نے چٹورا، نیت خراب اور پیٹو بھی بنا دیا تھا، کھردرا لقمہ عمر بھر حلق سے اترا ہی نہ تھا۔ جنگلی چارہ اچھی طرح پچاتے ہی نہ تھے اور چونکہ تر مال آسانی کے ساتھ ہل جایا کرتا تھا لہٰذا کھایا بھی پیٹ سے اوپر جاتا تھا ——— پھر لطف یہ کہ اس تر مال اور نرم چارہ کے ساتھ جو قباحتیں لگی ہوئی تھیں وہ آپ کی روحانی غذا تھیں، کبھی کبھی راستوں پر ڈھکے ہوئے گڑھے، اگر جا پڑو تو زندہ درگور ہو جاؤ (اگرچہ یہ محکمۂ جنگلات کے قانون کے خلاف تھا پھر بھی کاشتکار پریشان ہو کر کبھی کبھی کھود دیا کرتے تھے) پگڈنڈیوں اور چوراہوں پر تین نوک والے لوہے کے کانٹے جو اگر تلوے میں چبھ جائیں تو کھڑے ہی کھڑے سوکھ کر رہ جاؤ پھر آدمیوں کی للکاریں اور کہیں کہیں پٹاخے کی آوازیں، کتوں کی چیخیں، ڈھول تاشے اور کنستروں کا شور اور تمام ہائے ہائے میں اس کو مزا آتا۔ سچ پوچھیے تو جس دن یہ ہائے ہائے اور شور و شغب نہ ہوتا اور کسان غافل ہو جاتے اس دن ڈنر میں بھی آدھا لطف رہ جاتا اور پھر وہ اس کی کمی پلٹ کر غول میں پوری کرتا اور چھوٹا بڑا کوئی ایک بھی اس کی ایک آدھ جھڑپ سے نہ بچتا۔ اگر کہیں فرحت کا احساس ہوتا تو دو مواقع پر ایک تو جب پورے غول کی عام گوشمالی کر کے کیڑے مکوڑوں کی طرح ایک ایک کو بکھیر دیتا اور اس سے زیادہ جب وہ اپنے پاؤں کی روندی ہوئی فصل پر دوبارہ نظر کرتا اور چرتے ہوئے وہ اس سلسلہ میں مخصوص انداز کے ساتھ ذرا گھسیٹ کر قدم اٹھاتا اور ایک لقمہ چانے کے دوران میں چار گٹھے اکھیڑ کر ادھر ادھر پھینکتا جاتا، پھر جانب کر کھیت کے بہتر سے بہتر حصہ کی جانب رُخ کرتا۔ ریاست رام پور اور ضلع نینی تال کی تین چار تحصیلوں میں بسنے والے کسان آپ کے اوصافِ حمیدہ سے اچھی طرح واقف تھے، بچہ بچہ آپ سے غائبانہ متعارف تھا اور بعض کو شرفِ دیدار بھی حاصل ہو چکا تھا۔ ہر شب کسی نہ کسی کی کشتِ امید پر برقِ خرمن سوزاں کر آنجناب کا ورودِ مسعود ہوتا اور بس ایک ہی تشریف آوری میں اس بدنصیب کے گھر میں سال بھر کے لیے فاقہ ڈال جایا کرتے۔ یہاں تک کہ ایک رات آپ نے پھل لذیذ بہت شوق سے کھایا یعنی گنا چوستے بیٹھے دانتوں میں پھلی لگ لی ——— ہوا یہ کہ ایک وسیع گنے کے رقبہ پر کھاتے کھاتے

کھیلتے، اکھیڑتے، پھینکتے بڑھتے بڑھتے آپ کرلھو کی جھونپڑی تک پہنچ گئے۔ پیٹ بھرا تھا اور طبیعت یوں بھی جولانی پر تھی پہلے
یہ اچھی بھلی جھونپڑی کھڑی دیکھ کر تنکا تنکا بکھیر دینے کو جی چاہا۔ ایک ڈگ بڑھا کر کچھ ٹھٹک گئے۔ بڑی خاص خوشبو آ رہی تھی
ویسے یہ بھی کبھی کبھی کاشتکاروں کی جانب سے ہوا میں آتی ہوئی سونگھی تو تھی لیکن مزا سے آشنا نہ تھے لیکن اس وقت تو یہ
بالکل ہی قریب تھی، اکڑا کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے مگر اتنا ضرور سمجھ گئے کہ ہے کوئی زوردار مال، اک ذرا اور بڑھے۔ آپوں آپ منہ
میں پانی بھر آیا —— اک ڈگ اور بڑھا لی۔ کیسی اچھی —— کتنی پیاری خوشبو —— ایک دھچکا سا لگا کیسی مست لپٹ آئی۔ کیسی
شیریں! —— اور وہ تو بے خود سے ہو گئے اور سونڈ جھونپڑی کے اندر ڈال کر بچھے ہوئے پیال کا جائزہ جو لیا تو نوک فوراً ہی صحیح
جگہ پر پہنچ گئی اور وہ مال ہاتھ آ لگا —— ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قبل کسان گڑ بنا کر گئے تھے۔ وزن زیادہ تھا اور آدمی کم لہٰذا آٹھ
بھیلیاں یہیں پیال ہی میں دبا کر چھوڑ گئے تھے —— ویسے اکڑا کی زبان شیرینی سے تو آشنا تھی لیکن زیادہ سے زیادہ گنے کی ——
ایسی ٹھوس بے راگ، نرم اور زود ہضم، جتنی چیزیں آج تک کھائی تھیں سب کا مزا بھول گیا۔ یہ تو حلوا بے دودھ تھا، ایک ایک
کو سونڈ میں پکڑ پکڑ کر کھاتا رہا، پہلے تو اٹھاتے وقت سونڈ کی نوک ہر بھیلی پر چھوتے ہی شامہ کے ذریعہ شیرینی کا احساس رگ و پے
میں ایک عجیب لپک کے ساتھ لہرا جاتا، پھر نوکدار ہونٹ بڑھ کر استقبال کرتا، نیچے سے چپ کر کے زبان اچھلتی
اوپر سے جیسے تالو بڑھتا اور پیچھے سے حلق غپ سے لپکتا اور داڑھوں بیچاریوں کو تو بمشکل ہی چھونے کی نوبت آتی کہ پوری بھیلی غٹ
سے اتر جاتی۔ ایک ایک کر کے آٹھوں ننھے ذرا دیر میں اتار گیا۔ ننھی ننھی متلاشی سی آنکھیں جو ہمہ وقت گھومتی رہا کرتی تھیں مچ سی گئیں
پنکھا سے کان ٹھہر گئے، مسلسل لہراتی سونڈ لٹک گئی۔ پاؤں بھاری بھاری سے اٹھنے لگے۔ زبان نے ہونٹ اور سونڈ کی نوک اچھی
طرح چاٹ کر صاف کر دی۔ پھر بھی چاٹتی رہی۔ میں سیر گڑ پیٹ میں بھرے اکڑا شاید عمر میں پہلی مرتبہ اچھے موڈ میں چل پڑا، آج والی
میں نہ تو فصل کچلی اور نہ پیٹ بھر کر جیسا کہ ہمیشہ اس کا طریقہ تھا لڑنے کے لیے غول کی جانب لپکا۔

آج نہ معلوم کون سے کونے کھدرے میں سے شرافت سی جھلک اٹھی۔ گنے کے رقبہ کے اختتام پر میدان تھا اور
پھر جنگل کا سلسلہ تھا۔ پورب میں ایک جوہڑ پر غول جمع تھا سب کے سب لڑمس، کسیرو کی جڑیں اور رناری کی بوندیاں اکھیڑ اکھیڑ اور
دھو دھو کر کھا رہے تھے۔ اکڑا نے ادھر سے گردن موڑلی اور پھر شمال کی جانب رُخ کر دیا۔ آج اس کے اندر ساتھیوں کی
بُو اور آوازوں سے بھی لڑنے کی جھرجھری نہ آئی۔ تازہ گڑ کی ہلکی گرمی آہستہ آہستہ رگ و پے میں اتر رہی تھی اور حرارت غریزی کو
ابھار رہی تھی۔ زبان ابھی تک ہونٹ چاٹ رہی تھی۔ پہاڑی ہوا کے رُخ پر آٹھ میل چل کر ایک چھوٹے سے گہرے تالاب پر پہنچا
خلاف عادت آدھی رات کے وقت پانی میں گھس پڑا صبح تک تیرتا رہا، فوارے اچھالتا رہا اور تمام رات وہ ادھر جو غول
میں ساتھیوں کے ساتھ مچاتا تھا تالاب کے پانی کے ساتھ مچاتا رہا۔ دن نکلے خوب نہایا دھویا چمکتا ہوا کنارے پر آیا اور سونڈ
میں چکنی دلدل بھر بھر کے سر سے لے کر پاؤں تک دبیز تہ لپیٹی اور گھنے جنگل کی جانب چل دیا۔

تمام دن گھنے سایہ دار درختوں کے سایہ میں نم زمین پر پڑا سستاتا رہا۔ غروب آفتاب سے ذرا قبل اٹھا قریب کے جوہڑ
میں سے تازہ کیچڑ اچھی طرح لپیٹی اور مغرب تک وہیں پانی اور کیچڑ سے کھیلتا رہا اور چرائی کے وقت سیدھا مات والی جنگل جانب
رُخ کر دیا اور بغیر فصل کا ایک تنکا بھی چھوئے سیدھا جھونپڑی پر جا دھمکا۔ خوشبو کل والی ہلکی ہلکی رچی ہوئی تھی کل کی طرح پھر اندر سونڈ گھسی

مگر ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے " تمام پیالہ الٹ کر پھینک دیا ' پھر دونوں چاکوں پر ٹٹولا یہاں پر خوشبو بہت نمایاں تھی مگر بس نری خوشبو ہی خوشبو ' مال کچھ نہیں ۔ بڑی باریکی کے ساتھ چاک پر ٹٹولتے ہوئے کہیں سونڈ کی نوک میں چنے کے برابر ایک دو ٹکڑے گڑ کے پھنسے ۔ انھیں منہ میں رکھا تو نہ معلوم کہاں چلے گئے ۔ چاکوں سے ہٹا کر کڑھاؤ کا جائزہ لیا ' خوشبو اس کے اندر بھی بھرپور رچی ہوئی تھی مگر ٹھنڈے لوہے کے سوا کچھ نہ تھا ۔ پلٹ کر کولھو کی جانب رجوع ہوا ۔ پہلے بیلن ٹٹولا ' پھر ناند کے اندر سونڈ گھسیڑ کر خوب پھراتا رہا ۔ خوشبو ہی خوشبو ' اور کچھ نہیں ' اب کھسیانا سا ہو گیا اور حرامی جبلت بروئے کار آ گئی ۔ پاؤں بڑھا کر اک ذرا جو اشارہ دیا تو ڈیڑھ گز گہرا زمین کے اندر گڑا ہوا کولھو اکھڑ کر جا پڑا ۔ کڑھائی الٹ دی اور بھٹی توڑ دی ' دونوں چاک توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیے ' جھونپڑی کے پھونس کا تنکا تنکا بکھیر دیا ' چھپت کی دیوار ڈھا دی اور لکڑیاں اکھیڑ اکھیڑ کر دور پھینک دیں ۔ پیٹ میں بھوک تھی اور رکھائی پر ہاتھ خالی جانے کا جھنجھل ' گنے کے رقبہ پر گھسا کر جو پھیلا تو خیر کھایا تو آٹھ دس ہی من مگر ایکڑوں تاراج کر کے پھینک دیا ۔ پچھلی رات تک پیٹ بھر کر غول میں جا پہنچا ' پہلے سب سے بڑے سردار کو چیلنج کیا ۔ وہ غریب اپنی آبرو لے کر اور طرح دے کر ایک جانب کو ہٹ گیا مگر ہٹتے وقت انداز سربلندی کا رہا ۔ بھلا اکڑا اس کو برداشت کر سکتا تھا ' ایک جھٹکا مار کر اور ذلیل کر کے ہی چھوڑا ۔ پھر دوسرے چودھری کو انتظاماً گرج کر مخاطب کیا ۔ وہ بہتیری صلح اور پیار کی آوازیں نکالتا رہا مگر ایک نہ سنی اور بھڑ ہی گیا ۔ بوڑھا چودھری کتنی کاٹ گیا اور طرح دے کر مقابلہ کو بچا گیا ۔ ایک پٹھورے نے ایک نوجوان ہتھنی کو ذرا مذاق میں چھو دیا ۔ اس نے ناز کے ساتھ کچھ شرم کر دی اور آپ نے پٹھورے کو بڑی تیز ڈانٹ بتائی ۔ اس کی شامت اعمال ' چودھری اور سردار کی طرح بھاگ جاتا تو کیوں گت بنتی مگر ہتھنی سے مذاق والی بات تھی اور نیا چڑھا خون اور پھر وہ اک ادا کے ساتھ ہی پہلو میں چل رہی تھی ۔ بات ذرا دوسری قسم کی ہو گئی اور نہ زیادہ ہمت نہ پڑی ۔ وہ فوراً جیت میں ذرا غصہ میں جھرجھری سی لے کر بھاں کرتا ہوا اینٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ بھلا اکڑا میں اتنی تاب کہاں تھی ' بس پھیل پڑا ۔

بیچارہ لڑکا ایک جھڑ کی بھی تاب نہ لا سکا ۔ ایسے موقعوں پر اپنی عزت اپنے ہاتھ ' ہاتھی تو غول میں سے کوئی بیچ بچاؤ کو آتا ہی نہ تھا کیونکہ جو بیچ بچاؤ کو آتا یہ اس کو چھوڑ کر اُس سے بھڑ جایا کرتا ۔ جب دیکھا کہ لڑکا غریب اب کی جھڑ میں زمین پر جا پڑے گا تو ہتھنیوں نے چیخ پیخ کر دہائی دی " ہیں ہیں بچہ ہے بچہ ! " وہ ایک بڑی بوڑھیاں درمیان میں آ گئیں تو خدا خدا کر کے جان بچا پائی وہ دو دو دھکے ان بیچاریوں کو بھی لگ گئے ——— اور سر شام کے برگد کی شاخوں پر جٹے ہوئے غول کا ابھی بمشکل آدھا پیٹ بھر پایا تھا کہ یہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اور کھانے کا خون ہو گیا اور یہ تقریباً روز کا معمول تھا ۔ پورے غول کا ہر فرد طرح دے کر ہر روز معرکہ آرائی بچایا کرتا تھا اور تقریباً ہر کھانے کے وقت اکڑا رنگ میں بھنگ کیا کرتا تھا ۔

دوسری شام اکڑا کے مقدر بدلنے کی شام تھی اور خود اس کی اور اس کی بانی گاہ میں بسنے والے آدمیوں کی تقدیر میں ایک تاریک باب کھلا ۔ اخیر رات غول میں فساد پھیلا کر اور مار دھاڑ کر کے جب ذرا طبیعت ہلکی ہوئی تو اکڑا صبح نکلتے ہی سب کو چھوڑ کر بانسی کے قطعہ میں ایک دلدل پر آ پڑا اور کبھی کنارے پر اور کبھی ذرا اندر کو بڑھ کر کیچڑ سے شغل کرتا رہا اور آج شام کو وہ جلدی اٹھ کھڑا ہوا ۔ سونڈ لگا کر دیکھا تو جدھر رات گیا تھا ادھر سے ہوا نہ چل رہی تھی لہٰذا ادھر کی تو کوئی خبر منزل نہیں بدل کر ہوا دوسرے گنے کے رقبہ کی جانب سے آ رہی تھی اور بڑی زور دار مست میٹھی خوشبو سے بھری ہوئی تھی

اگرچہ نہ چرائی کا وقت ہی ہوا تھا، نہ اکڑا کے پیٹ میں بھوک ہی پوری طرح بیدار ہو پائی تھی لیکن تیز مشتہی خوشبو نے بہیم ذکی الحس شامہ سے ٹکرا کر پیٹ کے اندر بھوک بھی بھڑکا دی اور منہ میں پانی بھی بھر آیا۔ برا ہو اس مٹھائی کی کشش کا وہ تو خیر حیوان مطلق تھا اشرف المخلوق انسان تک اس کی لاگ پر کبھی کبھی عزت تک بھینٹ چڑھا بیٹھتا ہے اور اتنی مست خوشبو پر پیٹ کے اندر بھوک ہونے اور چرائی کے وقت کا کیا سوال تھا۔ دو میل کا فاصلہ اکڑا جیسے دو ڈگوں میں لپیٹ کر گنے کے چک پر پہنچ گیا۔ محسوس تو شروع ہی سے کر رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر گہرے قسم کی مانس گندھ خوشبو کے ساتھ لگی ہوئی پائی مگر وہ خوشبو کے بے پناہ سحر میں ایسا بے خود تھا کہ پروا نہ کی اور جبلت کے خلاف بڑھتا چلا گیا البتہ رقبہ کے حدود میں اس نے بڑے ہی سبک قدم ڈالے اور کھڑی فصل میں کھٹکا کرتے ہوئے چلنے کے بجائے مینڈھوں اور پگڈنڈیوں پر ہوتا جبلت کے خلاف چور کی طرح خوشبو کی جانب بڑھا ـــ رقبہ کے بیچوں بیچ کولھو کی جھونپڑی تھی۔ رس پک کر گڑ کے قوام پر آ چکا تھا اور کسان کھڑی ڈنڈی والے لوہے کے کفچوں کے ذریعہ یہ خوشبودار آتشِ سیال کڑھائی میں سے بھر بھر کر پرنالے پر ڈال رہے تھے اور یہ لاوے کی طرح بہ بہ کر برابر لگے ہوئے مٹی کے چاکوں پر پھیل رہا تھا۔ دو چاک بھر چکے تھے اور ان کی سطح پر ہوا لگنے سے پتلی پپڑی جمنا شروع ہو رہی تھی مگر پپڑی کے نیچے وہی پڑیار کے لاسے جیسا چیپ دار لاوا بھرا ہوا تھا جو پکتی ہوئی کڑھائی میں سے بھڑبھڑاتا ہوا بہ کر آیا تھا۔ کسان منتظر تھے کہ ٹھنڈا ہو کر ذرا سختی آنا شروع ہو تو لکڑی کی ڈوئیوں سے منڈھ کر بھیلیاں باندھ لیں۔ یہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی چاک پر پڑا رہنے کے بعد ٹھنڈا ہو کر گڑ بندھنے کے قابل ہوتا ہے اور کڑھائی سے چل کر اور چاک تک پہنچ کر ٹھنڈا ہونے تک میلوں جنگل کو مست و شیریں خوشبو سے مہکا دیتا ہے ـــ ہاتھی کے چلنے میں یوں بھی چاپ نہیں ہوتی اور پھر اکڑا ذرا احتیاط کے ساتھ دبے پاؤں پگڈنڈی پگڈنڈی آیا اور یکدم جھونپڑی کے سامنے نمودار ہو گیا۔ کسانوں میں بھاگڑ پڑ گئی، مزید اس نے مانس گند کو نفرت کے ساتھ سُوں کر کے اپنے شامہ سے جھاڑا۔ ہر کسان اپنی جگہ سے اچھل کر جا پڑا اور اکڑا نے اندھلا کر پگھلے ہوئے سیسہ کے درجۂ حرارت والے قوام پر اندھا دھند سونڈ ڈال دی۔ ڈھائی سیر قوام نے سونڈ کی نوک کو پکڑ ہی تو لیا، چاند پھوٹ اٹھی اور جلتے ہی فطری طور پر سونڈ کو منہ میں دبا لیا اور جب وہاں پر زبان اور ہونٹ کو چپکا لگا تو بڑے زور سے غیر اختیاری طور پر جھٹک کر قوام چھڑانے کے لیے سونڈ کو ایک شدید لہرا دیا۔ ایک شامت زدہ کسان جو ذرا کڈھب بیٹھا ہوا تھا فرار ہونے میں کم بخت ذرا پیچھے رہ گیا۔ اس نے چاکوں کے اُدھر والے سرے سے جست لگائی اِدھر سے لہراتی سونڈ کا مہیب گھونسہ توپ کے گولے کی طرح دھم سے چھاتی پر پڑا۔ آواز بھی نہ نکل سکی اور ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اکڑا کو ہوش بھی نہ رہا، سونڈ کی نوک، ہونٹ، زبان، تالو بلکہ جبڑے اور حلق تک سب کا سب بھن کر رہ گیا۔ آنکھیں بند کر کے جدھر کو منہ تھا ادھر ہی کو بھنا کر بھاگ پڑا۔ رقبہ سے باہر ہو کر نہ کچھ کرتے بن پڑی، نہ سمت ہی کی ٹکل رہی آٹھ دس میل پر قدما دوڑنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو اسی پانی کی گہری جھیل پر پایا جس پر پہلی مرتبہ گڑ کھا کر تمام رات کھیلتا رہا تھا۔ آگ کے ردِ عمل میں جبلت اس کو پانی پر لے گئی مگر یہ جلے ہوئے کا علاج نہیں بلکہ مضر ہے لیکن اس نے پہلے تو سونڈ اور پھر جبڑا تک پانی میں ڈال دیا۔ اس سے خیر اور کچھ نہیں تو یہی ہوا کہ وہ قوام جو ابھی تک اپنا کام کر کے زخموں کو اور گہرا اور آبلوں کو بڑا بنا رہا تھا ٹھنڈا ہو کر دھل گیا۔ سونڈ پر گلگلے سے آبلے زبان و تالو پر تھیلی تھیلی اور منہ پہ پیہم برابر زخم حلق اور سوڑے ادھڑے ہوئے، اکڑا کے لیے پیٹ میں کچھ پہنچانا عذاب ہو گیا۔ پہلے تو سونڈ کی نوک

گویا ہاتھ ہی کا کام نہ دیتا تھا، خیر اگر بمشکل آبلے بچا کر کسی ترکیب سے کوئی نرم چارہ پکڑ بھی لیتا تو کھاتا کون، منہ اندر سے بُری طرح گھائل تھا۔ خیر دو دن تو غصّہ، ہیجان اور تکلیف کے مارے بھوک ہی نہ لگی اور اسی تالاب کے اردگرد رمڑتا جھومتا رہا۔ کبھی پانی میں، کبھی کیچڑ میں اور کبھی باہر گھاس پر۔ مکھیوں نے پریشان کیا سونڈ پانی میں دے دی، پانی آبلوں اور زخموں میں لگا تو بوکھلا کر کیچڑ لپیٹ لی۔ مٹی نے کاٹ کیا تو پھر پانی میں دھو کر صاف کر لیا اور اس رستخیز میں سونڈ کے آبلے بھی زخم بن گئے اور اندمال مشکل ہو گیا کیونکہ زخمی سونڈ اور منہ سے تھوڑا بہت نرم کونپلوں کے پیٹ میں پہنچانے کا کام لیا جاتا تھا۔ سب کھائی پی نکل گئی اور ساری بہادری گرد ہو گئی۔ گنے کے رقبوں کا بھی راستہ بھول گیا اور گیہوں، چنے، جو کے چکّوں کا رُخ بھی یاد نہ رہا۔

ہاتھی جبلتاً جتنا حلیم الطبع اور صلح کل ہوتا ہے اتنا ہی کینہ پرور اور منتقم بھی ہوتا ہے۔ پھر یہ تو رقبوں کے بگڑے اور سانڈ نما بدمعاش اکڑا کا تو جلنے کے بعد کہنا ہی کیا تھا۔ آدمی کی بُو اور گڑ کی خوشبو ساتھ ساتھ تھی اور رو میں یہ چرکا لگا۔ یہ چیز دل کے اندر بیٹھ گئی کہ آدمیوں نے گڑ لوٹنے کی پاداش میں مجھے جلایا ہے کیونکہ غول سے نکل کر کاشتہ رقبوں میں جا کر چرنے کا احساسِ جرم ایک چور مجرم کی طرح پہلے ہی سے شعور کے اندر جاگزیں تھا لہٰذا یہ چیز راسخ ہو گئی اور شریر جبلت میں آدمی کی دشمنی بڑی شدت کے ساتھ داخل ہو گئی اور یہاں سے اکڑا کا مقدر پلٹا اور کئی آدمیوں کی قضا آ گئی۔ اس وقت دنیا کے ہر قانون کا فتویٰ اکڑا کے قتل کے حق میں تھا اور اکڑا ہر انسان کا جانی دشمن تھا اور بدلہ لینے میں اپنے پندار میں حق بجانب لیکن یہ تو جانور تھا انسان کے قانون کا پنجہ اتنا شدید ہے کہ اپنے ہم جنس پر اک ذرا بھی رحم نہیں کرتا۔ بڑی جلدی خونی قرار دے کر اکڑا کے استیصال کے احکامات محکمۂ جنگلات والوں نے جاری کر دیئے اور جیسا کہ محکموں کی کارروائیوں میں ہوا کرتا ہے مارنے کے انتظامات بھی ہونے لگے کیونکہ زود یا بدیر اکڑا کو مرنا ہی تھا۔

گرم گڑ والے حادثہ کو تیسرا ہفتہ ختم ہو چکا تھا کئی مرتبہ اکڑا کے زخموں کے انگور پھٹ پھٹ کر مائل بہ اندمال ہو چکے تھے اور دو تین روز سے نرم نرم کونپلیں ذرا حلق سے اُترنے لگی تھیں اور شام سے پھول پھول کر صبح تک آدھا تہائی پیٹ بھر ہی جاتا تھا۔ گنا بس کا روگ نہ رہا تھا اور کوئی نرم فصل کھیتوں میں بھی نہیں، ورنہ کیا باز آتا۔ سرِ شام سے برگد اور پیپل پاکڑ کے جھنڈوں میں گھس جاتا اور نئی نئی کونپل ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور منہ کے اندر آہستہ آہستہ پھول پھول کر آدھا تہائی پیٹ بھر لیتا۔

صبح ہو چکی تھی، رات کی چرائی میں کونپلیں بھی اچھی ہاتھ آ گئی تھیں اور سونڈ اور منہ نے بھی بہتر کام دیا تھا، آج مدتوں بعد وہ ذرا شکم سیر سا ہوا تھا۔ پیپل اور برگد کے جھنڈ سے نکل کر وہ جھاڑی دار میدان کے قریب کھڑے ہوئے ایک ہلدو کے درخت کے نیچے پسرا ہوا گھومنا کر رہا تھا۔ کبھی ایک پہلو نکلتے ہوئے سورج کے سامنے کر دیتا اور کبھی دوسرا، کبھی بالکل چت ہو کر دم سے لے کر سونڈ کی نوک تک لمبا لمبا پورا پیٹ سینہ اور رانیں ہونٹ اور زبان جسم کا تمام زیریں حصہ سورج کی کرنوں کے رُخ پہ کر دیتا کبھی الٹ کر چوترہ سی پیٹھ پورب رُخ پھیر دیتا۔ وہ دیمکیں اِدھر سے اُدھر جسم پر پھدک رہی تھیں اور جوئیں اور کلیاں چُن رہی تھیں اور جلنے کے بعد آج پہلی مرتبہ اس کو فراغت اور تندرستی کا احساس ہوا تھا۔ جسم پل پچھی دوڑانے والی پچھوا ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں میں سونڈ ٹھمکا کر اکڑا چونکا ——— گڑ کی گہری خوشبو اور ساتھ ہی ساتھ ہلکی ہلکی مانس گندھ بھی۔ اوّل الذکر نے ضرور اس کے محسوسات کو بہایا مگر آدمی کی بُو پر تو وہ غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا اور ایک جھرجھری سی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگرچہ تکلیف اور فاقوں نے دُبلا سا کر دیا تھا مگر اس وقت تک کے سطحی بھر دشمن کے لیے تو اب بھی بہت کافی تھا اور پھر غصہ اور ہاتھی کا عقدہ ساز کٹ مرنے کا [illegible]

سوچا تو بھی کم تھا ـــــ مگر ساتھ ہی ساتھ مٹھائی کی گہری خوشبو اس کی آتشِ غیظ و غضب پر بڑا خوشگوار چھینٹا سا مارتی اور وہ مثبت منفی
جذبات میں زیر و زبر، مٹھائی کی خوشبو اور دشمن کی بدبو کے رُخ پر لپکا۔ ایک ڈگ غصہ میں بھرتا، دوسرا قدم اشتیاق میں ڈالتا۔ جب ذرا
کان لگائے تو دشمن کی آواز بھی سنائی دی جو ٹھہر ٹھہر کر بلند ہوتی تھی۔

کیسر سنگھ برہمن نے اپنی بیس من گڑ کی بھری گاڑی پہر بھر رات سے جوڑ دی تھی اور منڈی کو لیے جا رہا تھا۔ اس کا بڑا
بھائی دن نکلے گھوڑی پر سوار ہو پیچھے پیچھے آنے والا تھا اور گھوڑی اور بھینسوں کی رفتار کے مطابق دونوں بھائیوں کا یکدم منڈی
میں پہنچنے کا پروگرام تھا۔ کیسر سنگھ کی گاڑی میں دو بھینسے جُتے ہوئے تھے اور ایک بیل فاضل آگے جُڑا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر راستہ
کے اندر کیچڑ تھی، پہیہ بیٹھ گیا اور کیسر سنگھ کی للکاریوں اور ڈانٹوں کے باوجود تینوں جانور ٹس سے مس نہ کر سکے اور وزن دار گاڑی
پھنس کر رہ گئی اور جب کیسر سنگھ نے ایک مرتبہ سر اٹھایا تو اکڑا کو غصہ میں بھرا اپنے اوپر بڑھتا دیکھا، خون کی خبر تمام علاقہ میں تین ہفتہ سے بھر
گشت کر رہی تھی۔ دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اکڑا کے تمام زخم پھر سے جل اٹھے اور پھر بڑے زور سے جیسے پیٹ
کی بھٹی کے اندر پکتے ہوئے گڑ کی کڑھائی بھڑ بھڑا اٹھی۔ گاڑی میں بھرے ہوئے گڑ کی خوشبو اس کے مقابلہ پر بالکل محو ہو کر رہ گئی۔
کیسر سنگھ بڑا پھرتیلا، لمبا ذہین اور ٹھنڈے مزاج والا نوجوان تھا اور ان پڑھ دیہاتی ہونے کے باوجود موقع شناس اور مستقل مزاج تھا
پہاڑ پیکر ہاتھی کے روپ میں اپنے اوپر موت کو جھپٹتے دیکھ کر گھبرایا تو بہت مگر اوسان برقرار رکھے۔ ایک گہری نگاہ جائے پناہ
کی تلاش میں ماحول کے اندر گھمائی اور ایک جانب رُخ کر کے اور جیسے کوئی منزل ذہن میں لے کر بڑی بندھی ہوئی رفتار میں بھاگ پڑا
اور اکڑا اچھا بیچ ڈھانے والی توپ کی صورت سونڈ سیدھی کیے جرمنی ساخت کے ٹینک کی طرح تعاقب میں چلا۔ شاید پندار میں یہ
لیے ہوئے کہ شکار جائے گا کہاں نکل کے، اگر درخت پر بھی پناہ لے گا تو ایک اشارہ میں نیچے گرا لوں گا اور کیسر سنگھ کو بھی دشمن
کی ٹکر کے مقابلہ پر ان بڑے بڑے درختوں کے پلپلے استقامت کا خوب اندازہ تھا لہٰذا چھوٹے بڑے سال اور ہلدو کے درختوں
میں سے وہ گذرتا چلا جا رہا تھا۔ کتنا ہی تیز دوڑنے والا کیوں نہ ہو مگر آدمی کی رفتار اور ہاتھی کی ڈگ کا کیا مقابلہ، تین سو گز کے اندر
ہی اکڑا نے جا لیا اور جب فاصلہ اور کم ہوتا نظر آیا تو کیسر سنگھ نے دوڑتے ہی دوڑتے ایک بل سا کھا کر لومڑی کی سی ایک
دھچی جو دی تو اکڑا میں اور اس میں بیس گز کا بُعد تو فوراً ہی پڑ گیا اور اگرچہ ہاتھی مڑتے ہوئے بنگو کی طرح ناچ جاتا ہے پھر بھی کتنا ہی تیز
کیوں نہ ہو بھاری جسم کو سنبھال کر جب پھر تعاقب میں سیدھا ہوا تو یہ فاصلہ تقریباً سو گز ہو گیا تھا مگر فرلانگ ہی بھر کے اندر یہ فاصلہ بھی
اکڑا کی ڈگوں نے ہڑپ کر لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد کیسر سنگھ کو اپنی پشت پر شوں شوں سنائی دی لیکن پھر بھی اس نے اوسان نہ کھوئے
اور جب غصہ میں سونڈ سے نکلتی ہوئی کف کی چھینٹیں کانوں پر پڑیں اور جیسے گرم گرم سانس کنوتیوں پر لگی اور منزلِ مقصود پچاس گز
رہ گئی تو کیسر سنگھ نے بھاگتے ہی بھاگتے اپنی پگڑی پر ہاتھ مارا۔ اِدھر پگڑی سر پر سے اچھل کر گری اور اُدھر جیسے پوری رفتار سے
دوڑتے ہوئے ٹینک میں یکدم بریک لگا اور اکڑا پگڑی کے ساتھ غٹ پٹ ہو گیا۔ . . . . . . اور شاید ہزاروں سال پہلے کسی زبردست
طوفان یا مہیب زلزلہ کے بہانے کیسر سنگھ کی جان بچانے کے لیے سامنے کی پہاڑیوں میں سے ٹوٹ کر یہ کڈھب سنگی سخت
چٹانیں اس ہرے بھرے جنگل کے درمیان آپڑی تھیں اور جب سے آج تک کیسر سنگھ کو پناہ دینے کے لیے اپنی سنگین آغوش
کھولے منتظر تھیں جن کو گاڑی پر سے بھانپ کر کیسر سنگھ دوڑا تھا۔ اطمینان کے ساتھ دشمن کو پگڑی پر بھڑا کر کیسر سنگھ نے چٹانوں کو

جا لیا، مستعدی کے ساتھ کچھ جھاڑیوں کا سہارا لیا، کچھ نیچے پڑے ہوئے ذرا بڑے بڑے پتھروں پر مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمائے اور کچھ ہاتھ بڑھا کر چٹانوں کی نکلی ہوئی نوکیں پکڑیں اور ایک بندر نما جست جو لگائی تو کیسر سنگھ عزرائیل کی زد سے باہر تھا اور دو تین ہاتھ اوپر کی بلندی پر چٹانوں کی نکلی ہوئی چوٹیوں کے درمیان اک ذرا سے نشیب میں دبک گیا جہاں سے نہ دکھائی ہی پڑ سکتا تھا اور نہ سنگھائی ہی دے سکتا تھا کیونکہ بلندی پر بھی تھا اور دبکا ہوا بھی تھا۔

پگڑی کی دھجیاں اڑا دینے اور آدمی کی بو کو اچھی طرح تہس نہس کرنے کے بعد اکڑا کا دل بھلا نہ ہوا اور جب وہ پگڑی والے کو کچلنے کے لیے بڑھا تو چکر ہی پڑ گیا۔ اس چٹان پر اس نے اپنی آنکھ سے آدمی کو چڑھتے دیکھا تھا مگر اب نہ آدمی ہی نظر آتا تھا نہ بو ہی سونگھنے میں آتی تھی۔ غیظ میں چٹان کی جانب جھپٹا اور طواف کرنے لگا، اوپر پہنچنے کا کہیں ڈھب نہ تھا، جب کچھ نہ ملا تو پھر ہوا میں سونڈ گھمائی، آدمی کی بو تو نہیں مگر گاڑی پر سے مٹھائی کی بھینی بھینی خالص خوشبو آ رہی تھی، بالکل راہِ راست پر آ گیا اور گاڑی کی جانب لپکا۔

بیل نے جو اس طرح مست ہاتھی کو اوپر بڑھتے دیکھا تو بھڑک کر ایک جست لگائی، جن رسیوں سے دونوں بھینسوں کے آگے جڑا ہوا تھا وہ ٹوٹ گئیں اور یہ بھاگ کھڑا ہوا مگر جیسے غریبوں کی گردنوں پر تو بھاری جوا رکھا ہوا تھا اور مضبوط جوت لگے ہوئے تھے، بیچارے ہر چند اینٹھ اینٹھ کر زور لگاتے رہے کہ آزاد ہو کر اپنے بھائی بیل کی طرح ہم بھی فرار ہو جائیں مگر تنگ نہ ہوئی اور جہاں کے تہاں پھنسے رہے۔ اکڑا نے پہلے مٹھائی کا جائزہ لیا اور جب ٹٹولتی ہوئی سونڈ گاڑی کے اگلے حصہ پر پہنچی تو ایک بھینسے کا خوف جیسے کچھ غصہ میں تبدیل ہو گیا آنکھیں سُرخ ہو گئیں، سر نیچے کو جھکا اور جیسے گردن اینڈا کر کچھ مدافعانہ سا انداز بنایا اور ایک شوں نتھنے پھلا کر نکالی اور یہ انداز اور دشمن بھلا اکڑا برداشت کر سکتا تھا، دانت کی نوک پیٹ پر جما کر اک ذرا حرکت سی دی تو ساری اوجھڑی اور کل انتڑیاں زمین پر لوٹتی دکھائی دیں۔ بھینسا گرا، گاڑی آگے کو جھک گئی اور وزن پڑنے سے دوسرے بھینسے کا جوت ٹوٹ گیا اور گردن جوئے سے آزاد ہو گئی اور گاڑی سے علیحدہ ہوتے ہی جیسے اس کے عرب گھوڑے والے پاؤں لگ گئے اور گھر کا رُخ کر کے سیدھا بھاگا چلا گیا۔ راستہ پر یوں بھی دھوپ اور گرمی تھی پھر یہ آلائش اور خون پھیلا ہوا تھا اور بھینسے کی سسکتی ہوئی لاش پڑی ہوئی تھی اور ہاتھی کو ان چیزوں سے کراہت آتی ہے اور جنگلی ہاتھی بہت اطمینان کے ساتھ کھانے کا عادی ہوتا ہے حالانکہ اکڑا اس اعتبار سے مستثنیات میں سے تھا لیکن ابھی ذرا دیر پیشتر کی بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ نے اسے بھی مکدر کر دیا تھا۔ ہر لحاظ سے یہ ماحول کھانے کے لیے ناسازگار بھی تھا لہٰذا اکڑا نے سونڈ میں گاڑی کا اگلا حصہ جس میں جوا بندھا ہوتا ہے پکڑ کر ایک ہلکی سی حرکت دی، اس اثناء میں دونوں پہیے دلدل سے باہر نکل آئے اور پھر راستہ سے گاڑی کھینچ کر ایک جانب کو لے گیا اور ہوا کے رُخ کو بچا کر جہاں خون کی بو نہ پہنچے بلدو کے ایک چھتری دار درخت کے سایہ میں تنے سے لگا کر ٹیک دی اور لگا بھیلیوں پر بھیلیاں غٹا غٹ اتارنے، مگر یہ تو گڑ تھا، ٹھوس گڑ، نہ تو برگد پیپل کی شاخیں تھیں، نہ جوہڑ کی لڑسی کنول کسیرو اور ناری کی جڑیں اور ربوند نے ہی اور نہ ہرے بھرے ٹھنڈے ٹھنڈے میٹھے میٹھے گنے ہی تھے کہ پیٹ بھرے پر جی نہ بھرے، منوں کھاتے چلے جاؤ اور ایک ڈکار میں سب ہیچ ——— سو روپیہ بھر کے سیر والی ڈھائی ڈھائی سیر کی پندرہ سولہ بھیلیاں کھانے کے بعد اکڑا بول گیا۔ خیر تیر مٹیں کے لڈو کھانے والے تھوکے

چولوں کی طرح دو اور نکلیں اور اٹھا ردیں بھیلی پر تو منہ پھر گیا، ہوس میں جو ایک اور اٹھائی وہ سونڈ سے ہونٹ تک تو پہنچی مگر زبان اور تالو نے قبول نہ کی حلق رندھ گیا، نیچے گر پڑی۔ ننھے ولی کے ساتھ گاڑی کے اوپر سونڈ پھرا کر دیکھا تو خزانہ کی کوری بھی نہ کھسی تھی انگاٹھی جوں کی توں لبالب تھی۔ ادھر صبح ہی صبح جو یہ دعوتِ شیراز اڑنے دیکھی تو فضا میں سے چند کوے بھی اتر کر شریک ہو گئے اور ادھر ادھر کے درختوں پر سے چند سنجیدہ و فلاسفر صورت بندروں کو اترنا پڑا اور اپنے اپنے حصہ کی ایک ایک بھیلی سنبھال کر اپنی جگہ پر واپس چلے گئے اور اطمینان کے ساتھ اوپر پہنچ کر کھانے لگے۔ غرض حلوائی کی دکان، نانا جی کی فاتحہ کا پورا سماں بندھ گیا اور چٹانوں پر سے پنڈت کیسر سنگھ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم، سب کچھ دیکھتے رہے۔

کیسر سنگھ کا بڑا بھائی گھر سے روانہ ہونے ہی والا تھا اور گھوڑی کسی کھڑی تھی کہ پہلے تو بیل ٹوٹی ہوئی رسیاں گھسیٹتا ہوا گھر پہنچا تو اس نے بیل کو گالیاں دیں کہ نمک حرام راستہ سے رسی تڑا کر بھاگ آیا لیکن جب ذرا دیر بعد بھینسا پہنچا اور خون میں لت پت پھر کہیں پر زخم نہیں تو سب لوگ بہت گھبرا گئے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا اور معاً یہ اندیشہ گزرا کہ کیسر سنگھ کو یا تو شیر نے مار دیا یا ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔ ہاتھی کی جانب خیال نہ گیا لیکن جب پلٹتے ہوئے بیل اور بھینسے کی رفتار اور وقت کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ جو کچھ بھی گزری ہے دن نکلے گزری ہے اور ڈکیتی رہزنی کا وقت نہیں تھا لہٰذا یہ وسوسہ راسخ تر ہو گیا کہ شیر نے مار دیا اور بھینسے پر جو خون لگا ہوا ہے وہ کیسر سنگھ ہی کا ہے لہٰذا بستی سے ایک مدد کی آواز پہ سب کے سب مرد نکل پڑے اور دو ڈھائی سو جوان جمع ہو گئے اور ڈھول، نگارے، تاشے، کنستر اور برچھے کلہاڑے ہاتھوں میں لیے راستہ راستہ گاڑی کے پہیوں کے نشان پر چل پڑے بیل اور بھینسے کے پہنچنے سے انھوں نے وقوعہ کے وقت کا بھی اندازہ لگایا تھا اور جائے وقوعہ کا بھی۔ یوں تو اس غولِ بیابانی نے اپنی بستی سے نکلتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا مگر جب جائے وقوعہ قریب آئی تو تمام جنگل سر پر اٹھا لیا۔ دیکھنے تک نوبت ہی نہ پہنچی، آدمیوں کے اتنے بڑے جمِ غفیر کی بو اور یہ شور، ابھی جلوس دو میل کے فاصلہ پر ہی تھا کہ اکڑا بھاگ گیا۔ جائے وقوع پر پہنچ کر انھوں نے ہر چیز سمجھ لی اور ان چٹانوں کی جانب کھوجوں پر بڑھ ہی رہے تھے کہ دور سے کیسر سنگھ نے دیکھ کر سمجھ لیا کہ کمک آ گئی اور خطرہ نہیں ہے چھلانگ لگا کر چٹان سے اترا اور ان ہی آکر مل گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک بھینسے اور تھوڑے گڑ پر ہی بیتی۔ تھانہ اور محکمہ جنگلات میں رپورٹ ہوئی، اکڑا کا دوسرا فائل چلا، رینجر نے موقع پر آکر واردات کا نقشہ تیار کیا، کھوجوں کے فوٹو لیے اور چونکہ جس منڈی کو گڑ لے کر کیسر سنگھ جا رہا تھا وہ ریاست رام پور میں تھی لہٰذا ریاست کے محکمہ جنگلات اور پولیس کو بھی رپورٹ بھیج دی۔

ہم لوگ خانصاحب کے کیمپ سے روزانہ فورڈ پر اور جہاں فورڈ نہ پہنچ سکتی تھی وہاں بیل تانگوں یا گھوڑوں پر سوار ہو کر افواہوں میں سے اصلیت کو چھانٹتے۔ کیسر سنگھ والے وقوعہ کی خاص جگہ پر پہنچے، ہاتھی کے کھوج نم زمین پر مہینوں نہیں مٹا کرتے کہیں کہیں کھوج بھی دیکھے، گاڑی والی جگہ دیکھی، خود کیسر سنگھ کو کیمپ پر طلب کر کے اس کے ساتھ جا کر تمام حال موقع پر پہنچ کر سمجھا۔

اکڑا نے تیسرا خون پھر گڑ کی لاگ پر ایک کسان کا کیا تھا جس کے کھیت جنگل کے کنارے تھے۔ دو بھائی صبح سے دوپہر تک کام کرتے رہے، دوپہر کے وقت کام بڑھا کر پیپل کی چھاؤں میں جو جنگل کے کنارے پر تھے اور جس کے تلے ایک کنواں تھا کھانے کے لیے پہنچے۔ گڑ، چنے اور ستو ایک چادر میں بندھے تھے سو ایک بھائی نے جگت پر چڑھ کر پانی نکالنے

ڈولچی ڈالی، دوسرے نے چادر پھیلا کر گڑ، چنے اور ستو کھولے کہ یکدم اکڑا سر پر تھا۔ جو بھائی پانی نکال رہا تھا وہ تو ویسے ہی جگت کے اوپر جھکے ہی جھکے کنوئیں میں جست لگا گیا اور بس کنوئیں کے اندر پہنچ کر ایک چیخ اپنے بدنصیب بھائی کی سن سکا اور اس کے بعد اس کو پٹخنے کی آوازیں اور ہاتھی کی مخصوص خونی گرج کنوئیں کے اندر گونجتی رہی اور پھر سناٹا ہو گیا۔ اس شامت زدہ کے منہ سے بمشکل گھٹے گھٹے کی آواز نکل پائی تھی کہ اکڑا نے گردن پکڑ کر بڑے زور سے پیپل کے تنے پر دے مارا، اور پھر مارا، اور پھر اور پھر، اور تین چار ٹکنیوں کے بعد بھی سونڈ اور ہونٹ جلانے کا انتقام پورا نہ ہوا تو سونڈ میں سے زمین پر پٹخا اور اگلا پاؤں بڑھا کر آہستہ آہستہ کچلتا رہا، یہاں تک کہ حلوا بنا کر چھوڑ دیا۔ پلٹ کر چادر پر سے دونوں کے حصّہ کا گڑ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا، چادر اٹھا کر ہوا میں لہرائی، چنے اور ستو بکھیر کر اور منہ میٹھا کر کے چل دیا۔ جنگل سے ملحقہ کاشتہ رقبوں کا سلسلہ منقطع سا ہوا کرتا ہے بس اس چھوٹے رقبہ پر یہی دو آدمی تھے، جب تیسرے پہر کو گھر نہ پہنچے تو متوفی کی عورت خبر لینے آئی۔ کنوئیں کے قریب پہنچی تو شوہر کی لاش کا حلوا دیکھا اور رو اویلا مچایا تو اندر کنوئیں میں سے دیور نے آواز دی، مار پیچھے پکار ہوئی، گاؤں کے چوکیدار پٹواری نے تھانہ اور محکمہ جنگلات میں رپورٹیں دیں۔

اکڑا کے چوتھے چھاپہ کے حالات بڑے ہولناک ہیں اور ہم نے بہت چھان بین کی اس المیہ کے ساتھ کہیں پر گڑ یا مٹھائی کی موجودگی کا بھی کوئی سراغ نہیں۔ پہاڑ سنگھ جاٹ موضع ——— ضلع نینی تال کا ایک چھوٹا سا زمیندار تھا اور بڑا خوشحال اور محنتی کاشتکار تھا۔ اپنی زمینداری کے تقریباً کل رقبہ پر اپنے ہاتھ سے کاشت کرتا تھا۔ دو گاڑیوں میں بیس بیس من چاول بھر کے ریاست کے حدود میں اچھا نرخ ہونے کے سبب فروخت کرنے کے لیے لا رہا تھا اور چونکہ کسٹم وغیرہ کا چکر تھا لہٰذا ایسے وقت چلا کہ جھٹپٹے کے وقت ریاست کی حدود میں داخل ہوا اور رات کو موضع ——— میں جو ریاست کا سرحدی گاؤں ہے قیام کر کے وہیں سے بیوپاریوں کو دے دے یا دوسرے دن صبح کو آگے کسی گاؤں میں بڑھ جائے۔ ریاست کی سرحد ابھی گھنٹہ بھر کے راستہ پر تھی کہ سورج غروب ہو گیا۔ ویسے تو یہ راستہ جس پر یہ چل رہے تھے میدان ہی میدان گیا تھا مگر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے قطعے چھدرے جنگل کے بھی آ جاتے تھے۔ دونوں گاڑیاں دن میں تو آگے پیچھے چلتی رہیں اور پچھلی گاڑی پر پہاڑ سنگھ رضائی میں لپٹا، اپنی اٹھارویں صدی والی قرابین نسل کی بھرتو بندوق پکڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سوبھا نامی ایک نوجوان چوکیدار جو قوم کا بھنگی تھا برچھا لیے گاڑیوں کے دائیں بائیں چل رہا تھا، دو چار گاڑیاں ہانک رہے تھے۔ چونکہ پہاڑ سنگھ مستقل طور پر ریاست اور انگریزی علاقہ کے درمیان بغیر محصول و اجازت کے جنس کی الٹ پلٹ کرنے کا کاروبار کیا کرتا تھا لہٰذا اندھیرے اجالے گاڑیاں بھر کر چلا کرتا تھا اور یہ راستہ تو اس کو منجھا ہوا تھا ——— گاڑیاں ایک چھوٹے سے جنگل کے ٹکڑے میں داخل ہوئیں۔ درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے یہاں پر ایک ہی راستہ کے کئی کئی راستے بن گئے تھے اور آگے پیچھے چلتی ہوئی دونوں گاڑیاں جنگل کے اندر داخل ہونے کے بعد اتفاق سے دو متوازی راستوں پر چلنے لگیں جن کے درمیان کا فاصلہ کہیں پر دس بارہ اور کہیں پر پندرہ بیس گز تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا، کچھ درختوں کا سایہ بھی تھا، نسبتاً یہ ٹکڑا زیادہ گھنا تھا، دونوں گاڑیوں کے درمیانی فاصلہ میں جگہ جگہ اونچی جھاڑیاں حائل ہو جاتی تھیں اور ایک جگہ ایسی ہی جھاڑیوں میں اکڑا آتنا ساکت کھڑا تھا کہ انھوں نے جب دیکھا جب اس نے وہ مہیب شور نکالا جو حملے کے وقت کی مخصوص خونی آواز ہوتی ہے۔

دونوں گاڑی بان تو جست لگا کر فرار ہو گئے اور سوبھا چوکیدار کے منہ سے شاید "بہ تقاضائے چوکیداری" ایک ڈانٹ
نکلی اور ہاتھ میں برچھا سیدھا ہو گیا۔ اکڑا کا رُخ تو ادھر ہی تھا اک ذرا ہمک کر سوبھا کو سونڈ میں پکڑ کر اٹھا لیا۔ پہاڑ سنگھ جاٹ یہ
دیکھ کر کہ ان کا جان نثار و بہادر چوکیدار ہوا میں معلق ہے ٹھنڈے بیوپاری ہونے کے باوجود اپنی اصل پر پلٹ پڑے۔ آؤ دیکھا نہ
تاؤ اکڑا کے سنگِ سیاہ کی چٹان سے چوتڑوں پر دھڑ سے بندوق دے بجائی جس میں چار یا پانچ ڈرام دیسی بارود، آدھی چھٹانک اپنی
انہ دلنے کی چکی میں ڈال کر چکنایا ہوا خانہ ساز گراپ، تین گٹھیا کوڑیاں اور ایک محمد شاہی کچا پیسہ بھرا تھا۔ دھماکے کے ساتھ بھڑک کر
اکڑا نے چوکیدار کو وہیں اوپر ہی اوپر اچھال کر جو پھینکا تو پچاس گز دور جا گرا اور چوٹ سے بلبلا کر جو پلٹا تو پہاڑ سنگھ کو جو بندوق داغے
گاڑی پر شاید یہ دیکھنے کو کھڑے ہو گئے تھے کہ ہاتھی مرا یا نہیں مرا، کمر سے گرفت میں لے لیا اور ان کی لپ نے تین من کی سوا چھ فٹ
لمبی لاش کو زمین پر پٹخ کر ایک پنڈلی اگلے پاؤں سے دبالی اور دوسری پنڈلی سونڈ میں پکڑ کر اک ذرا اشارہ جو دیا تو چودھری پہاڑ سنگھ
ایک کے دو ہو گئے اور بیچ میں سے یوں آدھے آدھے ہو گئے جیسے آرے سے کوردن کا لٹھا ——— اور یہ سب کام جیسے بگولے کی
رفتار سے پلک مارنے میں شروع ہو کر ختم ہو گیا۔

——مکینٹھ باشی پہاڑ سنگھ جاٹ نے بجائے اپنے گاڑی بانوں کے ساتھ ایک جست لگانے کے بندوق چھوڑ دی۔
بہادری کے تقاضے کے مطابق یا چوکیدار کی جان بچانے کی خاطر یا شاید قصاص لینے کے لیے، یہ دل کا معاملہ تھا کہ سوچیں گے
پیچھے پہلے کر گزریں، مگر اس میں شک نہیں کہ جو ہوا سو ہوا، چار ڈرام بارود، دو اونس سیسہ، تین گٹھیا کوڑیوں اور ایک تولہ کچے تانبے
کے مرکب سے دونوں چوتڑوں کے اوپر اُردو اتنی اچھی لکھ دی کہ سنگِ مزار کا کتبہ بن کر رہ گئے۔

اتنے بڑے دھماکے کے بعد اکڑا ہی جیسے خونی اور بے جگر ہاتھی کا کام تھا کہ اس نے پلٹ کر پہاڑ سنگھ پر حملہ
کر دیا، مگر جوں ہی چیر پھاڑ کر علیحدہ ہوا تو جیسے اس مہیب دھماکے کی صدائے بازگشت سینہ کے اندر گونج اٹھی اور وہ جنگل کو فرار ہو گیا۔
سرگباش چودھری پہاڑ سنگھ کی بندوق کا تمام بھرت پندرہ گز کے فاصلے سے پڑنے کے باوجود بھی اکڑا کے چوتڑوں
کی کھال ہی میں دھرا رہ گیا تھا۔ رات میں تو اسے اچھی طرح چوٹ کا احساس بھی نہ ہوا مگر صبح کو جب مکھیوں نے احساس دلایا تو کچھ
کانٹے سے بھی چبھتے محسوس ہوئے اور مکھیوں کی دوا کیچڑ تھی اور وہ سونڈ چلنے والی معذوری تو تھی نہیں، دو چار روز کچھ سوزش رہی
اور پھر پتہ بھی نہ چلا کہ پہاڑ سنگھ کی بندوق کا سب سامان کب کھال اور پٹھوں کے درمیان ہضم ہو گیا لیکن بندوق کی چوٹ کا ردِ عمل
ہو یا دھماکے کا کہ اس واقعہ کے بعد وہ بہت زیادہ خوفناک اور آدم کش ہو گیا۔ میلوں دور سے آدمی کی بو پہ پہنچنا شروع کر دیا اور
آدمیوں کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر دیا اور ہلکی سی بو پر غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا چنانچہ پہاڑ سنگھ اور سوبھا کے
خون کے بعد محکمہ جنگلات کے ریکارڈ میں چھ وقوعے اور درج تھے بعض باتیں افواہوں میں اتنی سنسنی خیز تھیں کہ اگرچہ ان کے ساتھ
کسی خون کی رپورٹ نہ تھی لیکن اکڑا کی شہرت اور خونی جبلت پر روشنی پڑتی تھی اور ایسے واقعات کا فائل محکمہ جنگلات میں مرتب
ہونا لازمی تھا۔

دوسرے روز ہم فارسٹ رینجر کے ساتھ ایک اور موقع دیکھنے جا رہے تھے جس میں اکڑا نے ایک عورت اور
اس کا ڈیڑھ سال کا بچہ مارا تھا۔ اگرچہ ہم اس حادثہ کی جائے وقوع پر نہ پہنچ سکے کہ کیمپ سے رینجر اور اس کے ساتھ آتے ہوئے

دو ایک اور آدمیوں نے بتایا کہ ویسے تو جنگل میں آزادانہ آمد و رفت بند ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑے اہتمام کے ساتھ آنا جانا پڑتا ہے مگر پھر بھی آدمی گھروں میں تو بند نہ تھے، ایک عورت جس کا نام پاربتی تھا بیوہ تھی اور اپنے ڈیڑھ سال کے بچہ کو جو بیمار تھا اپنے گاؤں ——— سے چل کر دوسرے گاؤں میں ایک دیہاتی معالج کو دکھانے لے گئی، واپسی میں اکڑا نے اس پر حملہ کر دیا۔ ہاتھی کو اپنے اوپر بڑھتے دیکھ کر عورت نے بچہ پیٹ کے نیچے دبا لیا اور اس کے اوپر گٹھڑی بن کر اوندھے منہ پڑ گئی۔ کچھوے کی طرح گول گول گٹھڑی سی پڑی ہوئی عورت کو یوں ہی گٹھڑی بنی بنائی ہاتھی نے اپنی سونڈ میں بھر لیا۔ جب عورت نے گرفت کا احساس کیا تو بچہ کو اور بھی مضبوطی کے ساتھ چمٹا لیا اور جب ہاتھی اس گٹھڑی کو پٹخنے کے لیے اوپر اٹھا رہا تھا تو اس ماتا کی ماری نے مرتے مرتے اپنا بچہ قریب ہی پڑے ہوئے گھاس کے ایک بڑے ڈھیر پر پھینک دیا، لیکن اکڑا کو رحم نہ آیا، عورت کو پٹخنے اور کچلنے کے بعد آگے بڑھ کر گھاس کے اوپر سے بچہ اتار لیا اور اس کو بھی پٹخ کر مار ڈالا۔ ہم لوگ اس حادثہ کی جگہ پہنچ کر ذرا معائنہ کرنا چاہتے تھے اور چلنے کے لیے بالکل تیار تھے کہ ریاست سے ایک سوار پرچی لے کر آیا جو فیل خانہ کے نائب مہتمم کی تھی۔ اسے پڑھ کر ہم سب اچھل پڑے اور خانصاحب ناچنے لگے۔ خاص طور پر جب سوار نے تصدیق کی کہ وہ یہ چشم خود دیکھ آیا ہے۔ تحریر تھا۔

عالی جاہا! تسلیم! مدعا بکار سرکار یہ ہے کہ اطلاعاً تحریر کرتا ہوں کہ رات
تین اور چار بجے شب کے درمیان نزاکت نے فیل خانہ کا شمالی پھاٹک
کھٹکھٹایا، دربان کے کھولنے پر اندر داخل ہو گئی۔ بحمد اللہ صحیح و سالم ہے
اگرچہ کئی روز کی بھوکی پیاسی، تھکی ماندی ہے۔ چنگی کے ناکے دار کا بیان ہے
کہ اس نے رات ڈھلتے ایک ہاتھی کو نزاکت کے ساتھ دیکھا۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ جو نہایت شدت کے ساتھ اس کو شہر کے اندر بڑھنے سے
روک رہا تھا۔ میں نے ناکے دار کے بیان کی تصدیق کے لیے ملی الصبح جا کر
دیکھا تو نزاکت کے کھوجوں کے ساتھ ایک بہت بڑے ہاتھی کے کھوج
کے نشانات بھی موجود تھے جو الٹے پاؤں جنگل کو واپس گیا ہے۔ غلام نے
کھوجوں پر پہرہ لگا دیا ہے اور پولیس کے ذریعہ ادھر آمد و رفت بند کرا دی
ہے تاکہ آنجناب خود آ کر ہر چیز کا معائنہ فرمالیں۔ حامل ہذا نے بھی یہ کھوج دیکھے
ہیں اور ناکے دار کے بیان کے وقت بھی موجود رہا ہے۔ فقط!

پروگرام کی پہلی اور دوسری شقیں تو بڑی حد تک پوری ہو چکی تھیں۔ اس خونی ہاتھی کی مخصوص جبلت کا ہم کو کافی اندازہ ہو چکا تھا اور اس کے اکثر و بیشتر حادثات کی جائے وقوع دیکھ کر اور چشم دید شہادتوں کی بنا پر ہم اپنی تحقیقات مکمل بھی کر چکے تھے جو حادثات باقی رہ گئے تھے ان کی تحقیقات کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ بس ہم کو اب اپنے جاسوسوں کی واپسی کا انتظار تھا جو ہم کو فی الحال اکڑا کی بازی گاہ اور جہاں پر وہ عیش کوشیوں میں معروف ہے اس نواح کا علم ہوتا ساتھ ہی ساتھ اس کے مزاج

کھوج ملیں اور ہم تعاقب کریں، لیجئے وہ یوں آپوں آپ حل ہو گیا۔ موٹی سی بات تھی شہر پناہ کے نیچے سے کھوج اٹھا کر چل دیں۔ نزاکت گھر پہنچ ہی گئی یہ مسئلہ یوں بھی حل ہو گیا ورنہ خیال یہ تھا کہ اکڑا کو شکار کرنے کے بعد نزاکت کو سانٹھ ماروں کے ذریعے قابو میں لایا جائے گا مگر واہ ری شائستہ جبلّت وہ آپوں آپ پہنچ گئی اور خانصاحب تو اس بچہ کی طرح جس کا کھویا ہوا کھلونا مل جائے شادمانی سے بار بار کلکاریاں سی مارنے لگے۔ رُخ پلٹ گیا۔ خانصاحب نے کیمپ کچھ نئی ہدایات کے انتظار میں رہنے کا حکم دے کر وہیں چھوڑا اور ہم سب کے سب یکدم اسپورٹنگ فورڈ پر لد کر شہر روانہ ہو گئے، سر دست یہ اسکیم دماغوں میں لیے ہوئے کہ وہیں سے اکڑا کے پلٹے ہوئے کھوجوں پر تعاقب کریں گے۔

(۳)

توڑنے کو تو توڑ کر فرار ہو گئیں سوا انچی موٹی کڑیوں والی زنجیر—لیکن دراصل جس زنجیر سے وہ بندھی تھیں وہ ایسی نہ تھی جس کو آج تک کوئی ذی روح توڑ کر چلا گیا ہو—— اور پھر نزاکت تو کھیدے کی پکڑی ہوئی ہتھنی بھی نہ تھی اور اس کی زندگی میں کہیں پر وحشی اور جنگلی پس منظر کا نام و نشان نہ تھا اور کھیدے کے پکڑے ہوئے بڈھے بڈھے ہاتھی بھی کبھی جنگلی زندگی کو پلٹتے نہیں سے گئے۔ پھر یہاں تو معاملہ ہی اور ہوا۔۔ وہ بے بھاؤ کی پڑی کہ چھٹی کا دودھ بھی یاد آ گیا اور حافظ شیرازی کا قول بھی کہ ع

عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

اکڑا کم بخت تو ٹھیک سے نرا جنگلی بھی نہ تھا بلکہ جنگلی کھدیا تھا جس کے دام میں پھنس کر آپ کھنچی چلی گئیں مگر پہلا وصل ہونے کے باوجود دس دن بھی دادِ عیش نہ دینے پائیں جو ہاتھی کے ہنی مون کی کم سے کم مدت ہے، اور پھر پائیں۔ ہنی مون کے ابتدائی دنوں میں ہی آنتیں قرأت کے ساتھ قل ہو اللہ پڑھنے لگیں کیونکہ کھانا تو درکنار بجز شربتِ وصل کے اور کوئی چیز ٹھیک سے پینے کو بھی نہ ملی تھی، اور بھوک تو عشق میں بھی لگتی ہے۔ جوں جوں اُبال اترتا گیا، جھاگ بندھا تے گئے، خون میں ٹھنڈک پڑتی گئی، پیٹ کی آگ بھڑکتی گئی اور وائے بدنصیبی اکڑا کو ان دنوں کہیں گڑ بھی ہاتھ نہ آیا۔ ویسے یہ بات نہیں کہ بیچارے نے خاطر تواضع میں کمی کی ہو۔ وہ اس کو گیہوں کے کھیتوں اور گنے کے جھکوں میں لے گیا لیکن گیہوں نزاکت کے حلق سے اترتا بھی تھا تو بڑے بڑے موٹے روٹ کی شکل میں۔ خوب اچھی طرح پسے ہوئے آٹے کے روٹ۔ انگاروں پر اچھی طرح سنکے ہوئے، نمکین نمکین سلونے سوندھے گھی چپڑے روٹ، ایسے خوشبودار مزے دار کہ ایک ٹکڑا فیل بان اور دایک ٹکڑا چرکٹا کھائے بغیر نہ رہ سکتے۔ قہرِ درویش برجانِ درویش، بیچاری نے اکڑا کی طرح سونڈ میں بھر کر ایک گٹھا اکھیڑا اور جس طرح اکڑا جھٹکے دے دے کر اور جھاڑ جھاڑ کر کھا رہا تھا اس نے بھی جھاڑ کر منہ میں رکھ لیا۔ توبہ! کرکرا، خیر نگلنے کو تو نگل گئیں، منہ کے اندر پہنچا لقمہ مگر دوسرا نہ اٹھا سکیں، ہونٹ سے لے کر حلق تک مٹی ہی مٹی ہو گئی اور اکڑا بیگموں کا سفرا دکھاتا چلا گیا اور نزاکت تعجب کے ساتھ اس کی بلا نوشی کا تماشا دیکھتی رہی۔ جب پیٹ بھر کر نزاکت کی جانب متوجہ ہوا اور تواضع کا انداز بتایا گویا پوچھا "اجی آپ تکلف فرما رہی ہیں" تو نزاکت نے ایسی ڈانٹ بتائی کہ ڈر کے مارے کانپ گیا اور ساری بہادری اور پہلوانی بھول گیا اور جنگلی ہاتھیوں کو مار مار کر اور ڈانٹ ڈانٹ کر مرعوب کر لینے والے بہادر اکڑا کو نزاکت کے ساتھ پہلے ہی روز پتہ چل گیا تھا کہ ڈر، خوف، رعب اور نیازمندی کیا چیز ہوا کرتی ہے اور جوں جوں وقت گزر رہا یہ احساس

راسخ نہ ہوتا گیا اور اب تو یہ عالم تھا کہ اس کی ٹیڑھی نگاہ دیکھ کر اعصاب کا توازن کھو بیٹھتا اور ذرا سی شہ پر تو بول و براز خارج ہو جاتا اور شاید اسی لیے یہ چند دن نبھ بھی گئی اور اب تو شاید اس کو بڑی شرمندگی اس چیز کی تھی کہ ایسے رومانٹک دور میں ٹھنگ کی دعوت تو درکنار اپنی نئی نویلی دلہن کا ایک مرتبہ پیٹ بھی نہ بھر سکا۔ وہ اس کو بڑی امید لگا کر گنے کے رقبہ پر لے گیا، بلاشبہ گنا اس کے فیل خانہ کا مخصوص چارہ تھا مگر ایسی بھدی شکل میں گنا کاہے کو کبھی سامنے آیا ہوگا، اکڑا نے شاید یہ احساس کر کے اپنی صلاحیت کے مطابق جڑیں اور اگولا وغیرہ توڑ کر اور بعض بعض موٹا گنا چیر کر پیش کیا، ایک دو لقمے کھاتے مگر اچھی غذا نے سے اچھی ہوا کرتی ہے اگر ایسے ہی ہاتھی کھیتوں میں کھڑے گنوں اور جوار سے پیٹ بھر لیا کرتے تو مالکوں کو چڑکٹے رکھنے کی کیا ضرورت تھی جو چارہ کی رگ رگ اور ہاتھی کے مزاج کو پہچانتے ہیں اور جن کا کام ہی چارہ کاٹنا اور صاف کر کے بنانا ہوتا ہے اور جب اکڑا نے پھر خوشامد کے ساتھ تواضع کے انداز میں ایک بڑا موٹا گنا حتی الوسع بڑی اچھی طرح صاف کر کے اور چیر کے پیش کیا تو نزاکت نے ایسی سنگین ڈانٹ دی کہ وہ غریب اچھل کر جا پڑا، نزاکت کا پچھلے ہی دو لقموں نے منہ چھیل دیا تھا۔

دھوپ کے وقت اکڑا نے بڑی خوشامد کر کے اس کو ایک ایسی جگہ لے چلنے کی کوشش کی جہاں پہ غسل اور لنچ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ تھیں۔ پہلے تو جس راستہ سے لے کر گیا اس پر نزاکت کو بڑی تکلیف ہوئی۔ جگہ جگہ کانٹے تھے اور تلوے کا ہاتھی بہت کچا ہوتا ہے اور پھر نزاکت جس نے ڈیمر اور سیمنٹ کی سڑکوں پر جھنگیاں بھری تھیں اور جس کے قدم سالہا سال دو چار تو مخمل و بانات کو روندا کرتے تھے اور ٹائلس اور سنگِ مرمر پہ گھوما کرتے تھے بڑی مشکل سے جھنکڑوں اور جنگلی کانٹوں کی نوکوں کے چر کے اٹھاتی بہت دیکھ بھال کر اور بچا بچا کر قدم دھرتی یہ مزاج لسیار سوال تک پہنچی۔

پتھر کے حوضوں اور پکے تالابوں پر جھاموں سے رگڑ رگڑ کر نہلائی جانے والی نزاکت کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے اس جوہڑ میں گھس کر غسل کرے۔ اور گرد اونچی گھاس تھی، اس کے بعد کچھ دور تک دلدل اور بیچ بیچ پانی کا سلسلہ تھا لیکن درمیان میں زجل پانی جھلملا رہا تھا اور پانی میں نحر در المزاج جانور کو بڑی دلکشی محسوس ہوتی ہے لیکن اچھے صاف پانی تک پہنچنے سے قبل دلدل سے گزرنا تھا جس میں جونکیں بھجبھا رہی تھیں اور سڑی گلی گھاس نہ معلوم کیا کیا وبال بھرا پڑا تھا اور بدبو بھی تھی مگر کئی روز سے غسل نصیب نہ ہوا تھا پانی کی کشش میں اس دلدل اور کیچڑ میں سے کراہیت کے ساتھ گزر گئی۔ اندر پانی خاصہ تھا، کافی دیر دونوں ہم غسلی کا لطف اٹھاتے رہے ایک دوسرے پر فوارے اچھال اچھال کر کھیلتے رہے۔ تھوڑا وقت ذرا اچھا کٹ گیا لیکن جب غسل کے بعد اکڑا نے لنچ پہ دعوت دی تو وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ خیر گیہوں گنے کے رقبہ پر تو ایک ایک دو نوالے جیسے تیسے حلق سے اتارے بھی تھے یہاں تو سرے سے دسترخوان پر ہاتھ ہی بڑھانے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ بڑے تعجب اور حقارت کے ساتھ اکڑا کو دیکھتی رہی جو سونڈ میں پکڑ پکڑ کر لڑہی اور کسیرو کے گٹھے اکھیڑتا تھا اور راوی کی دلدل اور کیچڑ میں لپٹی ہوئی کثیف جڑوں کو اک ذرا پانی میں ڈبو کر دھوتا تھا اور رغبت سے مٹی میں لت پت یہ کرخت نوالہ منہ میں رکھ لیتا تھا —— اور پھر یک نہ شد دو شد صاحب دونوں نہا دھو کر باہر نکلنے لگے تو نزاکت کیچڑ اور دلدل میں بہت سنبھال کر پاؤں دھرتی بھاگ نکلی کہ لت پت نہ ہو جائیں لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو پانی سے نکل کر اور دلدل میں پہنچ کر اکڑا نے ایک لوٹ لگائی اور پھر کھڑے ہو کر کیچڑ کے لوندے سونڈ میں بھر بھر کر تمام جسم کے اوپر چھڑکا اکڑا اکڑا کا صورت ملیامیٹی کی تہ چڑھ جائے —— اور جاڑوں میں روزانہ دوپہر کے دوپہر اور گرمیوں میں صبح شام

دونوں وقت بلاناغہ پتھر اور ربڑ کے جھاموں اور بُرشوں سے رگڑ رگڑ کر نہلائی جانے والی نزاکت کو جو غسل کے بعد ایسی نظر آیا کرتی کہ جیسے سنگِ موسیٰ کا مجسمہ ہے اپنے شوہرِ نامدار کی اس غلیظ حرکت پر سخت تنفر ہوا جو گویا غسل کے بعد کا میک اپ تھا اور فیل خانہ میں بھی غسل کے بعد ہر ہاتھی کا بڑے اہتمام کے ساتھ میک اپ ہوتا اور وہ دیکھتی کہ بوڑھے بوڑھے دادا نانا قسم کے کھوسٹ ہاتھیوں کا بڑا بڑا مانگ پٹم ہوتا، دانتوں پر سونے چاندی کے خول چڑھائے جاتے، بے نوری آنکھوں میں سُرمہ لگتا ——— اور نزاکت کے بناؤ سنگھار پر تو خاص توجہ دی جاتی کیونکہ خانصاحب محمود خاں کی منظورِ نظر تھی۔ ننھی ننھی آنکھیں دنبالہ دار ممیرے کا سُرمہ لگا کر چشمِ آہو بنائی جاتیں اور پیشانی سونڈ کے بالائی حصہ اور رخساروں کنپٹیوں پر تو میک اپ پینٹنگ کی صورت اختیار کر جاتا ——— ایسی ایسی ہفت رنگ گل کاریاں کی جاتیں اور وہ وہ نقش و نگار بنائے جاتے کہ کسی فینسی ڈریس میں پرفارمنس کرنے والی کوئی مغربی حسینہ بیچاری کیا کر پاتی ہو گی اور پھر لباس ایسا فاخرہ ہوتا کہ بجز قرونِ وسطیٰ کی مغربی شہزادیوں کے دنیا میں اور کسی کو تو نصیب نہ ہوا ہو گا۔ سیروں چاندی کے سنہرے روپہلے تاروں سے کارچوب کی ہوئی مخملیں جھول پہن کر اور کانوں میں گنگا جمنی آویزے لٹکائے اور پر چاندی کی عماری سجائے اور دائیں بائیں گھنٹے لٹکائے جس وقت کسی جلوس کے ساتھ جھومتی اٹھلاتی نکلتی تو سچ مچ شہزادی ہی معلوم ہوتی تماش بینوں کی نگاہیں چندھیا جاتیں، سر جھکتے چلے جاتے ——— اور ہاتھی تو وہ جانور ہے جو بغیر لگام و باگ کے صرف آنکس کی زبان سے حکم سُن کر ایک فرمانبردار غلام کی طرح تعمیل کرتا ہے چنانچہ وہ نطق سے تو ضرور محروم ہے لیکن ایسی ذہین اور تیز جبلت لے کر آیا ہے اور قوتِ تمیز بھی اتنا ذکی الحس ہے کہ اپنے جملہ متعلقین کو درجہ بدرجہ پہچانتا ہے۔ وہ اپنے فیل بان، چر کٹے اور مالک کے درمیان ہر ایک کے درجہ اور اہمیت کے مطابق بالکل صحیح تمیز کرتا ہے۔ جلوس، شادی، جنگ، بار برداری جس کام پر لگایا جائے اس کی نوعیت کا محرم ہوتا ہے اور اپنے غسل، آرائش لباس کا اتنا ہی شعور رکھتا ہے جتنا اپنی غذا کا ——— تیاری کے وقت تیاری کی نوعیت سے سمجھ جاتا ہے کہ کہاں لے جایا جانے والا ہوں، شکار، جلوس، جنگ یا بار برداری اور پھر اپنی جبلت کے مطابق اپنی مخصوص حرکات سے خوشی، شوق یا بیزاری کا مظاہرہ تیاری ہی کے وقت شروع کر دیتا ہے۔

اور یہ ٹھاٹ سامان ریاست کے فیل خانہ میں ہر ہاتھی کے لیے تقریباً یکساں تھے۔ نیز مختلف ہاتھی مختلف کاموں کے لیے موزوں سمجھے اور انہیں اسی موقع پر نکالا جاتا تھا اور نزاکت تو فیل خانہ کی شہزادی تھی۔ یوں بھی قدرت نے اس کو تمام تر عارجی محسن و رعنائیوں اور چال ڈھال کے علاوہ عادت جبلی طور پر ہاتھی کی اعلیٰ ترین خصوصیات سے سرفراز کیا تھا اور بڑی تربیت پذیر طبیعت عطا کی تھی اور شائستہ فطرت بنایا تھا۔

——— پھر مالک اور محافظوں کی گہری توجہ اور حُسنِ تربیت کے اہتمام نے اس کو خارجی و داخلی ہر پہلو سے ایک مثالی ہتھنی بنا دیا تھا اور وہ ہر اعتبار سے بادشاہوں اور سرداروں کے شایانِ شان کھلونا تھی ——— اور تقدیر کے کھیل، زاغ کی چونچ میں انگورِ خدا کی قدرت! ذرا آپ کی ٹھاٹھ مبارک ملاحظہ کیجئے۔ مادر زاد بچ عجیب تر کل لے کر دنیا میں آئے تھے ——— گنڈے، ایک دانت وہ بھی بدنما، بے ڈول، موٹا بھدا، بے تکا نکلا ہوا دوسرے کی جگہ بدنما گومڑی سی اٹھی ہوئی، ایک آنکھ چھوٹی ایک بڑی (حالانکہ چھوٹی آنکھ بڑی سے تیز تھی لیکن بظاہر کچی سی معلوم ہوتی تھی اور آپ کانے دکھائی پڑتے تھے) ڈیل ڈول سخت نامناسب، ٹانگیں عجیب انداز میں پھری ہوئیں، معلوم ہوتا ہے کہ جس گھڑی جنینِ مادر کے اندر وجود پذیر ہوا ہے اس وقت سورج گرہن پڑ رہا تھا) تیوند

میں گنڈاپن (جو شروع میں شرارت کا انداز لیے ہوتے تھا اور بعد کو خونیں شکل اختیار کر گیا تھا) سونڈ کی نوک پر جلے ہوئے کارس جیسا سفید داغ، محکمۂ جنگلات کی اصطلاح میں ROUGE کے سرکاری خطاب سے سرفراز، دیہاتیوں میں خونی لقب، اور بھائی بند شاید اپنی زبان میں شیطان کہتے ہوں گے، دیہاتی محکمہ والے اور ہم جنس سب کی نیندیں آپ کے وجود سے حرام اور ہر ایک آپ کے خیال سے گریزاں و لرزاں ——— اور اس پر بھی

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد

نزاکت جیسی پری پیکر اور شائستہ و مہذب ہستی کے شوہر اور نہ صرف شوہر ہی بلکہ عاشق بھی! اور شاید نزاکت کی جانب سے بھی کچھ اپنے متعلق حسنِ ظن میں گرفتار تھے ——— کیا نصیبی؛ وہ جو کچھ اس وقت جذبات کی رو میں ہو گیا ہو گیا اور جو دن ساتھ کٹ گیا گرم خون میں کٹ گیا وہ بھی تعجبات میں تھا۔ نزاکت جنگل کی زندگی سے بیزار تھی، شوہر نامدار کی شکل سے متنفر اور کیسہ پناہ ہم "کنواری ارمان، بیاہی پشیمان" ——— اب گھر کی رنگا رنگ یادیں، اپنے متعلقین کے تصوّر، اپنی ماں کی نرم نرم گود اور پیار، پیاری باتیں، اور سب سے زیادہ باپ کی طرح دستِ شفقت پھیرنے والے محمود خاں کی یاد اور نہ معلوم کون کون سی رسیاں جو اس کے گلے میں پڑی تھیں طوفان اتر جانے کے بعد اب اس کو کھینچتی تھیں۔

اور وہ زنجیر جو نزاکت توڑ کر آئی تھی اس کی کڑیاں آپ ہی آپ جڑنے لگیں اور جب ایک مرتبہ کشش نے زور جو مارا تو صبح کے دھندلکے میں گھر کی جانب منہ کر کے اندھا دھند چل پڑی ——— اور بس دیوانہ وار چلتی ہی رہی ——— پچکارے ہوئے پلّے کی طرح اکڑا بیچارے کان ڈالے قدم بقدم پیچھے پیچھے اڑے چلے جا رہے تھے۔ ایک دو جگہ ٹھہر کر عرض پوچھنا چاہی تو اس نے چلتے ہی چلتے وہ ڈانٹ بتائی کہ غریب پانچ قدم پیچھے جا پڑے ——— اور تمام دن اور آدھی رات ایک رفتار چلنے کے بعد جب اکڑا کی ناک میں بڑی گہری اور غلیظ مانس گندھ پہنچی اور مانس گندھ کے ساتھ ساتھ اور نہ معلوم کتنی اور نامانوس اور منفرت رساں بوئیں پہنچیں تو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ رام پور شہر کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں ——— اور نزاکت نے شہر پناہ کے قریب پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ ذرا دھیمی پڑی ——— اور جب اس نے پرانی بانسی کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچ کر ڈگ بڑھانا چاہی۔ مانس گندھ کی ایسی گمبھیر اور گھٹی ہوئی جگہ میں اکڑا نے بڑھنے سے روکا اور دیوار کی طرح حائل ہو گیا لیکن پچھلی رات کی ہلکی ہلکی، خنک نم ناک ہوا کے دامن پر جو فیل خانہ کے اوپر ہو کر آ رہی تھی اس کے تھان، اس کی پیاری ماں اور اس کے بھائیوں اور باپ چچاؤں خالہ پھوپھیوں اور خاندان والوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی جو اس کو دیوانہ بنائے دے رہی تھی اور وہ کترا کر نکلنے لگی تو اکڑا نے بڑے پیار کے ساتھ اس کی پتلی سڈول نرم نرم نازک سونڈ میں چھلا ڈال دیا اور "قائیں قائیں، قوں قوں، چڑائیں چڑ، قوں، قوں ناجا، نائیں" اپنی مخصوص باز رکھنے والی آواز میں کہا "نہیں، نہیں نزاکت پیاری، نہ جاؤ" اور سونڈ کے اس مخصوص انداز کے ساتھ لپٹنے میں جیسے جذبات کا رخ بدلا اور کچھ اختلاط والی کیفیت پیدا ہو گئی اور اکڑا کے اندر تو پیار اور محبت کا ٹھہرا ہوا عمیق دریا ٹھاٹھیں مار اٹھا اور دو ہفتہ کی عیش کو شوق اور وصل کا تمام پس منظر ابھر آیا لیکن نزاکت فقط اتنا متاثر ہو سکی کہ بجائے جھٹکے کے ساتھ علیحدہ ہونے کے ذرا جھوم کر رخ بدلا ترچھی ہوئی اور اپنی سونڈ سیدھی کر کے چھلے میں سے نہایت نرمی کے ساتھ سونڈ نکالی اور بے بس جو روکتے کے

سلسلے میں ہوا تھا جذبات کے تحت ایک طویل الوداعی بوس بن کر اس طرح ختم ہو گیا اور نزاکت منہ موڑ کر بڑھنے لگی اور راکٹرا نے بیقرار ہو کر جبلی خوف، رعبِ حسن اور نیازمندی سب کچھ پسِ پشت ڈال کر اس کا پچھلا پاؤں مضبوط گرفت میں لے لیا اور نزاکت نے اندازہ کیا کہ اس کی پکڑ اندھیری رات والی زنجیر سے کہیں زیادہ سخت ہے اور پکڑتے ہی پکڑتے بڑی دردناک آواز حلق سے نکلتی رہی۔ درد بھری روتی ہوئی سی کراہٹ۔ بڑے کربناک زیر و بم کے ساتھ جیسے حلق سے بڑھ کر کہیں اور سے نکل رہی تھی، کہیں اندر سینے کی گہرائیوں سے بھی زیادہ گہرائی سے، دل کے پردوں اور روح کے اعماق سے آ رہی تھی اور صاف سنائی دے رہا تھا کہ جیسے پاؤں پکڑ کر اور رو رو کر منت سماجت کر رہا ہے: "رحم، رحم، پیاری نزاکت! مت جا، مت جا۔ اپنے عاشقِ نامراد پر رحم کر، رحم! کشتۂ عشق کو آتشِ ہجر میں مت چھوڑ۔" لیکن فیل خانہ کے اوپر سے کسیلی نمناک چاندنی میں نہائی ہوئی مہک رو نسیمِ سحری اب تو بادموں کی رسیوں کے تناؤ کے ساتھ خوشبوؤں کی لپٹیں بھی لا رہی تھی اور اس کے سبب تصور کی فسوں کاری فیل خانہ کی چہار دیواری کے اندر کا سب ماں سنیما کے اسکرین کی طرح پیش کر رہی تھی۔ ادھر پچھلے عیش کی بازگشت اکڑا کے اندر شیریں نغمہ کی آواز کے بجائے قیامت کا شور بن کر گونج رہی تھی لیکن پچھلا عیش اور جنگل کی زندگی کے چند روز نزاکت کے لیے تو ایک پھیکا پھیکا بھولا خواب تھا جب دیکھا کہ کم بخت پکڑ ہی گیا ہے اور کسی صورت پاؤں نہیں چھوڑتا تو ذرا ترچھی ہو کر نہایت کج ادائی کے ساتھ ایک شوں جو کی تو بیچارہ ڈر کے مارے دھتکارے کتے کی طرح سکڑ کر جا پڑا اور گرفت سے آزاد ہو کر چلتے ہوئے ایک دوسری شوں ہی جیسے "دور موئے تیرا کالا منہ" کہتی سب کچھ توڑ تاڑ کے آگے کو لپک گئی۔

بیچارا بدنصیب اکڑا عادتاً بھر کی اس ڈرامائی ستم ظریفی پر بدحواس سا ہو گیا۔ بے قراری میں دو تین مرتبہ زمین پر پٹخی، بڑی گہری گہری مرتعش سانسوں کا زیر و بم ہوا، پھر شہر کی گہری گہری گھٹی گھٹی بدبودار اور چند صیائی فضا کی جانب سونڈ اٹھا آہستہ کربناک سی آواز نکالتا رہا: "آہ! آہ! آہ! جائیں، جائیں، چاں قوں قوں، تو نہ۔" جیسے کہہ رہا ہے "بے وفائی ہے نام بے وفائی ہے نام عورت کا!" پھر چند ساعت چٹان کی طرح ساکت اُدھر منہ کیے کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ سونڈ اٹھا کر بار بار پیشانی تک لے گیا جیسے محبوبہ کو آخری سلام کر رہا ہے اور پھر ایک مرتبہ گھونسہ سا بنا کر پیشانی پر مارا شاید تقدیر ٹھونکی اور اللہ کا مارا جو دو کا لنا ڈالا انہی قدموں پلٹ پڑا۔

جب ہم پہنچے تو نزاکت نرالی کے پہلو میں چوتھی بھوری دلہن کی طرح ٹھنڈی سہاگن بنی بیٹھی تھی اور نرالی بڑی سریلی پیدا بھر آواز نکال رہی تھی جیسے زچہ گیریاں گا رہی تھی جو بعد میں کھلا تو سچا گیت ثابت ہوا کیونکہ نزاکت امید سے بیٹھی تھی۔

نزاکت کے عشق میں اکڑا کے ساتوں پر پاکرم ہو گئے۔ ذرا سی لونڈیا کے آگے ساری بہادری بھی گرد ہوئی اور مٹھائیں جھڑکیاں بھی سہیں اور دھکے بھی کھائے، خوشامدیں اور منتیں بھی کیں، عشق کی رسی میں بندھ کر شہر تک گھسٹے بھی، غرض یہ

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اور دھوکا بھی گئی اور ستم یہ کہ جاتے جاتے دُم میں دھاگا بھی باندھ گئی کیونکہ شکاری پارٹی نے یہیں سے کھوج اٹھا کر تعاقب شروع کر دیا۔ اکڑا کے رُخ، رفتار اور دوسرے قرائن سے اندازہ لگا کر ہم نے بجائے جنگل میں کیمپ لگانے کے جگہ جگہ ایک

ڈاک بنگلہ اپنے قیام کے لیے تجویز کیا اور وہاں پر فوری انتظامات کے احکام دے کر ہماری پارٹی اکڑا کے پلٹے ہوئے کھوجوں پر روانہ ہو گئی اور ہم جوں جوں بڑھے تو اکڑا کے راستہ پر پلٹنے کی نشانیاں دیکھ کر اور جگہ جگہ خبروں سے اندازہ ہوا کہ دو ہفتہ کے وصل و ہم کناری کے بعد یکدم جدائی و کج ادائی اور بے وفائی کے سنگین المیہ سے دوچار ہو کر اکڑا نے شدید ہزیمت اور سخت چوٹ محسوس کی اگر آج کوئی رقیب روسیاہ سامنے ہوتا اور اس کو پیس کر سُرمہ کر دیتا تو شاید کچھ دل ہلکا ہو جاتا۔ اس کے واپسی کے کھوج بڑی شدید قسم کی تشنگی اور غیض کے آئینہ دار تھے۔ جہاں پاؤں پڑا تھا زمین شق ہوتی چلی گئی تھی جو چیز زد میں آئی تھی زیر و زبر ہو کر پناہ سی مانگتی دکھائی دیتی تھی۔ درخت جھاڑی ایسا ویسا پتھر، دیمک کے ٹیلے جو چیز سامنے پڑی تھی درہم برہم ہوتی چلی گئی تھی جیسے ناکامی شکست اور ہجر کے غم میں وہ بُل ڈوزر کی طرح الٹتا پلٹتا چیرتا پھاڑتا گزرا تھا، میلوں کا فاصلہ دوپہر تک طے کر گیا اور اپنی ہانٹ میں پہنچ کر سب سے پہلے ناک کی لے تار کی تار برقی پر معلوم کرکے سیدھا اپنے ساتھیوں میں جا پڑا اور بادل کی طرح گرجنے لگا، بڑا رن پڑا اور سب غول منتشر ہو گیا، بیسیوں چھوٹے بڑے درخت تنکے کی طرح اکھاڑ پھینکے، نہ کھایا نہ پیا، قصبے کے رقبے ہری بھری فصلوں کے پٹ کر دیے، کسی کھیت پر کوئی جھونپڑی یا ٹاٹر باقی نہ چھوڑا، جنگل میں رستخیز کا سماں بپا کر دیا۔

جوں جوں ہم بڑھتے گئے اس کے بے پایاں غیض کا اندازہ ہوتا گیا۔ ہمارے آدمی جو پہلے بجی پور کیمپ سے چھوڑے تھے ہم کو جگہ جگہ ملے اور ان کے ذریعہ ہم کو مجملاً حالات کا علم ہوتا گیا۔ خدا کا شکر ادا کرتے جا رہے تھے کہ کہیں سے کسی آدمی کے مارے جانے کی خبر نہ ملی تھی اور دیہات میں خیریت رہی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے سے یوں بھی چوکنے تھے، پھر نزاکت کے اغوا کرنے کے بعد ہمارے آدمیوں نے جو تگ و دو کی تھی اس میں دیہاتی بہت ہوشیار ہو گئے تھے حالانکہ ابھی تک ہم کو بہت تھوڑی واقفیت بہم پہنچ سکی تھی۔ مستی میں جب ہاتھی اور ہتھنی جمع ہوتے ہیں تو بڑی گہری خلوت چاہتے ہیں، جولانگاہ بھی بڑی محدود ہو جایا کرتی ہے۔ اب جو دس پندرہ روز غائب رہ کر یکدم اکڑا اپنی طویل و عریض جولانگاہ میں نمودار ہوا اور یہ قہر و غضب کی نشانیاں جگہ جگہ جنگل میں نظر آئیں تو دیہات میں سخت ہراس پھیل گیا اور عام طور پر یہ افواہ پھیل گئی کہ اکڑا کو سرکار نے ریاست کے فیل خانہ میں قید کرا لیا تھا اور وہ قید خانہ کا پھاٹک توڑ کر بھاگ آیا ہے اور غصہ کے مارے بولا گیا ہے۔ شاید قید ہو آنے والی افواہ شہر کے قریب تک پہنچنے والی بات کی مسخ شدہ اور بڑھی چڑھی شکل تھی لیکن دراصل قید ہونے میں رہ بھی کیا گیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہی موج کے عروج والے تین چار روز کے اندر نزاکت پر حبِ وطن کا جوش غالب آجاتا اور وہ گھر کو بھاگ کھڑی ہوتی تو کیسا ڈر اور کہاں کی وحشت، ہوگی مانس گندھ اور شہر کی گہما گہمی، مجنوں کو بجز اپنی لیلیٰ کے اور کچھ نہ دکھائی پڑتا اور اسیرِ محبت و شہیدِ ناز اکڑا، غارت گرِ ہوش و آگہی نزاکت کے ساتھ اسی طرح حالِ دل بیان کرتے ہوئے کششِ عشق میں پیچھے پیچھے ایک رفتار کھنچے چلے آتے اور معذرانہ وار فیل خانہ کے اندر دکھائی پڑتے اور حالِ دل ختم نہ ہو پاتا۔ کئی ایسی مثالیں بڑے وحشی قسم کے جنگلی جانوروں کی ہمارے تجربہ میں تھیں جو کیفیتِ شبِ ہجر بیان کرتے ہوئے اور تفسیرِ قلبِ محزوں کرتے ہوئے تدبیرِ وصل میں مجنوں کی طرح سرزمینِ لیلیٰ کو جانے والے ناقہ سوار کے ناقہ کی دُم پکڑے پکڑے سچ مچ پیاری لیلیٰ کے دیس میں پہنچ گئے اور پہنچ کر بھی حالِ دل نذرِ بیان ہی کرتے رہے اور داستانِ ہجر اور کششِ عشق ختم نہ ہوئی اور خود ختم ہو گئے۔

(۴)

اگرچہ جگا میاں پشتوں کے استاد قسم کے شکاری تھے، کوئی جانور ایسا نہ تھا جو انھوں نے بے شمار کی حد تک شکار نہ کیا ہو اور شیر کے شکار میں تو انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ایک بڑے اسپورٹس مین کی طرح وہ ہر قسم کے شکار کے متعلق اپنا ایک مخصوص نظریہ اور اصول رکھتے تھے، ہاتھی کا شکار ان کے نزدیک بڑے اسپورٹ کی تعریف ہی میں نہ آتا تھا اور نہ اس کا انھیں کوئی عملی تجربہ تھا، اور اس سلسلہ میں کچھ مخصوص دلائل و براہین تھے جو ایک حد تک منطق پر پورے اترتے تھے۔ بقول ان کے کہ بجز اس کے کہ ہاتھی کا شکار بہت وزنی ہڈی والا شکار ہے بقیہ اور شکار کے جتنے لطف ہیں وہ اس میں مفقود ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ اس کے دیوار سے جسم پر کسی جگہ بھی گولی لگانا کوئی کمال نہیں ہے لہٰذا نشانہ بازی کے فن کا لطف تو یوں گیا۔ جنگل میں چلتا ہے تو یہاں تک اردگرد کی گھاس اتنا ہیں بیلیں ٹوٹتی کچلتی جاتی ہیں، اپنے پیچھے جو کھوج چھوڑتا ہے وہ بالعموم اچھی خاصی پگڈنڈی کی شکل میں ہوتا ہے، تلاش اور تعاقب کا مزا یوں گیا۔ پھر آنکھ سے تقریباً معذور رہتا ہے، بس ناک اور کان سے کام لیتا ہے۔ ہوا کا رخ اور پاؤں کی چاپ کی احتیاط رکھیو اور پچاس گز کے اندر آپ کی موجودگی کا اس کو احساس نہ ہوگا، وہ گھیر گھار والا لطف بھی نہیں ہے — تقریباً بے ضرر مخلوق ہے عام طور پر نہ جانوروں ہی کو گزند پہنچاتا ہے نہ آدمیوں ہی کو، بالعموم جنگلی گھاسوں اور پتیوں سے پیٹ بھرتا ہے۔ مستی کے زمانہ میں جب زیادہ جوش پر ہوتا ہے تو کبھی کبھی بے قصور بھی خونی مشہور ہو جایا کرتا ہے اور بے موت مارا جاتا ہے، اکثر خونی ہاتھی کے دھوکے میں جنگل کے اندر بعض بے گناہ شکار ہو جاتے ہیں اور پھر محکمہ کی جانب سے جواب طلبیاں ہوتی ہیں اور جب خونی ہاتھی کے شکار کو نکلو اور یہ پابندیاں اور اندیشے لگے ہوں تو پھر شکار کا لطف تو کرکرا ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے پرجوش کارکن تھے اور اپنے خالص فوجی کردار کے تقاضے کے مطابق پوری اسپورٹس مین اسپرٹ کے ساتھ اکڑا کے استیصال میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یوں بھی ریاست کے ہیڈ شکاری ہونے کی حیثیت سے ایک طرح پر یہ ان کے فرائض منصبی میں تھا اور ریاست اور ضلع نینی تال دونوں جگہ کے محکمہ جنگلات کے عمال کی آنکھیں ان کی جانب لگی ہوئی تھیں اور وہ سمجھتے تھے کہ اس بلا سے صرف جگا میاں ہی نجات دلا کر انھیں رو براہ کرا سکتے ہیں۔

جائے استاد خالی ست، جیسا کہ بیان کیا اگرچہ جگا میاں کو ہاتھی کے شکار کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر وہ ہاتھی تو در کنار جنگل کے کیڑے مکوڑوں تک کے مزاج اور جبلت کے محرم تھے لیکن انھوں نے یہیں سے اکڑا کے راستہ کی وہ پیشگوئی کی تھی جیسے راہ فرار میں وہ اس کی پیٹھ پر سوار تھے اور اسی بنا پر انھوں نے یہ رائے دی تھی کہ قیام کا انتظام تحصیل بلاس پور کے جنگل کے اندر جو بڑا وہ منزلہ ڈاک بنگلہ ہے اس میں ہو کیونکہ انھیں یقین تھا کہ یہ شہر پناہ کا بھاگا ہوا اسی نواح میں پہنچے گا لہٰذا نہایت وثوق کے ساتھ ایک ٹرک پر اسباب لدوا کر یہاں اس ڈاک بنگلہ میں پہنچایا گیا۔ پھر نہایت فنکارانہ انداز میں خانصاحب محمود خاں کے مشورے سے یہ انتظام کیا کہ اسپونڈنگ فورڈ سروس روڈ پر رہی اور ہم لوگ اکڑا کے کھوجوں پر چلے جو کبھی مین سروس روڈ پر آ جاتے تھے اور کبھی سروس روڈ سے دس دس پانچ پانچ میل ادھر ادھر جا پڑتے تھے اور کبھی دو دو تین تین میل قریب متوازی چلتے تھے۔ چند گھنٹے چلنے کے بعد ماہر جبلت جگا میاں نے اندازے لگانا شروع کیے۔ کئی کئی میل انھوں نے سروس روڈ پر ہم سب کو کار میں بٹھا بٹھا لیا اور کھوجوں کا رخ جانچ کر پانچ

سات سات میل سروس روڈ پر چل کر آگے سے پھر کھوج پکڑ لیے اور اس طرح میلوں کا دھاوا مار لیا اور تیسرے پہر کے وقت مجا میاں نے جیسے ایک ماہر نجومی کی طرح قطعی محاکمہ کر دیا کہ خواہ اکڑا کے روندے ہوئے راستہ پہ باقاعدہ کھوج لیتے ہوئے چلو یا براہِ راست سروس روڈ پر فورڈ پر سوار ہو کر نتیجہ یہ کھوج اسی ڈاک بنگلہ کے نواح میں پہنچیں گے جہاں ہمارا قیام ہے۔ اگرچہ ابھی ڈاک بنگلہ سیدھے راستہ تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر تھا لیکن ہم نے تھوڑی سی بحث کے بعد ان کی ہدایت قبول کر لی، یوں بھی شام آ رہی تھی۔ ہاتھی کی رفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوش میں بھرا چلا ہی جا رہا ہے اور ابھی میلوں تک یوں ہی جائے گا اور کافی دیر بعد مائل بہ سکون ہوگا دن لوٹ چکا تھا۔ کھوجوں کھوجوں نہ معلوم کتنے میل طے کرنا پڑتے، کھوجوں پر تعاقب کرنے کا وقت نہ تھا، ہم لوگ سوار ہو گئے اور تقریباً سوا گھنٹہ میں ڈاک بنگلہ پہنچ گئے۔

یہاں بستر لگے ہوئے تھے اور چولہا گرم تھا۔ جس جس کو غسل کرنا تھا انھوں نے غسل کیا اور جب ہم سب کپڑے بدل کر اور یکسو ہو کر بڑے کمرے میں چائے کی میز کے گرد جمع ہوئے، چائے اور کافی کے گرم گرم گھونٹوں کے درمیان ہماری مجلس شوریٰ گرم ہوئی تو کسی نوکر نے بتایا کہ چوکیدار کہتے تھے کہ رات اکڑا یہیں کہیں ڈاک بنگلہ کے قریب تھا اور ہم سب اچھل پڑے اور سب کی نیازمندانہ نظریں یک دم استاد مجا میاں کی جانب اٹھ گئیں جو بالکل مطمئن اور خاموش بیٹھے تھے اور انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کہہ رہے ہیں کہ یہ تو خیر یقینی بات تھی، اور انھوں نے آہستہ سے کہا کہ چوکیداروں کو بلاؤ اور بڑے استادانہ اور خوما غماغمانہ انداز میں چائے پیتے رہے، اور چوکیداروں نے بیان کیا پچھم کی جانب تقریباً میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ایک جوہڑ ہے رات اسی پر ہاتھیوں کا بڑا غول جمع تھا، یکدم آدھی رات کو جیسے قیامت سی مچ گئی، بادل سے گرجنے لگے۔ خوف کے مارے ہم لوگوں نے اپنے کواڑ چھوڑ دیے اور بنگلہ کی چھت پر چڑھ گئے اور یہاں آوازیں اور بھی واضح ہو گئیں۔ ہاتھیوں کی گرج، ہتھنیوں کی چیخیں تمام فضا کو سر پہ اٹھائے ہوئے تھیں۔ درختوں پر بسیرا لیتی ہوئی چڑیاں چرچڑا پڑیں، دور دور تک مرغیاں کڑکڑا پڑیں، مور کڑک اٹھے۔ اگر اندھیری رات ہوتی تو بہت ہراس پھیل جاتا، پھر بھی دو تین گھنٹہ یہ عالم رہا کہ زمین ہلتی سی رہی معلوم ہوتا تھا کہ کئی ہاتھی مل کر ایک ہاتھی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مجا میاں "ہوں! ہمں!" کہہ کے بغور سنتے رہے۔ ایک آدھ سوال کیا جس سے بعض چیزوں کی اور بھی وضاحت ہو گئی۔

معاً میرے دل میں خیال آیا کہ خیر کھوجوں پر تعاقب تو صبح ہی سے شروع کریں گے لیکن چونکہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی لہٰذا کیوں نہ ابھی جا کر دیکھا جائے اور میں نے کلائی پر نظر کی اور پھر میری نگاہ باہر دھوپ کی طرف اٹھی، ابھی ڈیڑھ گھنٹہ دن باقی تھا اور مجا میاں میری جانب دیکھ کر بولے :-

"کیوں؟ کیا مطلب ہے؟"

"میاں! میری رائے یہ ہے کہ ابھی اتنا وقت ہے کہ ہم لوگ کل کے لیے تھوڑا بہت میدان دیکھ لیں اور پھر رات میں مشورہ کر کے طے کر لیں کہ صبح تڑکے سے ہم کو کس سمت چلنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہمں! ابھی میں کہنے والا تھا، کر سے کم کچھ اندازہ تو ہو جائے گا۔"

اور ہم چند شوقین چل پڑے، جوہڑ کے کناروں پر مہابھارت کا سماں تھا۔ ایک ہاتھی نے تین ہاتھیوں سے ٹکر لی تھی

لڑی تھی۔ پہلے تو اس نے پورے غول سے مقابلہ کیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ جب سب کو شکست دے دی تو تینوں من چلے پلٹ پڑے اور انھوں نے بڑے دل گردے کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن میدان اسی کے ہاتھ رہا تھا اور تینوں شکست فاش کھا کر بھاگے تھے اور ایسے بدحواس کہ سمت کا تعین بھی نہ کر سکے تھے اور نہ راستہ ہی کا شعور رہا تھا جو ہاتھی کی جبلت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور نہ ایک کو دوسرے کی سدھ بدھ ہی رہی تھی اور بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ زیادہ وقت تو نہ تھا مگر جتنا بھی ہم کھوجوں پر چل سکے اس سے اندازہ ہوا کہ لڑائی تو خیر میدان میں ہوئی تھی لیکن ہزیمت خوردہ جس جس راستہ پر گئے تھے بل ڈوزر کی طرح جھاڑیوں اور گھاس کا ستھراؤ کرتے چلے گئے تھے اور خون کے بڑے بڑے دھبے کھوجوں کے ساتھ ان کے شدید زخمی ہونے کے گواہ تھے۔ بس اونچی نیچی گھاس میں، چھوٹی بڑی جھاڑیوں میں، پیچ در پیچ بیلوں میں، موٹے پتلے درختوں کے درمیان ان کا راستہ اپنے آپ بنتا چلا گیا تھا۔ تمام گھاس پر اور جھاڑیوں پر رات کا جما ہوا خون لگا ہوا تھا۔

ہزیمت خوردہ اور فاتح دونوں ہی فریقوں کے راستہ پر خون بہا ہوا تھا۔ سب کے کھوج ایک ہی سے تھے محکمہ جنگلات نے جو پیمائش اکرٹا کے کھوجوں کی بھیجی تھی وہ ماپ تقریباً ہر نوجوان ہاتھی کے کھوجوں کا ہوتا ہے۔ دونوں ہی کے کھوج تندگامی کے مظہر تھے لیکن ایک کھوج ایسے تھے جن سے خیر تندگامی کا تو اندازہ ہوتا تھا لیکن بدحواسی نہ تھی بلکہ نسبتاً پُر اطمینان اور ٹھہری ہوئی چال معلوم ہوتی تھی اور یہی کھوج فاتح کے تھے اور بس میرے پندار میں یہی اکرٹا تھا حالانکہ بعض ساتھیوں نے اختلاف کیا اور اکرٹا کے کھوج دوسرے سمجھے۔

رات گئے تک ہم لوگ بحث کرتے رہے۔ کل صبح کے لیے پروگرام پر مختلف رائیں رہیں۔ ان آدمیوں میں سے چند لوگ جو ہم نے بجلی پور کیمپ سے جاسوسی اور اکرٹا کی نقل و حرکت پر مامور کیے تھے ہمارے یہاں پہنچنے کی خبر پا کر آ گئے تھے۔ ان میں سے دو ایک ایسے شاطر تھے کہ اغوا ہونے کے بعد دوسرے ہی تیسرے روز سے ہوا کا رُخ اور رجاپ بچا کر بڑی چابک دستی سے سر ہتھیلی پر رکھے سایہ کی طرح ساتھ لگے رہے تھے۔ یہ لوگ تقریباً پیشہ ور شکاری تھے۔ رُخ کا صحیح اندازہ لگانے، فنکارانہ انداز میں تعاقب کرنے، دبے پاؤں چلنے اور موقع پڑ جانے پر پتھر کی طرح جہاں کے تہاں جم کر رہ جانے میں بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے ہمیں گھڑی گھڑی کی تفاصیل سنائیں، جن جن جگہوں پر اکرٹا نے ہنی مون منایا تھا اور جہاں جہاں نزاکت نے جلوۂ [illegible] دی تھی تمام حالات چشم دید بیان کیے۔ ان میں سے ایک کی ذہانت اور مستعدی اور دم خم سے میں بہت متاثر ہوا۔ اس کا نام روما تھا۔ یہ سال بھر پہلے بھی ایک مرتبہ میرے ساتھ شکار میں رہا تھا۔ باوجود نیم خانہ بدوش اور جنگلی ہونے کے اس نے بڑے مزے لے لے کر ڈرامائی انداز میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ اکرٹا کے وصل کے بعض سین بیان کیے اور خاص طور پر مطیع ہونے اور نزاکت سے ڈرنے کا حال تو بڑے ہی مزاحیہ انداز میں بیان کیا جس کے دوران میں بعض باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ پرلے درجہ کا بیباک اور شوقین شکاری ہے، دن میں تو نزاکت اور اکرٹا تقریباً ہر گھڑی اس کے سامنے رہے ہی تھے لیکن اس نے صبح کو ان کے کھوج دیکھ دیکھ کر اور قرائن کی [illegible] [illegible] تقریباً ان کی ہر بات کی تگ و دو پر نظر رکھی تھی۔ بعض مواقع پر یہ ان کے اس قدر نزدیک پہنچ گیا تھا کہ صرف بھاگنے کے سہارے بچا رہا ورنہ مارا جاتا۔ پھر یک دم اس نواح سے اکرٹا اور نزاکت دونوں کے غائب ہو جانے پر

انھیں جو خلفشار پیدا ہوا اور دو دن بے سبب بھٹکتے پھرے، وہ تمام حالات بیان کیے۔ غرض اس تمام جنگلی پارٹیوں کی کارگزاریوں سے ہم لوگ بہت متاثر ہوئے اور خاص طور پر میں نے روما کی کارگزاریوں کو بہت سراہا اور اس طرح میں اس کو بالکل اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کر لیا۔

رات گئے تک ہماری مجلس شوریٰ چلتی رہی جو کھانے کی میز سے شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ مجا میاں اس طریقہ کو اچھا خیال نہ کرتے تھے مگر بجز اس کے اور کوئی صورت بتا بھی نہ سکتے تھے کہ کھوج لے کر زمین سے شکار ہوگا۔ ایسا شکار بڑی بیباکی کا کام تھا۔ اپنے نشانہ اور ہتھیاروں کی ضرب کے علاوہ بہت کچھ اپنی قسمت پر بھروسہ کر کے شکار کرنا پڑتا تھا۔ ہرچہ باداباد، جو کچھ خطرہ اور جان جوکھم تھا سب کے سامنے تھا لیکن شاید اسی میں شکار کا پورا لطف بھی مضمر تھا۔ بھاری گولی والے دو نالے رائفلوں کے دو سیٹ ساتھ تھے۔ 450/400۔ بور کی چار جوڑیاں اور دو جوڑیاں 577۔ بور کی، اول الذکر ہم کو زیادہ مناسب معلوم ہوتا تھا اگرچہ خود مجا میاں 577۔ بور کو پسند کرتے تھے۔ یہ اول الذکر سے زیادہ طاقت ور اور شدید ضرب والا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت وزنی بھی تھا اور دھکا بھی شدید دیتا تھا۔ پھر یہ ایک متروک سا قسم کا انیسویں صدی کے اواخر کا ہتھیار تھا۔ اگرچہ ہاتھی کے شکار میں مہلک ترین ثابت ہوتا لیکن لاد کر چلنا اور استعمال کرنا مشکل تھا۔ 400/450۔ بور نسبتاً اس کے بعد کی ایجاد تھا اور ہر پہلو سے مناسب تھا اور ہم سب نے اسی کو پسند کیا۔

ہماری مجلس شوریٰ گیارہ بجے رات کو ختم ہوئی، دو فارسٹ گارڈوں اور ایک رینجر کی ڈیوٹی نینی تال کے محکمہ جنگلات کی جانب سے ہمارے ساتھ لگی تھی یہ لوگ بیچارے بجز اس کے کہ مشورہ کے وقت چپ چاپ بیٹھے رہیں اور کسی قابل نہ تھے حتیٰ کہ رینجر تو نکل کر جنگل میں دو چار میل ساتھ چل بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ کے لیے روما کو منتخب کیا دوسرا آدمی جو بندوق بردار تھا اور تھیلہ وغیرہ لٹکا کر چلتا تھا سیدھا سادا دیہاتی تھا۔

رات کے اخیر حصہ میں جیسے کسی غیر معمولی موسمی تبدیلی کے سبب میری آنکھ کھلی تو میں نے اندازہ کیا کہ پہاڑی ہوا کے مخصوص پیہم جھونکے چل رہے ہیں ویسے تو ہم ہمالیہ کے دامن اور ترائی بھابھر کے بسنے والے لوگ اس پہاڑی ہوا سے خوب آشنا ہیں حتیٰ کہ تمام دن ہمارا میدان تپتا ہے تو ہو کتی ہے اور شام ہوتے ہی بڑی سبک رفتاری سے شمالی ہوا چلنے لگتی ہے اور بڑی پیاری خنکی ہو جاتی ہے لیکن اس مخصوص موسم میں اور اس رفتار کے ساتھ جب یہ ہوا چلتی ہے تو ہلکی پھلکی بارش کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور مجھے جو اندیشہ تھا وہ پورا ہو کر رہا، صبح ہوتے ہوا ٹھہری اور ایک ہلکا سا چھینٹا پڑ گیا اور کل کے پروگرام کی سب سے بڑی قباحت سامنے آ گئی یعنی کھوج تو باقی رہ گئے لیکن رات کے کھوجوں پر بوندوں نے پہلے اور بعد کے یہاں تک کہ شروع شب کے اور آخری رات کے نشانات کی تخصیص مٹا دی اور اس صورت میں گویا وقت کا اندازہ بالکل ختم ہو گیا، صرف قرائن پر بھروسہ کر کے چلنا رہ گیا اور صبح جب ہم بیدار ہوئے تو یہ قباحت ہر ایک ذہن میں تھی، کہیں صحیح کھوج ملنا بڑا مشکل ہے لیکن مجھ سے روما نے آہستہ سے کہا کہ میں آپ کو بالکل صحیح کھوجوں پر لے چلوں گا۔

جب ہم جنگل میں پہنچے تو کل اور پرسوں کے درمیانی رات والی طوائف الملوکی اور جنگ اور بھاگ دوڑ سے تمام جنگل درہم برہم تھا۔ جگہ جگہ گھاس جھاڑی درخت کوئی شے اپنی جگہ پر نہ رہی تھی، جیسے جدھر کو جس کا منہ اٹھا تھا اندھا دھند بھاگا چلا گیا تھا

اور پھر ستم یہ کہ بارش نے نئے اور پرانے نشان سب یکساں کر دیے تھے البتہ ابھی خون نہ دُھلا تھا۔ چار کھوجوں پر خون تھا اور ہماری چار پارٹیاں انہی پر چل پڑیں۔ روما مجھ کو ان کھوجوں پر لے کر چلا جن کے متعلق میں نے کل شام اندازہ کیا تھا کہ باوجودیکہ خون کے نشان ساتھ ہیں لیکن یہ ہاتھی نسبتاً اطمینان اور فطری چال کے ساتھ گیا ہے اور جس کے متعلق مجھ کو گمان ہوا تھا کہ یہ اکڑا کے کھوج ہیں اگرچہ پارٹی کے بعض ساتھیوں اور خود جمّا میاں کی رائے یہ تھی کہ یہ پٹا ہوا ہاتھی ہے اور کمزوری اور چوٹ کے سبب آہستہ آہستہ گیا ہے۔ بہرحال سب کے اختلاف کے باوجود میں نے اپنی اور پھر روما کی رائے کو ایک اور ایک گیارہ خیال کیا اور بسم اللہ کر کے ان کھوجوں پر چل پڑا۔ روما کے ہاتھ میں ایک برچھا تھا۔ ایک اور آدمی بھی ساتھ تھا جو میرا دوسرا رائفل اٹھائے ہوئے تھا۔ کھوج لینے میں ہم کو کوئی دقت نہ ہو رہی تھی۔ جما ہوا سیاہ خون رات کی بوندوں سے بہہ بہہ کر اور بھی زیادہ واضح ہو گیا تھا اور پھر یوں بھی ہاتھی کے کھوج بہت واضح ہوتے ہیں اور جب ہاتھی غصہ میں گیا ہو تو پھر ایک ہی مرتبہ میں پگڈنڈی چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ صبح سے دوپہر ہوگئی اور ہم دونوں نے باوجود بوندوں کے مسخ سا کر دینے کے انہی کھوجوں پر جگہ جگہ ہاتھی کے ٹھہرنے سے اندازہ لگایا کہ یہاں پر اس وقت تھا، یہاں تک کہ وقت اور رفتار کا اندازہ کرتے ہوئے ہم نے تمام دن طے کیا اور پھر اپنے پندار میں اس کا تمام رات کا راستہ طے کیا —— اور پھر آج صبح کا اور اب ہم اپنے پندار میں صحیح راستہ پر وقت کے عین مطابق چلے جا رہے تھے کہ یکدم ہمارے دونوں کے قدم ٹھہر گئے۔ ہمارے سیدھے ہاتھ کی جانب سے ایک اور ہاتھی کے کھوج آئے تھے اور جن کھوجوں پر ہم چلے جا رہے تھے انھیں کاٹتے ہوئے ہمارے بائیں ہاتھ کو نکلے چلے گئے تھے۔ یہاں پر ہم دونوں کو ایک لحۂ فکر پیدا ہوا۔ پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں بات ہوئی، پھر بہت آہستہ آہستہ بولنا پڑا، بارش کی وجہ سے پہلے اور بعد کے کھوجوں کی تو پہچان مٹ ہی چکی تھی، اب یہاں پر دو تین سوال سامنے آئے۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ یہ کون سے ہاتھی کے کھوج ہیں؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ یہ جس ہاتھی کے بھی کھوج ہیں اور جس سمت کو بھی گئے ہیں اس کی جانب ہوا ہم پر سے گذر کر جا رہی ہے اور وہ ہماری بُو لے سکتا ہے لیکن جن کھوجوں پر ہم چلے آ رہے تھے ان پر خون کے نشان تھے اور ان نئے کھوجوں پر خون نہ تھا اور بس یہی ایک نشانی ہم کو ملی جس سے ہم نے یہ فرض کیا کہ یہ کسی اور ہاتھی کے ہیں جو بے ضرر ہے اور یہیں کہیں جا رہے چھوبل کے اندر جنگل میں آرام کر رہا ہوگا کیونکہ بالعموم ہاتھی دن کے وقت چلتے پھرتے نہیں ہیں جب تک کہ کوئی خاص وجہ نہ ہو۔ یہاں پہنچ کر میں نے ذرا گہری توجہ کے ساتھ اپنے جغرافیائی ماحول کا جائزہ لیا تو میرے بائیں ہاتھ پر شمال مغرب کی جانب پہلے گھنا جنگل، جگہ جگہ میدان پھر نیچی نیچی پہاڑیاں اور پھر پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ جنوب مشرق میں لامتناہی جنگل چلا گیا تھا اور غیض میں دیوانہ ہاتھی کے جن پُرپیچ وخم راستوں پر میں چل رہا تھا وہ مجھ کو سامنے دریائے کوسی کے کنارے لے جاتے معلوم ہوتے تھے۔ کچھ اشاروں ہی اشاروں میں بات ہوئی اور میں نے پوری طرح رضا بھی نہ دی اور روما مجھ سے علیحدہ ہو کر ان نئے کھوجوں پر چل پڑا۔ میں سمجھا کہ کچھ دور جا کر پلٹ آئے گا۔ صرف کھوجوں کا اندازہ لگانے چند قدم جا رہا ہے مگر اس نے مجھ کو بدستور انہی کھوجوں پر جن پر ہم چلے آ رہے تھے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اشارہ ہی سے یہ بھی یقین دلایا کہ میں بہت جلد آپ سے آ کر مل لوں گا اور وہ چل پڑا۔ اور شاید وہ بڑی عجیب گھڑی تھی جس میں اس کے دل کے اندر مجھ سے علیحدہ ہو کر ان کھوجوں پر جانے کا خیال پیدا ہوا۔ میرے دل میں آیا کہ میں اس کو ادھر یوں بے قاعدہ طریقہ پر جانے سے روک دوں لیکن میں مجبور ہو گیا۔ وہ جانے کا خود ہی ارادہ کر کے اور خود ہی اجازت لے کر چل پڑا تھا یا چند قدم بڑھا کر اس نے جانے کا ارادہ کیا اور اب میری جانب کہ اس کی پشت تھی۔ آواز

دینے کا موقع نہ تھا کہ منہ سے سیٹی بجا کر بھی اپنی جانب مخاطب کرنا خلافِ احتیاط تھا۔ دو تین منٹ میں اُدھر منہ کیے کھڑا رہا کہ اگر مڑ کر دیکھے تو اشارہ سے بلالوں اور جانے سے باز رکھوں لیکن اس نے مڑ کر نہ دیکھا اور ہمہ تن توجہ بنا کھوجوں پہ بڑھتا رہا اور بتدریج وہ مجھ سے دور ہوتا گیا میرے اندر اس کو واپس بلانے کی خواہش تیز ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا تو جیسے میرے دل کے اندر اس کو واپس بلانے کی خواہش ہوک سی بن کر اٹھی مگر کمان سے نکلا تیر ——— پھر واپس نہیں آتا مگر ڈھونڈے سے مل تو جاتا ہے، اور میں نے اپنے کھوجوں پہ بڑھنا شروع کر دیا۔ بمشکل دو میل چل پایا ہوں گا کہ میں نے غور کیا کہ دریائے کوسی بہت قریب ہے اور مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یہ ہاتھی پار نہ اتر گیا ہو ——— تو پھر تعاقب میں یہاں سے دوسرا الفتنہ ہو جائے گا اور اب تجسس بڑھا، یہاں تک کہ میں بالکل دریا کے کنارے پہنچ گیا، یہاں پہنچ کر کچھ کھجوریاں سموسے کھانے کا ارادہ کیا اور دو گھونٹ پانی پینے کا خیال آیا کہ میں یکدم اچھل سا پڑا اور کھانا پینا سب بھول گیا جیسے میرے اندر چھٹی حس بڑے زور سے بروئے کار آ گئی، خطرہ! کوئی عظیم خطرہ! میں شکاری ہوتے ہوئے بھی نیک و بدشگون اور چھٹی حس قسم کی چیزوں کا قائل نہیں ہوں، اس تحریک کے بانی کے بھی کچھ نہ کچھ مادی وجوہات اور سامان ہوتے ہیں اور دوسری ہی نگاہ میں میں نے دیکھ لیا کہ ہاتھی دریا کے کنارے پہنچ کر پانی میں گھسا ہے اور پانی سے نکل کر غالباً بارش کے عین وقت کنارے پر ریتلی اور کنکریلی کیچڑ میں لوٹتا رہا ہے اور وہاں سے اٹھ کر دریا کے کنارے کنارے داہنی جانب کو مڑ گیا ہے اور جب میں ان کھوجوں پر مڑا تو جیسے خطرہ کی ایک لہر سی میرے سینہ میں اٹھی کیونکہ یہاں سے اب جو کھوج بڑھے تھے ان پر خون نہ تھا، کیچڑ میں لوٹنے کے سبب خون بند ہو گیا تھا۔ میرا بندوق بردار جو میرا جھولا اور تھوڑا سامان لٹکائے ہوئے تھا یہ دیکھ کر کہ بجائے کچھ کھانے پینے کے اب ان کھوجوں پر پڑ لیے، دل میں کچھ مکدر رہا ہو گا اور اس کو تو شاید یہ سوجھ رہی ہو گی کہ کچھ پیٹ میں پڑ جاتا مگر مجھ کو بہت دور تک کی سوجھنے لگی۔ تقریباً میل بھر ان کھوجوں پر چلنے کے بعد چھٹی حس نے پھر بڑے زور سے خطرہ کا الارم دیا۔ میں سنبھلا اور بڑھا اور ایک دو فرلانگ بڑھنے کے بعد دیکھا کہ کھوج دریا کے کنارے کنارے چلتے چلتے پھر سیدھی جانب کو مڑے تھے اور اب میرے سینہ میں کھٹ کھٹ ہونے لگی، قدم تیز ہو گئے۔ تقریباً میل بھر دریا کی کڑی میں چلنے کے بعد ہاتھی پھر سیدھے ہاتھ کو مڑ گیا تھا اور اب میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ یہ ایک ہی ہاتھی کے کھوج ہیں ——— یہ وہی کھوج ہیں اسی ہاتھی کے ——— اور اسی نے اوپر تین چار میل کے فاصلہ پر اپنے ہی کھوجوں کو کراس کیا ہے! ——— اور کیچڑ کی وجہ سے خون بند ہو گیا لہٰذا ہم تمیز نہ کر سکے اور ان کھوجوں پر رومّا خواہ مخواہ بے نشان گمان چل پڑا ——— اللہ خیر کرے ——— مگر رومّا جنگل کا کیڑا ہے، بہرحال اس کے ہاتھ میں بجز ایک برچھے کے اور کوئی ہتھیار نہیں ہے، اور جیسے بھی ہو مجھے پہنچنا چاہیے مگر اب وہ مجھ کو نہیں مل سکتا۔ میرے اس کے درمیان کم از کم آٹھ دس میل کا فاصلہ پڑ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تو ہم متضاد سمتوں میں چلتے رہے اور اب اس فاصلہ کو پورا کرنا، میری ہمت بھی جواب دے گئی اور پاؤں بھی ——— اور سہ پہر ہو چکا تھا، تاہم مجھے اپنی جائے قیام پر پہنچنے کے لیے بڑی حد تک اسی سمت چلنا تھا لہٰذا ہم برداشتہ چلتا رہا اور میل بھر چلنے کے بعد میں نے اندازہ کیا کہ میرے قدم جیسے کسی اندرونی اور غیر معمولی قوت سے اتنے تیز اٹھ رہے ہیں کہ میرے ساتھی کو میرے دوش بدوش چلنا دشوار ہو گیا ہے اور اب تو ملنے کے سمجھانے کی بھی گنجائش نہ رہی۔ یہ کھوج مجھ کو براہِ راست اسی سمت لیے جا رہے تھے جہاں کراس ہوا تھا اور جب میں گھوم گھما کر پرکار کی طرح پھر اسی نقطہ پر پہنچ گیا جہاں سے رومّا علیحدہ ہوا تھا تو ہاتھی کے کھوجوں کے ساتھ رومّا کے کھوج بھی ملنے لگے اور میری ریڑھ کی ہڈی میں [illegible]

تقریباً تین چار گھنٹے ہو چکے تھے نہ روما پلٹا ہی تھا اور نہ کوئی سیٹی وغیرہ کی آواز سُنائی دی تھی۔ میں جیسے آگے آگے بیخودی اور پیچھے پیچھے ہوش، رونگٹے رونگٹے پر ایک کان اور ایک آنکھ لگائے دو میل اور پہاڑ کی جانب کو پلٹ گیا اور یک دم جو چند جھاڑیوں کی آڑ سے نکلا تو روما کے چیتھڑوں پر کھڑا تھا۔ الامان والحفیظ! پہاڑ سنگھ کا حال تو خیر گاڑی بانوں کی زبانی سُنا ہی تھا مگر اپنے ساتھی کے چیتھڑے اپنی آنکھ سے دیکھ لیے۔ چند منٹ ہم دونوں بہوت کھڑے رہے پھر ذرا سنبھل کر جائزہ لیا تو اندازہ کیا کہ انھی جھاڑیوں میں سو رہا تھا اور یک دم حملہ کر دیا۔ لاش بشرطیکہ اس کی ظاہری ہیئت سے اسے اس نام سے پکارا جا سکے تو دو بڑے حصوں میں تھی اور کھوپڑی شاید ایک ہی پنج میں کٹورے کی طرح یوں ہی سالم اتر کر دور جا پڑی تھی، خون کے ساتھ بھیجے کی پھٹکیں اور انتڑیاں اِدھر اُدھر منتشر تھیں اور جب زیادہ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ٹانگیں چیر کر ایک حصّہ سونڈ میں پکڑ کر درخت کے تنے پر پٹختا رہا ہے اور دوسرے حصّہ کو اگلے پاؤں سے روندتا کچلتا رہا ہے، میں نے کئی سال پیشتر ریل سے کٹی ہوئی ایک لاش دیکھی تھی لیکن اس کی بھی یہ گت نہ تھی۔ کپڑے کی طرح جسم سے پھاڑنا اور پھر پٹخنا اور کچلنا، مجھے جھرجھری آگئی —— اللہ اکبر ابھی دو گھنٹہ پیشتر ایسا ہٹا کٹا جھوما مجھ سے علیحدہ ہوا ہے اور ذرا سی دیر میں یہ دُرگت بن گئی۔

حالانکہ میں صبح کا ناشتہ کیے ہوئے تھا لیکن بنگلہ پہنچ کر بہ مشکل ایک پیالی کافی حلق سے اتار سکا۔ رات کا کھانا بھی کیمپ میں کچھ یوں ہی سا کھایا گیا اور روما کے اپنے لوگوں میں تو بڑا گہرا ماتم تھا، اطلاع پاتے ہی جمع ہو کر وہاں پہنچ گئے اور کریا کرم کیا۔

رات کو جب ذرا سہولت ہوئی اور ہم لوگ اپنی طبیعتوں کو یکسو کر کے جمع ہوئے تو سب خاموش تھے۔ جتامیاں کے چہرہ پر گہرے غم اور فکر کے آثار تھے اور بشرہ سے وہ کیفیت ظاہر تھی جو کسی بڑے فوجی سردار کے چہرہ پر اپنی فوج کے شکست کھا جانے پر ہو گی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں اب بھی پانچ آدم خور شیروں کے پوستین بچھے ہوئے تھے۔ انھوں نے شاید ہمارے چہروں سے ہراس کا اندازہ کر کے اپنا موڈ قصداً بدلا اور مخصوص استادانہ تیور بنا کر مہر سکوت توڑی۔

"بھئی لڑکو اس کا وقت آگیا تھا۔ تم نے بتایا نہیں کہ خواہ مخواہ کترا کر ان کھوجوں پر پڑ لیا اگر قاعدہ میں چلتا تو خیر دو گھنٹہ بعد مقابلہ تو ہوتا لیکن کم از کم دو رائفل تو ہوتے۔"

میں نے کہا "ہاں استاد ہوتے دو رائفل مگر کون جانے کیا نتیجہ ہوتا۔"

"اماں کیا بکتے ہو، اتنا چھوٹا دل کرتے ہو، نتیجہ یہ ہوتا کہ تمھارے رائفلوں کی چاروں گولیاں پیوست ہو جاتیں اور ہاتھی ڈھا دیا ہوتا۔"

اور کسی نے کہا "استاد یہ بہت ہراساں ہیں۔ ان کے ساتھ سے وہ شامت زدہ خواہ مخواہ کٹ کر ان کھوجوں پر پڑ لیا اور پھر ذرا دیر بعد انھوں نے اس کے چیتھڑے دیکھ لیے۔"

"وہ تو میں نے کہا نہیں بھئی اس کا وقت آگیا تھا اور اسی بہانے آگیا تھا لیکن ایک بات تم سب لوگ یہ بھی سمجھ لو کہ یہ ذرا سنگین موقع ہے۔ وہ آدم خور شیر والی بات نہیں ہے۔ تم میں سے بعض تو آدم خور شیر کے شکار میں میرے ساتھ بھی رہے ہیں۔ اور بھی صاف بات یہ ہے کہ ہم کو خونی ہاتھی تو درکنار کسی سیدھے سادے ہاتھی کے شکار کا بھی تجربہ نہیں ہے اور یہ ہمارے جنگل میں تو

پہلی مرتبہ ہاتھی خونی ہوا ہے ورنہ زیادہ سے زیادہ شکایتیں فصلوں کو اجاڑنے کی کان میں آیا کرتی تھیں — اور اس نے تو قیامت ہی برپا کر دی لہٰذا میدان چھوڑ کر جانے کا سوال نہیں اور رہی ہم کھوج لے کر اور تعاقب کر کے زمین سے آدم خور شیر کو تو مارنا آسان اور محفوظ سمجھتے ہیں لیکن ہاتھی پر یوں چلنا برابر کا معاملہ ہے اور سر ہتھیلی پر رکھ کر شکار کرنا ہے۔"

"کیوں استاد!" ایک نوجوان جوشیلے ساتھی نے کہا۔

"سنو میاں! یوں کہ آپ کے یہ 450 اور 570 بور کے بھاری رائفل نہیں بلکہ چھ انچ کے دہانے کی توپ ہی کیوں نہ ہو لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتے ایک وار میں ہاتھی ڈھیر ہو جائے گا۔ معمولی ہاتھی آپ کے رائفل کی کاری گولی کھا کر بالعموم بھاگ کر گرے گا اور خونی آپ پر حملہ کر دے گا، رہا شیر کیسا ہی پھرتیلا اور طاقتور کیوں نہ ہو یہ رائفل تو بڑی چیز ہیں 375 بور کی ایک گولی میں خواہ کہیں پر کیوں نہ پڑے ایک اچھی پیچ تو کھا ہی جاتا ہے — اور رہا ہاتھی تو بڑی ہوئی چٹان ہے، گرتے گرتے بھی آپ کو سمیٹ لینا معمولی بات ہے۔"

"تو پھر کیا کریں استاد! یہ تو گرم دودھ بن گیا نہ اگلنے کا نہ نگلنے کا، کیا میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں؟"

"لاحول ولاقوۃ! میں یہ کہتا ہوں، میاں میرا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں بچائیے۔"

"تو پھر آپ ہی کوئی صورت نکالیے۔ آخر خونی ہاتھی کس طرح مارا جاتا ہے۔"

"بھئی وہ جیسے بھی مارا جاتا ہو ہم نے دیکھا نہیں بس سنا ہی سنا ہے اور جو کچھ سنا ہے اس کے ہم قائل نہیں۔ میرے چالیس سالہ تجربہ میں آج پہلی مرتبہ خونی ہاتھی سے واسطہ پڑا ہے۔ ریاست میسور اور آسام وغیرہ کے دوستوں سے کچھ واقعات سنے ہیں جن پر عمل کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں یہ آج ہی حماقت ہو گئی کہ تم سب کو کھوجوں پر ایسے چلتا کر دیا جیسے سانبھر کا پیچھا کر رہے ہیں ورنہ بجبر گزشتہ اسی بیچارے پر بیتی۔"

"تو پھر کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ تو اب سر پڑ گیا۔" رینجر نے ذرا ہمت کر کے کہا۔

"بابو جی آپ پریشان نہ ہوں ہمیں سبھی کچھ کرنا پڑے گا یہ تو اک ذرا سا ہاتھی ہے یہاں تو پہاڑ ہی ڈھا کر پھینک دیں اور سرکشی اور آدم کشی کی پاداش میں تو بڑی بڑی سلطنتیں وقت آنے پر اکھیڑ کر پھینک دی جاتی ہیں۔" ججا میاں نے کہا۔

اور رینجر کھسیا سا پڑا اور بڑے خوشامدانہ لہجہ میں بولا۔ "ہاں میاں! میری روزی پر بات آئی ہے آپ تو خدا کے فضل سے رئیس ہیں کھیلنے چلے آتے ہیں اور میں آپ ہی سے لَو لگائے بیٹھا ہوں۔ اگر آپ لوگ ہٹ گئے تو پھر کوئی نظر نہیں آتا۔"

"ارے مردے آدمیوں تم بھی کیا بات کرتے ہو۔ تمہاری روزی کا معاملہ ہے اور ہمارا فرض ہے۔" خانصاحب محمود خاں نے کہا اور پھر استاد ججا میاں کی جانب دیکھا جو گہری سوچ میں تھے۔

اور ماک ذرا سکوت رہا اور ججا میاں بولے: "دیکھو بھئی لڑکو تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم شیر کے شکاری ہیں اور اس ہاتھی کو بھی اسی طریقہ سے ماریں گے جیسے شیر کو مارتے ہیں۔"

سب لوگ ذرا حیرت کے ساتھ ان کی جانب دیکھنے لگے اور شاید سب کے دماغوں میں شیر کے شکار کے جتنے طریقے ہیں سب گھوم گئے اور بات سمجھ میں نہ آئی بھلا شیر کے شکار کا کون سا طریقہ خونی ہاتھی مارنے میں اختیار کریں گے" اور تو کوئی نہ بولا محمود خاں

ان سے ذرا آزادمنش تھے بولے "میاں کیا ٹھنکا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"مچان پر بیٹھ کر اور کل باندھ کر۔" مجا میاں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

سب مسکرا پڑے اور خانصاحب محمود خاں نے کہا "ہاں تو پھر یہ ٹھیک ہے۔"

"ہاں محمود خاں مچان پر بیٹھ کر اور کل باندھ کر ماریں گے انشاء اللہ، اور شیر کی موت نہیں کتّے کی موت ماریں گے۔"

سب ان کی جانب جیسے کوئی عجوبہ بات سننے کے منتظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ایک پان اٹھا کر چبایا، دو کش حقّے کے لگائے، یہ کسی بڑی زور دار اسکیم کو ظاہر کرنے سے پیشتر ان کا مخصوص انداز ہوا کرتا تھا۔ پھر ایک گھونٹ سا لیا اور نہایت خود اعتمادانہ تیور بنا کر بولے "انشاء اللہ اکڑا ان چٹانوں میں مارا جائے گا جہاں وہ گڑ کی گاڑی والا لونڈا بھاگ کر چھپا تھا اور وہیں کل کے طور پر نزاکت باندھی جائے گی۔"

اور محمود خاں چونک پڑے "ایں نزاکت! نزاکت کیا کرے گی۔"

"میں نے کہا نہیں جو کچھ کرے گی وہ آپ دیکھ ہی لیں گے۔ کل علی الصبح رقعہ بھیج کر ملوا لیجئے۔"

اور تیسرے ہی روز نزاکت ڈاک بنگلہ پر موجود تھی۔ مجا میاں نے اس دوران میں جاسوسی بہت تیز کرا دی تھی اور کئی بار چٹانوں کا معائنہ کیا تھا اور پتھروں میں بیٹھنے کے لیے نشستیں تک الاٹ کر دی تھیں۔ اکڑا اسی نواح میں تھا اور دیوانگی بدستور تھی۔ شروع رات کے حصّے اندھیرے ہوتے تھے اور نصف شب سے قبل چاندنی نکل آتی تھی۔

چار نہایت موٹی ہاتھی کی طاقت سے باہر زنجیریں نزاکت کے چاروں پاؤں میں ڈال دی گئیں۔ اگلے پاؤں والی دونوں قریب کے دو درختوں کے ساتھ اور پچھلی چٹانوں کی نکلی ہوئی دو نوکوں میں اٹکا دی گئیں اور اس طرح نزاکت کو تقریباً اچھی طرح کس دیا گیا۔ ہم لوگ ایسی راتوں کا مخصوص ہلکا پھلکا کھانا کھا کر سرِ شام ہی سے وہاں پہنچ گئے۔ ان چٹانوں کا ہر حصّہ کئی مرتبہ جا کر معائنہ کر چکے تھے اور ان کے حدودِ اربعہ، رُخ اور ہاتھی کی جولانگاہ ہر چیز پر غور و بحث کر کے ہر ایک کی نشست پہلے سے طے تھی۔ ان چٹانوں کے چاروں طرف اونچا نیچا جنگل تھا۔ تین سمت یہ جنگل لامتناہی میدان پر تھا اور شمال کی جانب دس بارہ میل تک پتھریلے کنکریلے اونچے نیچے میدان کی شکل میں تھا جس میں جگہ جگہ ہمیشہ پانی سے لبریز رہنے والے جوہڑ اور ٹھہرے ہوئے چشمے اور جھرنے تھے اور بڑا گھنا جنگل تھا اور اس کے بعد عظیم پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہم لوگ ان چٹانوں میں پروگرام کے مطابق اپنی اپنی متعینہ جگہوں پر جا کر دبک گئے۔ یہ چٹانیں تقریباً تین چار پانسو مربع گز پر ایک اونچے نیچے سلسلہ میں پھیلی ہوئی تھیں کہیں کہیں پر ڈگر کی زمین سے دس بارہ گز اور کہیں پر پانچ چھ گز بلند تھیں اور شمال کی جانب کو آہستہ آہستہ ڈھلوان کی شکل میں اترتی ہوئی پتھریلے میدان سے مل گئی تھیں۔ ہم نے اچھی طرح پڑتال کیا تھا کہ ان کا ہر حصّہ بلندی کے اعتبار سے ہاتھی کی سونڈ کے حملہ یا شامہ کی رسائی سے باہر تھا اور جو حصّہ ڈھلوان کی شکل میں میدان سے ملا ہوا تھا اس جانب سے بھی اگر ہاتھی چڑھنے کی کوشش کرتا تو چند گز چل کر چڑھنے

سے معذور ہوتا۔ کہیں دس گیارہ بجے کے درمیان چاند نمودار ہوا، کٹا ہوا، اداس اداس، تیسرے ہفتہ کا بے نور بیمار سا چاند اپنی کمزور کرنیں مہیب جنگل پر پھینکنے لگا اور جیسے ہر چیز کو منور کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اداس چاندنی نے پسار لیا اور جگہ جگہ چیزیں واضح سی ہونے لگیں اور ہم نے زیادہ قاعدہ اور احتیاط کے ساتھ اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔

یوں تو ہمارے شاطر شکاری جاسوس جو سایہ کی طرح اکثر ان کے ساتھ لگے رہتے تھے سہ پہر ہی سے ہوا کا رُخ، قرائن اور اکا دکا رجحان بھانپ کر اندازہ کر لیتے تھے کہ آج رات کی چرائی کو کدھر جائے گا، کون سے راستہ سے جائے گا اور کس راستہ سے پلٹے گا، اور یہ تقریباً سو فی صدی صحیح ثابت ہوتا تھا لیکن آج خلافِ معمول سرِ شام ہی سے ہوا پلٹ گئی ہمارے آدمیوں کا اندازہ غلط ہو گیا۔ اکثر اکسی دوسری جانب فصلوں کی خوشبو لے کر چل دیا اور پھر نراکت کی خوشبو بھی نہ لے سکا ورنہ ہم کو امید تھی کہ شروع شب میں ہی بجائے کھانے کے پینے چلنے کے اِدھر آئے گا۔

جنگل کی رات جھنجھناتی رہی مخصوص چڑیا بولتی رہی، تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہیں کہیں گیدڑ ٹھہر کتے رہے، آدھی رات گئے ایک کاکڑ بھونکا اور اس کے بعد چند چیتل یکدم چلا پڑے، شیر بار قسم کے شکاری مجا میاں کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے اشارہ سے بتایا اور پھر ایک مخصوص راستہ پر کسا بھر اور چیتل اور کاکڑ کی آواز پر اشارہ کرتے رہے اور بتایا کہ شیر پاگل مار حرکت میں ہے اور پھر آوازوں کے ساتھ ساتھ جیسے اس کے راستہ پر اس کی سمت انگلی سے اشارہ کر کے اس کی سمت اور رُخ کا تعین کرتے ہوئے ہم سب کو بتاتے رہے اور پھر سناٹا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ہماری چٹانوں سے قریب ہی ایک گوند (بارہ سنگھا) ہو گا، جس کی مہیب آواز بڑی دیر تک ہمارے سینوں کو دہلاتی رہی اور ہم ایک خوف یا بیزاری جیسے مبہم احساس سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کی جانب بار بار دیکھ لیتے اور یہاں تک کہ رات بیت گئی۔ زوالِ ماہ کی تاریخوں کا چاند اپنی رہی سہی کمزور روشنی کھونے لگا، سمجھے نراکت تمام رات سوند لہرا لہرا کر نہ معلوم کیا کیا خوشبوئیں اور بوئیں لیتی رہی اور جنگل کی ہوا سے کھیلتی رہی اور ادھر ہم لوگ بیٹھے جھک مارتے رہے چٹانیں یخ ہو گئیں، صبح کی مخصوص خنکی نے فضا پر مسلط ہو کر کچھ ہمارے محسوسات کو بھی بدل دیا اور ہم کو ہلکی ہلکی سردی سی لگی — اور اتنے میں قریب کے درختوں سے کسی مرغے نے بانگ دے دی اور اس کے بعد دوسرے نے اور پھر تو شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک ہر مرغا بول پڑا اور ان کی قریب و دور کی آوازوں کا سلسلہ ہمارے کانوں میں جنگل کے مختلف حصوں کا جغرافیہ ملا ملا کر نقشہ سا کھینچنے لگا اور پھر تیتر چیخ اٹھی، کہیں کہیں سے کووں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں سپیدۂ صبح نمودار ہوا اور یکدم شمالی ہوا ٹھہر گئی اور پھر آہستہ آہستہ پچھیاؤ چلنے لگا، جیسے ہماری رگ رگ چائے مانگنے لگی۔ سب نے اپنے اپنے تھرموس کھول کر جلدی جلدی ایک ایک پیالی چائے انڈیلی۔ چائے صبح کی روشنی، ہوا کی تبدیلی، چڑیوں کی آوازیں اور ساتھیوں کی کسلمندی نہیں لیکن چہروں کے واضح نظر آنے نے ہم سب کے محسوسات بدل دیے اور جیسے نئے وقت کے ساتھ نئی امیدیں بندھ گئیں حالانکہ ساتھ ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ یہ اس وقت بدلے ہوئے ماحول کا اثر ہے ورنہ گیارہ گھنٹے انتظار کے بعد بھلا اب کیا امید ہو سکتی تھی کہ ان چند ساعتوں میں آ جائے گا مگر میں نے مجا میاں کے تیوروں میں کچھ خود اعتمادی اور کچھ اطمینان کی نشانیاں دیکھیں وہ اس وقت بڑا لطف لے لے کر پان چبا رہے تھے اور انھوں نے ایک مرتبہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بڑی خاص امید بندھائی تو ہم سب سنبھل گئے۔

ہمارے ساتھ چار جوڑے .450/400 بور کے دونالے ویسٹلی ریچرڈ کے کارخانے کے بنے ہوئے رائفلوں کے تھے اور ایک جوڑا پرانے .577 بور کے رائفلوں کا تھا۔ تین سائڈیں جن پہ کافی غور و خوض کے بعد ہم لوگوں نے رائے قائم کی تھی کہ انہی میں سے کسی پر اکڑا آئے گا جتا میاں نے ہم تین شکاریوں کو دے دی تھیں اور وہ خود شاید اس وقت شکار کرنا تو درکنار بندوق پکڑنے کے موڈ میں بھی نہ تھے، حالانکہ بڑا .577 بور تھامے ہوئے تھے اور ایک درمیانی جگہ میں جیسے ہم سب کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی جو .450/400 دبائے ہوئے تھے خود خاں صاحب محمود خاں تھے، شکاری بہت کم اور نشانہ باز بہت بڑے، اور میں نے غور کیا کہ ایسے اچھے موقع پہ ہوتے ہوئے بھی اور پھر اکڑا سے "رقابت" قسم کی دشمنی ہونے کے باوجود ان کے اندر شکاریوں والی گدگدی پیدا نہ ہو سکی تھی لہٰذا وہ بیچارے خود ہی ایک ایسی جگہ پر بیٹھے تھے جہاں ہاتھی کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ بقیہ دو اور ساتھی جو مناسب پوزیشن لیے ہوئے تھے اور .450/400 بور کے رائفلوں کی جوڑیاں لیے ہوئے تھے ان میں سے ایک تو مسٹر RITE ایک انگریز انجینئر تھے جو حال ہی میں ریاست کے اندر بھاری مشاہرہ پر گورنمنٹ آف انڈیا سے مستعار لیے گئے تھے۔ ان کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ آسام اور برما کے جنگلوں کے کھیلے ہوئے ہیں اور کئی ہاتھی بھی شکار کر چکے ہیں لیکن پہلے تو انگریز ہونے کے سبب پھر گورنمنٹ آف انڈیا کے بھیجے ہوئے آدمی ہونے کی وجہ سے ہماری نگاہوں میں ان کی پوزیشن یوں بھی مشتبہ مشتبہ اور نامانوس سی تھی، پھر کچھ کم آمیز اور کم سخن بھی واقع ہوئے تھے جو غالباً اپنے دور میں ان کا نسلی اور سیاسی تقاضا رہا ہوگا لہٰذا یہ شکاری پہلو بھی مشتبہ ہی سا تھا اور وہ ہم کو جچ نہ رہے تھے۔ تیسرے ہمارے پرانے ساتھی اور بڑے ٹھنڈے اور اونچے شکاری سنگھ بابو تھے۔ یہ رام پور کی سرحد پر ضلع بدایوں کے ایک خوشحال زمیندار تھے لیکن حضرت ہاتھی کے شکار کو پہلی مرتبہ آئے تھے۔ جتا میاں نے اشارہ سے ہماری پوزیشنیں از سر نو ترتیب دیں اور یک دم تمام جنگل بقعۂ نور بن گیا۔ مشرق سے قرمزی تابناکیوں کا طوفان پھوٹ پڑا جس کے انعکاس سے مغرب میں کچھ آوارہ بادلوں میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ شمال میں سر بہ فلک برف کی چوٹیاں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ پتہ پتہ پر اوس کے قطرے خون کی بوندوں کی طرح معلوم ہونے لگے اور ہلکی ہلکی نرم رو ہوا کے ساتھ جیسے پتہ پتہ لوٹا لوٹا خون کے آنسو رونے لگا اور اوپر سے نیچے تک تمام ماحول ایسے دمک اٹھا جیسے خون کی بارش ہو چکی ہے ہم لوگ نگاہیں دور تک تو پھینک ہی نہ سکتے تھے، جھاڑیوں اور درختوں کے ایک قلعہ میں محصور تھے اور اس محدود ماحول میں فطری طور پر آوارہ نگاہیں ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں لیکن جتا میاں بڑی غائر نگاہ سے نزاکت کے رونگٹے رونگٹے کا جائزہ لے رہے تھے جیسے ایک ماہرِ نفسیات و قیافہ شناس کسی کے خد و خال و جذبات کو پڑھ رہا ہو اور میں نے غور کیا کہ آہستہ آہستہ جتا میاں پر کچھ بدلتی ہوئی اضطراری کیفیات طاری ہو رہی ہیں اور ایک دو مرتبہ انھوں نے اشارہ سے ہماری توجہ نزاکت کی جانب دلائی تو ہم کچھ نہ سمجھے، بجز اس کے کہ کچھ غیر معمولی بے چینی سی ہے جس کو ہم یہ سمجھے تھے کہ یہ صبح نکل آنے کے سبب سے شاید بھوکی ہے یا ٹھکانے پر پہنچ کر آرام کی خواہش مند ہے لیکن چند منٹ بعد وہ سرک کر میرے پہلو میں آ بیٹھے، اور بالکل نزاکت ہی پر نگاہیں مرکوز کر دیں اور پھر اس کی حرکات و سکنات سے انھوں نے اندازہ کر کے ایک مخصوص سمت کو بار بار نگاہ اٹھائی اور مجھ کو ابرو کے اشارہ سے کچھ بتانے کی کوشش کی جس کو میں قطعاً نہ سمجھا لیکن اور بھی زیادہ تیقّظ

ہو کر سنبھل گیا۔

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی تابناک پیشانی نمودار ہوئی اور چند ساعت میں گول گول دمکتا ہوا دائرہ میرے داہنے ہاتھ پہ ابھر آیا' آفتاب نکلا اور بھرپور چاروں طرف زندگی اور زندگی ہی زندگی ناچنے لگی اور زندگی کے اس رقص میں ہم سب چونک پڑے۔ میرے داہنے ہاتھ پر بڑی دور سے کچھ آوازیں سی بلند ہوئیں اور چند ہی ساعت میں یہ آواز واضح ہوگئی۔ شاخوں' جھاڑیوں کے اندر اور سوکھی پتیوں کے اوپر ہاتھی کے چلنے کی مخصوص آواز — ہاتھی حرکت میں ہے!! — ہم سب بھرپور بن گئے اور جیسے سب دم بخود ہو کر ایسے جامد ہو گئے جیسے انہی چٹانوں ہی کے پتھر ہیں۔ نزاکت اور بھی زیادہ بےچین ہوگئی' آہستہ آہستہ سریلی آواز نکالنے لگی۔

آواز کے ساتھ سمت کا تعین تو کر لیا لیکن قطعی طور پہ یہ سمجھ میں نہ آسکتا تھا کہ کس کے ہاتھ پر نمودار ہوگا' اس لیے کہ آواز ہر چند قدم کے بعد تھوڑا تھوڑا رُخ بدل رہی تھی اور ہر شکاری کے سامنے اس کی سائڈ پر نمودار ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اب تک تو مچانیاں سے سامنے نزاکت جیسے ہوائی جہاز کا راڈر بنی ہوئی تھی اور وہ اس کی حرکات سے طوفان کی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب نگاہیں آواز کی سمت لگی ہوئی تھیں اور بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ اس مخصوص پوائنٹ کے تعین کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جہاں پر ہاتھی کے سامنے آنے کا یقینی امکان ہو سکتا تھا' ہمارے اس قلعہ کی شاداب چار دیواری کہیں پر بھی سو گز سے زیادہ نہ تھی اور کہیں کہیں پر ہم سے تیس چالیس ہی گز کا فاصلہ تھا۔

آوازیں زیادہ واضح ہوگئیں۔ ہاتھی بالکل ہی قریب آگیا لیکن اب بھی چال کا رُخ قطعی طور پر متعین نہ ہو سکا۔ مگر مچانیاں نے مجھ کو ہوشیار ہونے کا خاص طور پر اشارہ دیا اور کھسک کر بالکل ہی میرے پہلو میں آ بیٹھے — اور اب جنگل منور ہو چکا تھا تقریباً چالیس گز کے فاصلہ پر بانس کی دو جھاڑیوں پر چڑھی ہوئی بن توری کی بیل درہم برہم ہوئی' پتیاں بڑے زور سے چرچرائیں اور نیچے پڑے ہوئے سوکھے بانس پٹاخوں کی طرح چیخ اٹھے اور بیلوں اور جھکی ہوئی شاخوں کے درمیان پہلے کالی کالی جھلک سی نظر آئی اور اکڑا سامنے بڑھتا دکھائی دیا اور یہ میری بڑی اچھی سائڈ پہ تھا' اور وہ جیسے نشہ میں جھومتا بڑے والہانہ انداز میں بڑھا۔ بچھڑی ہوئی محبوبہ سے نگاہیں چار ہوتے ہی مخصوص پیار بھری آواز نکالی جس کا بڑے ناز کے ساتھ حلق سے ترنا سی بجا کر نزاکت نے جواب دیا۔ دونوں جانب بھولی بے پایاں عیش کوشیوں اور عشق و محبت کی بے حد و حساب فردوسیں محفل آرائیوں کی رنگین ابدی یاد میں تڑپ اٹھیں۔ دونوں ہمہ تن شوق دونوں مجسم خوش آمدید بن گئے۔ صبر و شکیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نگاہیں ملیں، سانسیں ملیں اور دو بچھڑے ایک دوسرے سے ملنے کے لیے دیوانہ وار بڑھے اور یہ تو ٹھٹک کر رہ گئی اور وہ مصافحہ کے لیے سونڈا اٹھا کر لپکا۔ لبیک اور خوش آمدید اور خوش آمدید و لبیک کی پیار بھری آوازوں کے تبادلہ سے جیسے جنگل میں ارغنوں بج اٹھے۔ وہ بڑھا' اس نے آغوشِ محبت وا کر دی۔ نشہ تندتر ہوگیا۔ یہ تو بندھے ہی بندھے جھومتے جھومتے رقص سا کرنے لگی اور اکڑا کی تند ہوائی چال چہلوں سے محبوبہ کی زلفِ عنبریں کی خوشبو پرست شرابی کی طرح چلا آرہا تھا بالکل ہی بہک گئی اور وہ تو اپنی حجلۂ عروسی کی بچھڑی دلہن کو دیکھ کر دیوانہ سا ہوگیا۔ بڑے پیار کے ساتھ پوری اونچائی تک سونڈا اٹھائی' ادھر سے نزاکت نے بڑے ناز کے انداز میں اک اسٹائل کے ساتھ اپنی سونڈ بلند کی اور ایسی

پانچ گز کے فاصلہ سے اوپر ہی اوپر فضا میں پہلا مصافحہ ہونے ہی والا تھا کہ اکڑا کے تقریباً پورے کھلے ہوئے منہ کے اندر پندرہ گز کے رینج سے میں نے 400/450 ۰ کی گولی غپ سے گھسیڑ دی۔ دھماکے کے ساتھ نقشہ یک دم پلٹا، عشق و رومان یہ یک ثانیہ قہر و غضب میں تبدیل ہو گیا اور اکڑا ایسی نازک جگہ پر شدید چوٹ کھا کر توازن برقرار نہ رکھ سکا جیسے منہ کے بل گرتے گرتے سنبھلا، کچھ اگلے پاؤں جھکے اور اس کے ساتھ سر اور کوتاہ گردن اک ذرا جھکی اور یہیں پر میں نے بڑا عجیب سا پوائنٹ پا کر عین سر اور گردن کے اتصال پر دوسری گولی تقریباً اس مقام پر جڑ دی جہاں فیل بان بیٹھتا ہے۔ پھر بھی وہ کچھ سنبھل کر جہاں کا تہاں مڑ گیا لیکن مڑتے مڑتے ادھر جما میاں نے کہا "واہ بیٹا! بہت اچھے! اک اور" اور ان کے ہاتھ کا 577 ۔ بور مشینی انداز میں میری گرفت میں آ گیا اور ہاتھی کے شکار کا بہترین پوائنٹ زد میں تھا ـــ اور تیسری شست میں نے کان کے پیچھے جوف میں گردن اور بالائی جبڑے کے جوڑ پہلے کر لبلبی دبا دی۔ خیر گھوم تو گیا لیکن گھوم کر اسی چکر میں ارا ارا دھڑام پہاڑ کا پہاڑ ڈھے کر جا پڑا اور گرتے گرتے میں نے بائیں نال والی گولی بھی چپکا دی اور ساتھ آن ہی عشق و رومان کی داستان ختم ہو گئی ۔

گل گامش کی داستان[1]

سید سبطِ حسن

ابتدائیہ

گل گامش، فرمانروائے عروق

ستائشِ بے حساب گل گامش، آقائے کُلاب کی جو جہاں بیں تھا۔
یہ وہ فرماں روا تھا جو روئے زمیں کے سبھی ملکوں کی خبر رکھتا تھا۔
وہ عاقل تھا، واقفِ اسرار اور دانائے راز تھا۔
وہ ہمارے لیے سیلاب سے پیشتر کی ایک داستان لایا،
وہ ایک لمبے سفر پہ گیا۔
اور جب خستہ و درماندہ واپس ہُوا تو پُورا قصہ پتھر پہ کندہ کروا دیا۔
گل گامش کی تخلیق دیوتاؤں نے کی،
اُنھوں نے اُسے جسدِ کامل بخشا،
شمس نے حسن سے نوازا۔
اور طوفان کے دیوتا اداد نے جرأت عطا کی،
عظیم دیوتاؤں نے اُس کے جمال کی تکمیل کی
اور وہ سب پر سبقت لے گیا۔

---

[1] اس داستان کا متن مہ نقوش کے شمارہ نمبر ۹۱ میں پیش کیا جا چکا ہے ــــــ یہ داستان اٹھائیسویں صدی قبل مسیح کی ہے اور گل گامش جنوبی عراق کی ایک ریاست عروق کا فرمانروا تھا۔ (س ۔ ح)

انھوں نے اُسے دو تہائی دیوتا بنایا اور ایک تہائی انسان۔
اُس نے عروق کی فصیلیں بنوائیں،
شہر کو پشتوں سے محفوظ کیا
اور آکاش کے دیوتا آنو اور محبت کی دیوی عشتار کے لیے
ای آنا کا مقدس معبد تعمیر کروایا۔
شہر پناہ کی دیوار پر نظر ڈالو!
اُس کی کگر تانبے کی طرح جھلکتی ہے۔
اور اندرونی دیوار کو دیکھو جس کی نظیر نہیں
آستانے کو چھوؤ جو بہت قدیم ہے۔
ای آنا کے قریب جاؤ جو عشتار کا مسکن ہے۔
اُس کی ہمسری نہ کبھی کوئی بادشاہ کر سکے گا، نہ کوئی انسان۔
عروق کی دیوار پر چڑھو، اور میں کہتا ہوں کہ اُس پر چلو بھی۔
کرسی کے چبوترے کو غور سے دیکھو
اور چنائی کو جانچو۔
کیا یہ چنائی پکی اینٹوں سے نہیں ہوئی ہے؟
کیا سات عارفوں نے اس کی بنیاد نہیں رکھی؟

پہلا باب

اِن کِدُو کی آمد

گِل گامش ملک سے باہر دُور دُور تک گھوما
مگر اُسے اپنے اسلحوں کا ایک حریف بھی نہ ملا
اور وہ عروق واپس آیا۔
لیکن عمائدینِ شہر اپنے دیوان خانوں میں پریشان و ملول بیٹھے تھے۔
اُن کو شکوہ تھا کہ گِل گامش مقدس طبل کو اپنی تفریح کے لیے بجواتا ہے۔
اُس کا گھمنڈ، دن ہو یا رات، سدا بے لگام رہتا ہے۔
کیا یہی وہ گِل گامش ہے، پشتوں سے محفوظ عروق کا پاسبان؟

کیا یہی وہ ہمارا رکھوالا ہے، دلیر، دبنگ اور دانا؟
گل گامش کسی بیٹے کو باپ کے پاس نہیں رہنے دیتا۔
گل گامش کی ہوس کسی کنواری لڑکی کو اپنے عاشق کے پہلو میں نہیں بیٹھنے دیتی،
سورما کی بیٹی ہو یا رئیس کی بیوی، وہ کسی پر ترس نہیں کھاتا۔
دیوتاؤں نے اہل بابل عروق کا ماتم سنا تو
خداوندِ عروق، اَنُو سے فریاد کی:
"کیا اَرُورُو نے اس جنگلی سانڈ کو نہیں جنا تھا؟
اس کے اسلحوں کا کوئی حریف نہیں۔
گل گامش مقدس طبل کو اپنی تفریح کے لیے بجواتا ہے۔
گل گامش کسی بیٹے کو باپ کے پاس نہیں رہنے دیتا،
اس کا گھمنڈ، دن ہو یا رات، سدا بے لگام رہتا ہے۔
کیا یہی وہ گل گامش ہے، پشتوں سے محفوظ عروق کا پاسباں؟
کیا یہی اُن کا رکھوالا ہے، دلیر، دبنگ اور دانا؟
گل گامش کی ہوس کسی کنواری لڑکی کو اپنے عاشق کے پہلو میں نہیں بیٹھنے دیتی۔
سورما کی بیٹی ہو یا رئیس کی بیوی، وہ کسی پہ ترس نہیں کھاتا،
اَنُو نے اُن کی فریاد سن لی
اور دیوتاؤں نے تولید کی دیوی اَرُورُو کو طلب کیا:
"اَرُورُو! تُو نے اِس کو جنا تھا،
اب تُو ہی اِس کا ہمسر بھی پیدا کر۔
وہ گل گامش سے مشابہ ہو جیسے اُس کی پرچھائیں۔ اُس کا ہمزاد،
طوفانی قلب کا جواب طوفانی قلب۔
تب وہ دونوں باہم نبرد آزما ہوں تاکہ عروق عافیت سے رہے۔"
پس اَرُورُو نے اپنے ذہن میں ایک پتلا بنایا
جس میں آکاش کے دیوتا اَنُو کا جوہر تھا۔
اَرُورُو نے اپنے ہاتھ پانی میں تر کیے۔
تھوڑی سی گیلی مٹی لی اور صحرا میں پھینک دی
اور تب بہادر اِن کدو پیدا ہوا۔

اُس میں جنگ کے دیوتا نی نورتا کے سب اوصاف موجود تھے۔
اُس کا جسم کھردرا تھا۔
اُس کے سر کے بال عورتوں کی مانند لمبے تھے
اور اُن میں اناج کی دیوی نسابا کی طرح لہریں اٹھتی تھیں۔
اُس کا بدن مویشیوں کے دیوتا سموقان کی مانند چٹائی نما بالوں سے ڈھکا تھا۔
وہ نہ انسانوں سے واقف تھا نہ مزروعہ زمین سے۔
اِن کید غزالوں کے ہمراہ گھاس چرتا
اور جنگلی جانوروں کے ساتھ چشمے پر کودتا پھرتا
اور جانوروں کے ساتھ پانی میں چہلیں کرتا رہتا۔
تب ایک دن ایک بہلیئے نے اُسے چشمے پر دیکھا،
اور دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی۔
بہلیئے کا چہرہ خوف سے فق ہو گیا۔
وہ اپنے ڈیرے کو لوٹ گیا۔
دہشت کے مارے اُس کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔
اُس کا حلیہ دور سے آنے والے مسافر کی مانند تھا۔
اُس نے ہیبت بھرے دل سے اپنے باپ سے کہا:
"باپ! ایک آدمی ہے مگر دوسروں سے نرالا۔
وہ پہاڑ پر سے آتا ہے۔
وہ دنیا کا سب سے قوی انسان ہے۔
اُس میں انو کا جوہر گھس گیا ہے۔
کبھی وہ کوہساروں پر جنگلی جانوروں کے ساتھ گھومتا اور گھاس چرتا ہے
اور کبھی وہ ہمارے علاقے میں چشمے کے پاس آتا ہے۔
میں اُس سے ڈرتا ہوں اور اُس کے قریب جانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔
میں نے جو گڑھے کھودے تھے اُس نے انھیں پاٹ دیا ہے
اور میں نے جو جال لگائے تھے انھیں توڑ ڈالا ہے۔
وہ جانوروں کو بھاگنے میں مدد دیتا ہے
اور شکار میرے ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں۔

اُس کے باپ نے بولنے کے لیے مُنہ کھولا اور کہا :

" میرے بیٹے ! عروق میں گل گامش رہتا ہے ۔
آج تک کسی نے اُسے زیر نہیں کیا ہے ۔
اُس میں اُنو کے جوہر کی سی توانائی ہے ۔
اُٹھ اور عروق کی راہ لے
اور گل گامش سے اِس جنگلی آدمی کی طاقت کا حال بیان کر
اور عشتار کے مندر کی ایک دیوداسی مانگ ۔ دوشیزۂ عیش ۔
وہ اپنی نسوانی دلکشی سے اِس آدمی پر غالب آئے گی ۔
جب وہ چشمے پر پانی پینے آئے گا تو
دیوداسی اپنے کپڑے اُتار دے گی اور اپنی بھرپور جوانی کو عُریاں کر دے گی
اور وہ اِس عورت کو دیکھتے ہی اُس کی طرف لپکے گا ،
تب جنگلی جانور اُس سے دُور بھاگ جائیں گے "
شکاری نے باپ کا مشورہ قبول کیا
اور سفر پر روانہ ہو گیا
اور عروق پہنچ کر گل گامش سے ملا اور کہا :
" گل گامش ! ایک آدمی ہے دوسرے آدمیوں سے نرالا ۔
وہ چراگاہوں میں گھومتا پھرتا ہے ۔
وہ ستارۂ فلک کی مانند قوی ہے
اور میں اُس کے قریب جاتے ڈرتا ہوں
وہ میرے شکار کو بھاگنے میں مدد دیتا ہے
وہ میرے گڑھوں کو پاٹ دیتا ہے
اور جال کی رسیاں توڑ دیتا ہے "
گل گامش نے شکاری سے کہا :
" دیوداسی کو اپنے ساتھ لے جا ، دوشیزۂ عیش کو ۔
چشمے پر وہ اُس سے ہم آغوش ہوگا
اور تب جنگلی جانور اُس سے دُور بھاگنے لگیں گے "
شکاری نے دیوداسی کو ساتھ لیا اور روانہ ہو گیا ۔۔

تین دن کی مسافت طے کر کے وہ چشمے پر پہنچے ،
شکاری اور دیوداسی آمنے سامنے بیٹھ گئے اور شکار کا انتظار کرنے لگے ۔
پہلے دن اور دوسرے دن وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے انتظار کرتے رہے ۔
تب تیسرے دن جنگلی جانور چشمے پر پانی پینے آئے
اور ان کِدّو بھی اُن کے ہمراہ تھا ۔
اور دیوداسی نے جنگلی آدمی کو کہسار سے میدان میں آتے دیکھا
اور بہلئے نے دیوداسی سے کہا :
" وہ ہے تیرا آدمی ۔
عورت! اب تو اپنی چھاتیاں کھول دے
اور اپنے پیٹ کو ننگا کر دے تاکہ وہ تیری بھرپور جوانی پر قابض ہو جائے ۔
شرم مت کر بلکہ اُس کے شوق کا خیر مقدم کر ۔
جب وہ تیرے نزدیک آئے تو اپنے کپڑے اُتار کر ایک طرف رکھ دینا
اور اُس کے پہلو میں لیٹ جانا
اور اُسے عورت سے لذت لینے کا ہنر سکھانا
کیونکہ جس وقت اُس کی محبت تیری طرف آئے گی
تو جنگل کے جانور جن کی پرورش اُس کے ساتھ پہاڑوں میں ہوئی ہے
اُس سے دور بھاگ جائیں گے "
دیوداسی نے اپنی چھاتیاں کھول دیں
اور اپنا پیٹ ننگا کر دیا ۔
جنگلی آدمی کے شوق کو تیز کرتے وقت دیوداسی نے شرم محسوس نہ کی
بلکہ اپنے کپڑے ایک طرف اُٹھا کر رکھ دیئے
اور جنگلی آدمی کو عورت سے لذت یاب ہونے کا ہنر سکھاتی رہی
اور ان کِدّو دیوداسی کی بھرپور جوانی پر قابض ہو گیا ۔
چھ دن اور سات راتیں ان کِدّو دیوداسی کی صحبت میں رہا
اور جب وہ عورت سے آسودہ ہو گیا
تو جنگلی جانوروں کے پاس واپس گیا
مگر ان کِدّو کو دیکھ کر غزال چوکڑی بھرنے لگے

اور جنگلی جانور اُس سے دُور بھاگ گئے۔
اِن کیدُ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔
اُس نے جانوروں کا پیچھا کرنا چاہا مگر وہ دوڑ نہ سکا
کیونکہ اُس کا جسم اکڑ گیا تھا۔
اُس کے گھٹنوں میں سکت نہ رہی تھی
اور اُس کی ساری پھرتی زائل ہو گئی تھی۔
اِن کیدُ کے قدم سُست پڑنے لگے
کیونکہ اُس میں اب وہ پہلی سی چستی نہ تھی
مگر اب اُس میں دانائی آ گئی تھی اور سُوجھ بُوجھ بھی۔
پس وہ لوٹ آیا اور دیوداسی کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا
اور اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔
اور اُس نے دیوداسی کی باتیں بڑے دھیان سے سُنیں۔

دیوداسی نے اُس سے کہا:

" تُو اب دانا ہو گیا ہے اِن کیدُو!
تُو اب دیوتا کی مانند ہو گیا ہے،
پھر تُو جنگلی جانوروں کے ساتھ پہاڑوں میں کیوں رہنا چاہتا ہے؟
میرے ساتھ چل۔ میں تجھے پُشتوں سے محفوظ عروق کی راہ دکھاؤں گی،
میں تجھے اَنو اور عشتار کے مقدس معبد میں لے چلوں گی۔
وہاں گِل گامش رہتا ہے۔ وہ بڑا طاقت والا ہے۔
اور وہ اپنی رعایا پر جنگلی سانڈ کی مانند حکومت کرتا ہے۔"

اِن کیدُ کو اُس کی باتیں پسند آئیں۔
وہ ایک دوست کا خواہش مند تھا،
دوست جو اُس کے دل کی بات کو سمجھ سکے۔

" عورت! اُٹھ اور مجھے مقدس معبد میں لے چل جو اَنو اور عشتار کا مسکن ہے،
وہاں لے چل جہاں طاقت ور گِل گامش رہتا ہے۔
وہ جو اپنی رعایا پر جنگلی سانڈ کی مانند حکومت کرتا ہے۔
میں اُسے بے دھڑک للکاروں گا

اور میری آواز عروق میں گونجے گی:
یہاں سب سے طاقت ور میں ہوں۔
میں وہ ہوں جو پُرانے نظام کو بدلنے آیا ہے۔
وہ جو پہاڑوں میں پلا بڑھا،
اور جس میں بڑی قوت، بڑی توانائی ہے۔"

دیوداسی نے کہا:

"اِن کِدّو، اب اُٹھ تاکہ وہ تیری صورت دیکھ سکے۔
میں تجھے گِل گامش سے ملاؤں گی۔
میں جانتی ہوں کہ عظیم الشان عروق میں وہ کس جگہ رہتا ہے۔
پس آ ہم چلیں پشتوں سے محفوظ عروق کی سمت۔
جہاں کے باشندے جشن و طرب کے زرق برق لباس پہنے رہتے ہیں،
جہاں ہر روز تیوہار منایا جاتا ہے
جہاں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے جسم قابلِ دید ہیں۔
اُن کے بدن سے میٹھی میٹھی خوشبو نکلتی رہتی ہے،
اور شوقِ نظارہ بڑے بڑوں کو اپنی جگہ سے اُٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔
اِن کِدّو! تو جو زندگی سے پیار کرتا ہے،
میں تجھے گِل گامش سے ملاؤں گی،
وہ بڑا خوش و خرم انسان ہے۔
تو اُسے دیکھنا،
جوہرِ مردانگی سے اُس کا چہرہ ہر وقت دمکتا رہتا ہے۔
اور اُس کے جسم سے شباب کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔
وہ دن کو چین سے بیٹھتا ہے نہ رات کو،
اور وہ تجھ سے زیادہ طاقت ور ہے
اس لیے اِن کِدّو ڈینگ مارنا چھوڑ دے۔
گِل گامش شمس اور اَنو کا چہیتا ہے
اور اِن لیل اور آیا نے اُس کو دانائی عطا کی ہے۔
اور میں کہتی ہوں کہ

ابھی تو نے صحرا کا سفر بھی طے نہ کیا ہوگا
کہ گل گامش کو تیرے آنے کی خبر ہو جائے گی "

گل گامش سو کر اٹھا
تاکہ اپنا خواب اپنی ماں ننسون سے بیان کرے
جو عقلمند دیوی تھی۔
گل گامش نے ماں سے کہا :
" ماں ! میں نے رات ایک خواب دیکھا کہ
میں بہت خوش ہوں اور
نوجوان سورما میرے گرد جمع ہیں
اور میں آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ میں چل رہا ہوں،
اچانک انوکے جوہر کا ایک شہاب ثاقب آسمان سے گرا
اور میں نے اسے اٹھانا چاہا
مگر وہ اتنا بھاری تھا کہ میں اسے اٹھا نہ سکا۔
عمائدینِ عروق شوقِ دید میں اس کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے
اور عام شہری ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے
اور امرا اس کے قدم چوم رہے تھے۔
میں نے اس میں وہی دلکشی دیکھی
جو کسی عورت میں ہوتی ہے۔
لوگوں نے مجھے سہارا دیا
اور میں نے اپنے سر کو نیچا کر کے
ایک تسمے کی مدد سے اسے اٹھایا
اور تیرے پاس لے آیا۔
اور تو نے مجھ سے کہا :
یہ تیرا بھائی ہے "
تب ننسون نے جو دانائے کل ہے، کہا :
" تو نے آسمان کے جس ستارے کو دیکھا
اور فریفتہ ہوا گویا وہ عورت تھی،

وہی تو وہ طاقت ور رفیق ہے
جو ضرورت کے وقت اپنے دوست کے کام آتا ہے۔
وہ جنگلی جانوروں میں سب سے مضبوط ہے۔
وہ گیاہستان میں پیدا ہوا ہے
اور پہاڑوں نے اُس کی پرورش کی ہے۔
تو اُسے دیکھے گا تو اِس طرح خوش ہو گا
جس طرح اپنی محبوبہ کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے
اُس میں آسمانی خداؤں کی سی قوت ہے۔
اُمرا اُس کے پاؤں چومیں گے۔
تو اُس سے بغل گیر ہو گا
اور اُسے میرے پاس لائے گا۔"

گل گامش دوسرے دن سو کر اُٹھا اور ماں سے بولا :

"ماں! میں نے ایک اور خواب دیکھا ہے
عروک کی چوڑے بازار والی شاہراہ پر
ایک تیشہ پڑا ہے۔
لوگ اُس کے گرد بھیڑ لگائے کھڑے ہیں۔
اُس کی شکل انوکھی ہے۔
میں نے اُس تیشے کو دیکھا تو بہت خوش ہوا
اور میں اُس کی طرف کھنچا چلا گیا
جیسے عورت کی طرف کھنچتے ہیں۔
میں نے اُسے جھک کر اُٹھا لیا اور اپنے پہلو میں لگا لیا۔"

ننسون نے کہا :

"وہ تیشہ جو تُو نے دیکھا
اور جس نے تجھے عورت کی مانند اپنی طرف کھینچا،
یہی وہ رفیق ہے جو میں تجھے بخشتی ہوں۔
وہ تیرا دلبر ساتھی ہے جو
وقت پڑنے پر اپنے دوست کے کام آئے گا۔"

گل گامش نے اپنی ماں سے کہا :
" وہ میری قسمت ہے لہٰذا وہ میرا رفیق ہوگا "
اُدھر گل گامش ماں سے اپنا خواب بیان کر رہا تھا
اِدھر اِن کِدّو دیو داسی کے رُوبرو بیٹھا تھا۔
اور دیو داسی نے اِن کِدّو سے کہا :
" اِن کِدّو ! اب تو مجھے دیوتا نظر آنے لگا ہے
پھر جنگلی جانوروں کے ساتھ پہاڑوں میں
پھرنے کے لیے کیوں بے تاب ہے۔
زمین سے اُٹھ کہ یہ چرواہے کا بستر ہے "
اُس نے دیو داسی کی باتیں دھیان سے سُنیں۔
اور عورت کا مشورہ اُس کو پسند آیا۔
دیو داسی نے اپنا لباس اُتارا اور اُس کے دو حصّے کیے۔
ایک کپڑا اُس نے اِن کِدّو کو پہنایا
اور دوسرا خود پہنا۔
اور ماں کی طرح اُس کا ہاتھ پکڑے
گڈریوں کے ڈیرے پر آئی
جہاں بھیڑوں کا گلّہ رہتا تھا۔
گڈریے اِن کِدّو کو دیکھنے کے لیے
اُس کے گرد جمع ہو گئے۔
اُنھوں نے اُس کے سامنے روٹی رکھی
لیکن اِن کِدّو جنگلی جانوروں کا دودھ تھن سے پیا کرتا تھا۔
وہ روٹی کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا تھا
اور ہانپ رہا تھا
اور اُس کے مُنہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔
وہ حیران تھا کہ روٹی کو کیسے کھائے
اور تیز شراب کو کیسے پیئے
کیونکہ اِن کِدّو روٹی کھانا نہ جانتا تھا

اور کسی نے اُسے تیز شراب پینا بھی نہ سکھایا تھا۔

تب دیوداسی نے اپنا منہ کھولا اور اِن کِدو سے بولی:

"اِن کِدو، یہ روٹی کھالے
کیونکہ زندگی کا توشہ یہی ہے
اور تیز شراب پی لے
کیونکہ اس دیس کی ریت یہی ہے۔"

پس اِن کِدو نے روٹی کھائی
یہاں تک کہ وہ سیر ہو گیا
اور تیز شراب کے سات پیالے پئے۔
اور وہ چہکنے لگا اور اُس کا دل باغ باغ ہو گیا
اور اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔
اُس نے اپنے بدن کے بال ٹھیک کیے
اور جسم پر تیل مَلا
اور تب اِن کِدو انسان بن گیا۔
اور پوشاک پہن کر وہ دولھا معلوم ہونے لگا۔
اُس نے ہتھیار اُٹھایا اور
شیر کا شکار کرنے نکل گیا
تاکہ گڈریے رات آرام سے بسر کر سکیں۔
اُس نے بھیڑیے اور شیر مارے
اور گلہ بان آرام سے سوتے رہے۔
کیونکہ اب اِن کِدو اُن کا پاسبان تھا
وہ مردِ قوی جس کا کوئی ثانی نہ تھا۔

وہ گڈریوں کے ساتھ خوش خوش رہتا تھا
مگر ایک دن یوں ہوا کہ اُس نے نگاہ اُٹھائی
تو اُس کو دور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔
اُس نے دیوداسی سے کہا:
"عورت! اس آدمی کو میرے پاس لے آ۔

وہ اِدھر کیوں آیا ہے۔
میں اُس کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"
دیوداسی اُٹھی اور اُس نے راہ گیر کو آواز دی۔
وہ اُس کے قریب گئی اور اُس سے بولی:
"راہ گیر! تم کدھر بھاگے جا رہے ہو
اور یہ کٹھن سفر تم نے کیوں اختیار کیا ہے۔"؟
راہ گیر نے اپنا منہ کھولا
اور اِن کِدُو سے مخاطب ہوا:
گِل گامش ایوانِ شوریٰ میں زبردستی گھُس آیا ہے
حالانکہ یہ عمارت شہر والوں کی ملکیت ہے۔
وہ ڈھول کی آواز پر وہاں جمع ہوئے تھے
تاکہ شبِ عروسی کی خاطر دُلہن کا انتخاب کریں
مگر گِل گامش اُن کی تحقیر کر رہا ہے۔
اُس نے شہر کو ناپاک کر دیا ہے،
وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے۔
وہ چاہتا ہے کہ دلہن شبِ عروسی اُس کے ساتھ گذارے۔
پہلے بادشاہ، بعد میں جائز شوہر
اور یہ سب دیوتاؤں کی مرضی سے ہو رہا ہے۔
گِل گامش کو یہ حق اُسی وقت مل گیا تھا
جس وقت اُس کی نال کاٹی گئی تھی۔
لیکن اب دُلہن کو چھیننے کے لیے ڈھول بجتا ہے
تو شہر کراہتا ہے۔"
راہ گیر کی باتیں سن کر اِن کِدو کا چہرہ سفید ہو گیا۔
"میں وہاں جاؤں گا جہاں گِل گامش لوگوں پر جبر کرتا ہے،
میں اُسے للکاروں گا
اور میری آواز عروق میں گونجے گی۔
میں پُرانے نظام کو بدلنے آیا ہوں

کیونکہ میں یہاں سب سے قوی ہوں"
پس اِن کِدو آگے آگئے
اور عورت اُس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی۔
جب وہ مضبوط پشتوں والے عروق میں داخل ہوا
تو شہریوں کا ہجوم اُس کے گرد جمع ہو گیا۔
وہ چوڑے بازار والے عروق کی شاہراہ پر رُکا
تو لوگوں نے اُسے گھیر لیا اور آپس میں کہنے لگے:
"یہ تو ہو بہو گِل گامش ہے۔
یہ قد میں اُس سے چھوٹا ہے۔
مگر اس کی ہڈیاں زیادہ مضبوط ہیں۔
یہی ہے وہ جو جنگلی جانوروں کے دودھ پر پلا تھا،
بیشک یہ سب سے قوی ہے۔
اب عروق میں اسلحوں کی جھنکار برابر سنائی دے گی"
اُمراخوش تھے کہ گِل گامش کا حریفِ مقابل آ گیا ہے۔
اب یہ سُورما جس کا حسن دیوتاؤں کی مانند ہے،
گِل گامش کی ہمسری کرے گا۔
تب عروق میں بسترِ عروسی
محبت کی دیوی کے شایانِ شان سجایا گیا۔
دُلہن اپنے دُولہا کی منتظر تھی
کہ گِل گامش اُٹھا
اور ایوانِ عروسی کی جانب چلا۔
تب اِن کِدو نمودار ہوا۔
اور اُس نے شاہراہ پر کھڑے ہو کر
گِل گامش کا راستہ روک لیا۔
گِل گامش آگے بڑھا
مگر اِن کِدو پھاٹک کے سامنے کھڑا ہو گیا
اور گِل گامش کو اندر نہ داخل ہونے دیا۔

تب وہ آپس میں گُتھ گئے
اور سانڈوں کی مانند ٹکرانے لگے
انھوں نے دروازے اور چوکھٹ کو توڑ ڈالا
اور دیواریں ہل گئیں۔
گل گامش نے اپنا گھٹنا جُھکایا
اور پاؤں زمین پر جما کر جھٹکا دیا
تو اِن کِدو نیچے زمین پر گر گیا۔
تب گل گامش کا غصہ فوراً ٹھنڈا ہو گیا۔
اور اِن کِدو نے گل گامش سے کہا:
"دُنیا میں تیرا کوئی ثانی نہیں ہے۔
تُو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے
بیلوں کے باڑے کی جنگلی گائے رِن سُون کی اولاد۔
تُو سب انسانوں میں بالا و سربلند ہے۔
اِن لِل نے تجھے بادشاہی عطا کی ہے
کیونکہ تیری طاقت سبھوں کی طاقت سے فزوں تر ہے"
تب اِن کِدو اور گل گامش باہم بغل گیر ہوئے
اور اُن کی دوستی پر مُہر لگ گئی۔

دوسرا باب

حمبابا کی ہلاکت

دیوتاؤں کے دیوتا اِن لِیل نے گل گامش کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا تھا۔
پس گل گامش نے خواب دیکھا
اور اِن کِدو نے کہا:
" اِس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ
دیوتاؤں کے دیوتا نے تجھے شاہی بخش دی ہے،
تیری تقدیر میں یہی لکھا ہے

مگر حیاتِ ابدی تیری قسمت میں نہیں ہے۔
لیکن اِس سبب سے افسردہ دل نہ ہو،
نہ رنج کر، نہ پریشان ہو۔
اُس نے تجھے بست وکشاد کی قوت عطا کی ہے۔
تو انسان کا نور اور اُس کی ظلمت ہے
اُس نے تجھے لوگوں پر بے مثال اقتدار بخشا ہے،
اُس نے تجھے ایسی جنگوں میں سرخ رُو کیا ہے
جن سے کوئی گریز پا نہیں فرار نہیں کر سکتا تھا۔
اور اُن یورشوں اور یلغاروں میں فتح یاب کیا ہے
جن سے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔
مگر اس قوت کو بے جا استعمال مت کر،
اپنے محل کے ملازمین سے انصاف کر
اور شمس کے رُوبرو عدل سے پیش آ۔"
بادشاہ گل گامش کے ذہن میں مُلکِ بقا کا خیال آیا۔
اُس نے دیودار کے مُلک کے بارے میں سوچا۔
اور اپنے ملازم اِن کِدو سے کہا:
"تقدیر میں تو لکھا تھا کہ میرے نام کی مُہر لوحِ خام پر ثبت ہو
لیکن میں نے ابھی تک یہ کام سرانجام نہیں دیا ہے۔
پس میں اُس مُلک کا سفر کروں گا
جہاں دیودار کے درخت کاٹے جاتے ہیں۔
میں اپنا نام اُس مقام پر ثبت کروں گا
جہاں مشاہیر کے نام ثبت ہوتے ہیں۔
اور جس مقام پر ابھی تک کسی انسان کا گزر نہیں ہوا ہے
وہاں میں دیوتاؤں کے لیے ایک یادگار تعمیر کروں گا۔"
اِن کِدو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
اور اُس کا دل ملول ہو گیا۔
اور اُس نے ٹھنڈی سانس لی۔

تب گل گامش نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:
" میرے دوست! تم ٹھنڈی سانسیں کیوں بھرتے ہو؟"
ان کدو نے اپنا مُنہ کھولا اور کہا:
" میں ضعف محسوس کر رہا ہوں،
میرے بازوؤں کی قوت جواب دے رہی ہے
اور اندوہ کی آواز میرے حلق میں پھنس گئی ہے۔
تم نے اِس قسم کی کیوں ٹھانی ہے؟"
گل گامش نے اِن کدو کو جواب دیا:
" اس لیے کہ وہ سرزمین شر ہے۔
ہم بَن میں گھس کر اُس بلا کو ہلاک کریں گے۔
بَن میں حمبابا رہتا ہے
جو بڑا ہیبت ناک دیو ہے"
لیکن اِن کدو نے پھر ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:
" جن دنوں میں جنگلی جانوروں کے ہمراہ صحراؤں میں پھرتا تھا
تو مَیں نے اس جنگل کا سُراغ بھی لگایا تھا۔
اس کی لمبائی ہر جہار سمت پندرہ ہزار کوس ہے۔
اور اِن لیل نے حمبابا کو اُس جنگل کا پاسبان مقرر کیا ہے
اور اُسے سات گنا بھیانک آسکوں سے لیس کیا ہے۔
حمبابا ہر جاندار کے لیے عذاب ہے۔
اُس کی گرج میں مہیب طوفان کا شور ہے،
اُس کے منہ سے شعلے نکلتے ہیں،
اور اُس کے جبڑے موت کا دہانہ ہیں۔
وہ دلیاروں کی رکھوالی میں اتنا چوکنا ہے
کہ گلور اگر نوّے کوس کی دوری پر بھی
ذرا سی جنبش کرے، تو حمبابا کو خبر ہو جاتی ہے۔
بھلا اس سرزمین پر کون اپنی مرضی سے قدم رکھے گا
اور اُس کی گہرائیوں کا کون سُراغ لگائے گا؟

میں تجھے بتاؤں :
جو شخص اُس کے قریب جاتا ہے
اُس پر ناتوانی غلبہ کر لیتی ہے ۔
حمبابا سے لڑنا اپنے برابر والوں سے لڑنا نہیں ہے ۔
وہ مہا ساونت ہے ۔
گل گامش ! جنگل کا یہ پاسبان کبھی نہیں سوتا "

گل گامش نے جواب دیا :
" میرے دوست ! وہ کون انسان ہے جس کی رسائی آسمان تک ہو سکے ؟
نورانی شمس کی ابدی رفاقت تو فقط دیوتاؤں کو نصیب ہے ۔
رہے ہم انسان، سو ہمارے دن تو گنتی کے ہوتے ہیں
اور ہمارا کاروبارِ زندگی ہوا کے جھونکے کی طرح رفتنی و گذشتنی ہے ۔
پس موت سے ڈرنا فضول ہے ۔
تجھے ابھی سے خوف کیوں دامن گیر ہے ؟
میں آگے آگے چلوں گا حالانکہ میں تیرا آقا ہوں
اور تو پیچھے پیچھے چلنا اور بے خطر مجھے آواز دیتے رہنا کہ
' آگے بڑھتے جاؤ، ڈرنے کی کوئی بات نہیں ۔
اگر میں مارا گیا تو دنیا میں میرا نام امر ہو جائے گا
اور لوگ میرے بارے میں کہیں گے
' گل گامش مہیب حمبابا سے لڑتا ہوا مارا گیا '
لوگ مجھے کئی پشتوں تک یاد کریں گے "

اِن کدو نے گل گامش سے پھر کہا :
" میرے آقا ! اگر تو نے اُس دیس میں جانے کا تہیّہ کر لیا ہے
تو پہلے شمس کے پاس جا کر اُسے خبر کر دے
کہ وہ ملک اُسی کا ہے
وہ ملک جہاں دیودار کے درخت کاٹے جاتے ہیں شمس کی ملکیت ہے "

گل گامش نے ایک سفید حلوان لیا
جس پہ کوئی داغ نہ تھا ،

اور ایک بادامی حلوان لیا جس پر داغ تھے۔
اُس نے حلوانوں کو گود میں اُٹھایا
اور شمس کے حضور میں پیش کیا۔
گل گامش نے اپنا نقرئی عصا اونچا کیا
اور نورانی شمس سے عرض کی :
" شمس! میں عازمِ سفر ہوں،
میرے ہاتھ تجھ سے التجا کرتے ہیں
پس میری روح کی خیر ہو۔
مجھے عروق کے گھاٹ پر سلامتی سے واپس لا۔
میری التجا قبول کر کہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں
اور میرا شگون نیک کر"
نورانی شمس نے جواب دیا :
" تو بے شک ذی ہے،
لیکن تجھے مُلکِ بقا سے کیا سروکار"
" شمس میری سُن، میری سُن!
میری آواز تجھ تک پہنچے۔
یہاں شہر میں تو انسان دل شکستہ ہو کر مر جاتا ہے،
اس کی جان غم و اندوہ میں نکلتی ہے۔
میں نے فصیل پر سے کھڑے ہو کر
لاشوں کو دریا میں بہتے دیکھا ہے۔
میری تقدیر میں بھی یہی لکھا ہے۔
اور میں جانتا ہوں کہ میرا انجام بھی یہی ہوگا۔
کیونکہ اونچے سے اونچے آدمی کی رسائی بھی آسمان تک نہیں ہو سکتی۔
اور بڑے سے بڑا انسان بھی روئے زمین کا احاطہ نہیں کر سکتا۔
اسی لیے میں اُس مُلک میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔
میں نے ابھی تک اپنی تقدیر کے مطابق لوح پر اپنا نام ثبت نہیں کیا ہے
لہٰذا میں وہاں جاؤں گا جہاں دیودار کے درخت کاٹے جاتے ہیں۔

میں اپنا نام وہاں ثبت کروں گا جہاں مشاہیر کے نام ثبت ہیں
اور جہاں کسی انسان کا نام کندہ نہیں ہے
وہاں میں دیوتاؤں کے لیے ایک یادگار تعمیر کروں گا"
آنسو گل گامش کے رخساروں سے بہنے لگے اور اس نے کہا :
"افسوس! سرزمین حمبابا کا سفر بہت طویل ہے۔
اور اگر یہ مہم سر ہونے والی نہ تھی تو
اے شمس!
تو نے اس کو سر کرنے کی بے چین خواہش میرے اندر کیوں پیدا کی؟
اگر تو نے حفاظت نہ کی تو میں کیونکر کامیاب ہوں گا
اور اگر میں اس ملک میں مارا گیا
تو مجھے اپنے انجام پر بالکل غصہ نہ آئے گا۔
اور اگر میں کامیاب واپس ہوا تو
اے شمس، میں تجھے شاندار تحفے نذر کروں گا
اور شمس کی ستائش کروں گا۔"
شمس نے اس کے اشکوں کی قربانی قبول کر لی،
رحم دل انسان کی مانند اس نے بھی رحم کھایا۔
اس نے گل گامش کے لیے قوی نگہبان مقرر کیے،
ایک ماں کے کئی بیٹوں کو،
اور انھیں کوہسار کے غاروں میں بٹھا دیا۔
اس نے عظیم ہواؤں کو بھی رفاقت کا حکم دیا:
بادِ شمال کو، بادِ طوفاں و بادِ زمہریر کو،
بادِ تند اور بادِ سموم کو۔
یہ ہوائیں سانپوں اور اژدہوں کی مانند تھیں،
جھلس دینے والی آگ کی مانند
اور اس مارِ سیاہ کی مانند
جس کو دیکھتے ہی خوف سے دل منجمد ہو جاتے ہیں
اور یہ ہوائیں تباہ کرنے والے سیلاب اور

بجلی کی لپکتی ہوئی زبانوں کی مانند تھیں۔
اور گل گامش خوش تھا۔
وہ دھاتِ گھر میں گیا اور بولا :
میں اسلحہ سازوں کو حکم دوں گا کہ
ہمارے ہتھیار ہماری نگاہوں کے سامنے ڈھالیں۔
پس اُنھوں نے اسلحہ سازوں کو حکم دیا
اور کاری گر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔
تب وہ بَن میں گئے ،
اُنھوں نے بید کی شاخیں اور سبز جھاڑیاں کاٹیں
اور اُن کے لیے دو دو من کے تیشے ڈھالے
اور تلواریں بھی جن کے پھَل ڈیڑھ ڈیڑھ من کے تھے
اور ان کے قبضے اور دستے پندرہ پندرہ سیر کے تھے۔
اُنھوں نے گل گامش کے لیے جو تیشہ ڈھالا
اُس کا نام "سورماؤں کی طاقت" تھا۔
اور اُس کے لیے اُنشان کی کمان بنائی
اور گل گامش ہتھیاروں سے لیس ہو گیا
اور اِن کیدو بھی۔
اور اُن کے اسلحوں کا وزن پندرہ من تھا۔
تب عروق کے شہری اور مشیر چوک میں جمع ہو گئے۔
وہ سات قفلوں والے پھاٹک سے آئے۔
اور گل گامش نے بازار میں کھڑے ہو کر اُن سے خطاب کیا :
" میں، گل گامش ، اُس مخلوق کو دیکھنے جا رہا ہوں
جس کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتی ہیں
اور یہ افواہیں چار سُو پھیلی ہوئی ہیں۔
میں اُسے دیودار کے بن میں ہراؤں گا ،
اور فرزندانِ عروق کی طاقت کے جوہر دکھاؤں گا ،
اور ساری دنیا میں اس بات کا ڈنکا بجے گا۔

یں نے اس مہم کا تہیہ کر لیا ہے۔
پہاڑ پہ چڑھنے، دیودار کو کاٹنے اور
اپنے پیچھے ابدی شہرت چھوڑ جانے کا۔"
عروق کے مشیروں نے کہا:
"گل گامش: تو ابھی نوعمر ہے۔
تیری جرأت حد سے تجاوز کر رہی ہے،
شاید تو اس مہم کے انجام سے واقف نہیں ہے۔
ہم نے سنا ہے کہ حمبابا انسانوں کی طرح فانی نہیں ہے۔
اور کوئی اُس کے ہتھیاروں کی تاب نہیں لا سکتا۔
اور وہ بن ہر چہار سمت پندرہ ہزار کوس تک پھیلا ہوا ہے۔
اپنی مرضی سے کون اُس کی گہرائیوں کا سراغ لگانا چاہے گا۔
حمبابا گرجتا ہے تو اُس کی آواز میں طوفان کا شور ہوتا ہے
اور اُس کے منہ سے شعلے نکلتے ہیں
اور اُس کے جبڑے موت کا دہانہ ہیں۔
گل گامش: تو ایسی حرکت کیوں کرنا چاہتا ہے؟
حمبابا سے لڑنا اپنے ہم سر سے لڑنا نہیں ہے"
گل گامش نے مشیروں کے یہ الفاظ سنے
تو اپنے رفیق کی جانب دیکھا اور ہنسا:
"میں ان باتوں کا کیا جواب دوں؟
کیا میں کہوں کہ ہاں، مجھے حمبابا سے ڈر لگتا ہے
اور میں زندگی کے باقی دن گھر کے اندر چھپ کر بسر کروں گا؟"
تب گل گامش نے دوبارہ اپنا منہ کھولا اور کہا:
"میرے دوست! آؤ ای گل ماہ کے کر شک کی زیارت کو چلیں
اور ملکہ ننسون کے روبرو کھڑے ہوں
کہ وہ علیم و خبیر ہے۔
وہ ہمیں سفر کی بابت مفید مشورے دے گی"
اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے

ای گل ماہ کی سمت روانہ ہوئے
عظیم ملکہ ننِ سوَن کے دربار کی سمت۔
گل گامش کوشک میں داخل ہوا
اور ننِ سوَن سے مخاطب ہو کر بولا:
ننِ سوَن! کیا تو میری عرض سُنے گی؟
مجھے ایک طویل سفر پر جانا ہے، حمبابا کے دیس میں۔
مجھے ایک نا معلوم راستے پر چلنا ہوگا
اور ایک انوکھی جنگ لڑنی ہوگی۔
پس میری روانگی کے دن سے میری واپسی کے دن تک
میرے دیودار کے جنگل میں داخل ہونے سے
اور بھیانک بلا کو جس سے شمس نفرت کرتا ہے،
ہلاک کرنے تک
میرے حق میں شمس سے دعا کرتی رہنا"
ننِ سوَن اپنے کمرے میں گئی،

اُس نے موزوں لباس زیبِ تن کیا
اور اپنی چھاتیوں کو حسین بنانے کی خاطر زیوروں سے آراستہ کیا
اور سر پہ تاج رکھا۔
اور اُس کا لہنگا زمین پہ لوٹ رہا تھا
تب وہ شمس کی قرباں گاہ پہ گئی
جو محل کی چھت پر تھی۔
اُس نے لوبان جلایا،
اور جب دھواں بلند ہوا
تو اُس نے اپنے ہاتھ شمس کی جانب اُٹھائے:
"شمس! تو نے میرے بیٹے گل گامش کو بے چین دل کیوں دیا؟
ہاں کیوں دیا؟
اس خواہش کا پیدا کرنے والا تو ہی ہے۔
اور اب وہ سرزمینِ حمبابا کے طویل سفر پہ آمادہ ہے۔

وہ ایک نامعلوم راستے پر اور ایک انوکھی جنگ لڑنے جا رہا ہے
لہٰذا اُس کے یومِ سفر سے یومِ مراجعت تک،
دیودار کے جنگل میں پہنچنے سے حمبابا کو ہلاک کرنے تک،
اُس بلا کو ہلاک کرنے تک جس سے تو نفرت کرتا ہے،
گِل گامش کو فراموش نہ کرنا۔
اپنی چہیتی دُلہن آیا کو حکم دے
کہ وہ تجھے مسلسل یاد دلاتی رہے
اور جب دن تمام ہو جائے
تو گِل گامش کو محافظِ شب کے سپرد کر
کہ وہ اُسے ہر خطرے سے بچائے رکھے۔"
تب گِل گامش کی ماں نِن سُون نے لوبان بجھا دیا
اور اِن کِدُو کو پکارا:
"قوی ہیکل اِن کِدُو، تو میری کوکھ سے نہیں پیدا ہُوا ہے
مگر میں تجھے اپنا منہ بولا بیٹا بناتی ہوں،
اُن بن ماں باپ کے بچوں کی مانند جن کو معبد میں لاتے ہیں،
گِل گامش کی خدمت کرنا جس طرح یتیم بچے یا پجارن
معبد کی خدمت کرتے ہیں
میں یہ اعلان پجارنوں، پرستاروں اور پروہتوں کے رُوبرو کرتی ہوں۔"
تب اُس نے اِن کِدُو کی گردن میں تعویذِ حلف ڈالا
اور اُس سے کہا:
"میں اپنے بیٹے کو تیری حفاظت میں دیتی ہوں،
اُسے سلامتی سے میرے پاس لانا۔"
اور وہ اُن کے اسلحے لے آئے
اور تلواریں طلائی غلافوں میں اُن کے حوالے کیں
اور کمان اور ترکش بھی۔
گِل گامش نے تیشے کو ہاتھ میں لیا،
ترکش اور انشان کی کمان کو کاندھے پر لٹکایا

اور تلوار کو کمر بند سے باندھا۔
اور تب وہ مسلح ہو کر سفر کے لیے تیار ہو گئے۔
اور شہری جوق در جوق اُن کے پاس آئے
اور پوچھنے لگے کہ "تم کب واپس آؤ گے؟"
مشیروں نے گل گامش کو برکت دی اور تنبیہہ کی کہ
"اپنی قوت پر حد سے زیادہ اعتماد نہ کرنا،
ہوشیار رہنا اور ابتدا میں وار سنبھل سنبھل کر کرنا۔
آگے والے کا فرض اپنے ساتھی کی حفاظت کرنا ہے
اور واقف راہ ہی رفیق کا محافظ ہو سکتا ہے،
لہٰذا اِن کِدّو آگے آگے چلے۔
وہ جنگل کی راہ سے آگاہ ہے۔
اُس نے حمبابا کو دیکھا ہے
اور جنگوں کا تجربہ رکھتا ہے۔
دَرّوں میں پہلے وہی داخل ہو،
وہ چوکنا رہے۔
اِن کِدّو کو چاہیئے کہ اپنے دوست کی نگہبانی کرے
اور اُسے راستے کے پوشیدہ خطروں سے بچائے۔
اِن کِدّو! ہم مشیرانِ عروق
اپنے بادشاہ کو تیری حفاظت میں دیتے ہیں
اُسے سلامتی سے ہمارے پاس واپس لانا!"
پھر وہ گل گامش سے مخاطب ہوئے،
"شمس تیرے دل کی آرزو پوری کرے،
تیری آنکھوں کو اُس مقصد کی تکمیل سے روشن کرے
جس کا ذکر تیرے لبوں نے کیا ہے۔
وہ مسدود راستوں کو تجھ پر کشادہ کرے
اور تیرے قدموں کے لیے راہ ہموار کرے۔
پہاڑوں کو تیرے لیے کھول دے،

رات تیرے لیے اپنی تمام نعمتیں لے کر آئے
اور لوگل باندا، تیرا محافظ دیوتا، فتح کی خاطر تیرے پہلو میں کھڑا ہے۔
جنگ میں تو یوں لڑے گویا کسی بچے سے لڑا،
اپنے پاؤں دریائے ہمبابا میں دھونا،
شام کے وقت ایک کنواں کھود لینا
اور اپنی مشک کو ہمیشہ صاف پانی سے پُر رکھنا،
شمس کو آبِ سرد کی نذر دینا
اور لوگل باندا کو نہ بھولنا۔"
تب اِن کیدو نے اپنا منہ کھولا اور کہا:
"آگے بڑھو! ڈرنے کی کوئی بات نہیں،
میرے پیچھے پیچھے آؤ کیونکہ میں ہمبابا کے مسکن سے واقف ہوں
اور اُس کی سبزگاہ کے راستوں کو جانتا ہوں۔
اب مشیر واپس جائیں۔
کیونکہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"
مشیروں نے یہ سُنا تو اُنھوں نے گل گامش کو رخصت کیا:
"جا، گل گامش، تیرا محافظ دیوتا راہ میں ترا نگراں ہو
اور تجھے عروق کی شہر پناہ تک بخیریت واپس لائے۔"
بیس کوس کا سفر طے کر کے اُنھوں نے اپنا فاقہ توڑا
اور مزید پینتالیس کوس کے بعد اُنھوں نے شب گزاری کے لیے منزل کی۔
ایک دن میں وہ پچھتر کوس چلے گئے۔
اس طرح اُنھوں نے تین دن میں ایک ماہ اور دو ہفتوں کا سفر طے کیا۔
وہ سات پہاڑوں کو عبور کر کے جنگل کے پھاٹک تک پہنچے
اور پھاٹک کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔
ابھی اُن کو سر بفلک دیوار نظر نہ آیا تھا
مگر پھاٹک کی لکڑی کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔
اُس کی اُونچائی ۳۶ گز تھی
اور چوڑائی بارہ گز۔

اُس کی چُول، اچھلے اور بازو سب درست تھے
ہنرمندوں نے اُسے نی پر میں تیار کیا تھا،
اِن لِیل کے مقدّس شہر میں۔
تب اِن کِدّو نے آواز دی:
گِل گامش! تو عروق میں جو ٹھینگیں مارتا تھا اُنھیں یاد کر،
آگے بڑھ اور حملہ کر،
عروق کے فرزند، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"
گِل گامش نے یہ الفاظ سُنے تو اُس کی جرأت عود کر آئی۔
اُس نے جواب دیا:
"جلدی کر! گھیر لے،
اگر پہرہ دار ہو تو اُسے جنگل میں بھاگنے نہ دینا
ورنہ وہ غائب ہو جائے گا۔
اُس نے اپنی پہلی بکتر پہن لی ہے
مگر ابھی چھ اور باقی ہیں۔
اُسے مسلّح ہونے سے پہلے پکڑ لینا چاہیئے۔"
جنگل کا پاسبان بپھرے ہوئے سانڈ کی مانند پھنکارنے لگا۔
اور بڑے خوفناک انداز میں مُڑا۔
وہ ڈکارا۔
اور طاقت ور سانڈ کی مانند جنگل میں گھس گیا۔
وہ اپنے دلدار کے گھر میں چلا گیا۔
تب اِن کِدّو پھاٹک کے نزدیک گیا
پھاٹک اتنا خوبصورت تھا کہ
اِن کِدّو کے دل نے اُس پر تیشہ چلانا گوارا نہ کیا۔
اُس نے پھاٹک کو دھکا مار کر کھول دیا۔
تب اِن کِدّو نے گِل گامش کو آواز دی:
"جنگل میں قدم نہ رکھنا
کیونکہ میں نے پھاٹک کھولا تو میرے ہاتھ اپنی طاقت کھو بیٹھے۔"

گل گامش نے جواب دیا :
"عزیز دوست ! بزدلوں کی سی باتیں مت کر۔
کیا ہم نے یہ خطرے اسی لیے مول لیے تھے
اور اتنی مسافت اسی لیے طے کی تھی کہ
آخر میں پیٹھ دکھا کر لوٹ جائیں۔
تو، جو جنگ آزمودہ ہے، میرے ساتھ چل
تو تجھے موت کا خوف نہ ستائے گا،
میرے پاس رہ تو تجھے ضعف نہ محسوس ہوگا
اور رعشہ تیرے ہاتھوں کو چھوڑ دے گا،
یا میرا دوست یہیں ٹھہر جانا پسند کرے گا ؟
نہیں، ہم دونوں جنگل کے دل میں اتریں گے۔
آنے والی جنگ تیری جرأت کو بیدار کرے۔
موت کو بھول جا اور میرے پیچھے پیچھے آ۔
میں دھن کا پکا ضرور ہوں
مگر اُجڈ اور احمق نہیں ہوں۔
دو آدمی ساتھ چلیں تو ہر ایک اپنا بچاؤ بھی کرتا ہے
اور دوست کی سپر بھی بنتا ہے۔
اور اگر وہ جنگ میں کام آئیں
تو اُن کا نام باقی رہ جاتا ہے۔"
دونوں پھاٹک میں داخل ہوئے
اور کوہ سبز تک پہنچے۔
اس منظر نے اُنھیں حیرت میں ڈال دیا
اُن کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی،
وہ چپ چاپ کھڑے جنگل کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے
اُنھوں نے دیودار کی بلندی دیکھی
اُنھوں نے جنگل کا راستہ دیکھا
اور وہ پگڈنڈی بھی جس پر ہمبابا چلتا تھا۔

راستہ چوڑا اور ہموار،
انھوں نے دیودار کے پہاڑ کو غور سے دیکھا
اور دیوتاؤں کی آرام گاہ اور عشتار کے تخت کو۔
دیودار کی بلندی نے پہاڑ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا،
اُس کا سایہ آرام دہ تھا
اور پہاڑ اور میدان جھاڑیوں سے ڈھکے تھے۔
گل گامش نے وہاں غروبِ آفتاب سے پیشتر ایک کنواں کھودا۔
وہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور زمین کو لذیذ غذا کی نذر پیش کی
اور کہا :
" پہاڑ! دیوتاؤں کے مسکن!
مجھے کوئی خواب دکھا جس کا شگون نیک ہو۔"
تب وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر لیٹے اور سو گئے۔
اور نیند نے جو رات کے منہ سے نکلتی ہے، اُن پر سایہ کر لیا۔
گل گامش نے خواب دیکھا
اور نیند آدھی رات کے وقت اُس کے پاس سے چلی گئی،
اور اُس نے اپنا خواب اپنے دوست سے بیان کیا :
" اِن کدو! وہ کیا چیز تھی جس نے مجھ کو جگا دیا
حالانکہ تجھے نہیں جگایا ؟
میرے دوست! میں نے ایک خواب دیکھا ہے :
ہم پہاڑ کی ایک گہری گھاٹی میں کھڑے تھے
کہ اچانک پہاڑ گر پڑا
اور اُس کے سامنے ہم دونوں دلدل کی ننھی مکھی کی مانند تھے۔
میرے دوسرے خواب میں بھی پہاڑ گرا
اور اُس نے مجھے زخمی کیا اور میرے پاؤں نیچے سے پکڑ لیے،
تب آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی ایک روشنی نمودار ہوئی
اور اُس کی چمک دمک حسنِ عالم سے بھی بڑھ کر تھی۔
اُس نے مجھے پہاڑ تلے سے نکالا

اور پینے کے لیے پانی دیا اور میری ڈھارس بندھائی
اور مجھے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کیا "
تب اِن کِدُو، ابنِ صحرا نے کہا :
چلو، اس پہاڑ سے اُتریں
اور اِس خواب کی تعبیر پر غور کریں "
اُس نے نوجوان دیوتا گل گامش سے کہا :
" تمھارا خواب نیک ہے، تمھارا خواب اچھا ہے۔
پہاڑ جو تم نے دیکھا وہ حمبابا ہے،
بیشک اب ہم اُسے پکڑ کر ہلاک کریں گے
اور جس طرح پہاڑ زمین پر گرا،
ہم بھی اسے زمین پر گرائیں گے۔"
دوسرے دن اُنھوں نے تیس کوس کی مسافت طے کی
اور اپنا فاقہ توڑا
اور مزید پچاس کوس کے بعد منزل کی
اُنھوں نے غروبِ آفتاب سے پیشتر ایک کنواں کھودا
اور گل گامش پہاڑ پر چڑھا
اور اُس نے لذیذ غذا زمین کو نذر پیش کی اور کہا :
" پہاڑ! دیوتاؤں کے مسکن، اِن کِدُو کے لیے خواب بھیج،
جس کا شگون نیک ہو "
پہاڑ نے اِن کِدُو کے لیے خواب بھیجا
مگر اس خواب کا شگون بُرا تھا۔
اِن کِدُو کو کپکپی لگ گئی
جیسے کسی نے اُسے ٹھنڈے پانی میں غوطہ دیا ہو۔
جیسے پہاڑی جَو کے پودے بارش کے طوفان میں لرزتے ہوں،
لیکن گل گامش اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھا رہا
یہاں تک کہ نیند نے، جو سب پر غالب آتی ہے،
اُس پر سایہ کر لیا۔

نصف شب گذری تھی کہ نیند گل گامش سے مفارقت کر گئی۔
وہ اُٹھ بیٹھا اور اپنے دوست سے کہنے لگا:
"کیا تم نے مجھے پکارا تھا؟ ورنہ میں کیوں جاگ پڑا
کیا تم نے مجھے چھوا تھا؟ ورنہ میں کیوں خوف زدہ ہوں؟
کیا کوئی دیوتا اِدھر سے گذرا ہے
کیونکہ میرے اعضا وحشت سے مفلوج ہو گئے ہیں؟
میرے دوست میں نے تیسرا خواب دیکھا
مگر یہ خواب بڑا ڈراؤنا تھا:
آسمان گرج رہا تھا اور زمین ہونک رہی تھی،
سورج کی روشنی ماند پڑ گئی تھی،
اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی
اور بجلی چمک رہی تھی
اور آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے
اور بادل نیچے آ گئے تھے
اور اُن سے موت کی بارش ہو رہی تھی۔
تب روشنی رخصت ہو گئی،
آگ بجھ گئی
اور ہمارے چاروں طرف راکھ کا ڈھیر لگ گیا۔
آؤ پہاڑ سے نیچے اُتریں
اور اس خواب پر غور کریں
اور یہ بھی سوچیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے"
جب وہ پہاڑ سے نیچے اُترے
تو گل گامش نے اپنا تیشہ سنبھالا
اور دیودار کو کاٹ گرایا۔
حمبابا نے دیودار کے گرنے کی آواز سنی
تو وہ غضب ناک ہو کر چیخا:
"کون ہے جس نے میرا جنگل پامال کیا

اور میرے دیودار کو کاٹ "
لیکن شمسِ تاباں نے انھیں آسمان سے آواز دی :
" آگے بڑھو! ڈرو مت "
مگر اب گِل گامش پر ضعف طاری تھا
کیونکہ نیند نے اس پر غلبہ کر لیا تھا
اور یہ بڑی گہری نیند تھی۔
وہ زمین پر بے سُدھ پڑا تھا گویا خواب دیکھ رہا ہو۔
اِن کِدُو نے اُسے چھوا مگر وہ نہ جاگا۔
اِن کِدُو نے اُسے پکارا مگر اُس نے جواب نہ دیا :
" گِل گامش ! ارضِ کُلآب کے آقا !
دُنیا اندھیری ہوتی جا رہی ہے۔
سایہ پھیلتا جا رہا ہے ،
اور شام کا دُھندلکا جھلملا رہا ہے۔
شمس رخصت ہو چکا ہے۔
اُس کا روشن سر اُس کی ماں ننگل کے پیٹ میں چھپ گیا ہے۔
گِل گامش تو کتنی دیر تک یوں ہی پڑا سوتا رہے گا ؟
اُس ماں کو جس نے تجھے جنا ہے ،
شہر کے چوک میں بین کرنے پر مجبور نہ کر "
آخر گِل گامش نے اُس کی آواز سُنی۔
اُس نے اپنا سینہ بند " سورماؤں کی آواز " پہنا
جس کا وزن تیس شیکل تھا۔
مگر اُس نے اِس وزنی سینہ بند کو یوں اُٹھا کر پہن لیا
گویا وہ بھی کوئی ہلکی پھلکی پوشاک تھی۔
اور سینہ بند نے اُس کو بالکل ڈھانک لیا۔
وہ زمین پر ٹانگیں پھیلا کر اِس طرح کھڑا ہو گیا
جیسے پھنکارنے والا سانڈ ،
اور اُس نے اپنے دانت بھینچ لیے :

" اپنی ماں نِن سَسون کی جان کی قسم
اور اپنے باپ، مقدس لوگل باندا کی جان کی قسم،
مَیں اپنی ماں کے لیے،
جو مجھے اپنی گود میں بٹھا کر دودھ پلاتی تھی،
باعثِ فخر بنوں گا "
اُس نے دوبارہ اِن کِیدو سے کہا:
" اپنی ماں نِن سون کی جان کی قسم،
جس نے مجھے پیدا کیا
اور اپنے مقدس باپ لوگل باندا کی جان کی قسم،
جب تک ہم اِس انسان سے، اگر وہ انسان ہے،
لڑ نہ لیں،
جب تک اِس دیوتا سے، اگر وہ دیوتا ہے،
لڑ نہ لیں،
ملکِ بقا کے سفر سے شہر کو واپس نہ جائیں گے "
تب اِن کِیدو، رفیقِ باوفا، ملتجی ہو کر بولا:
" اے میرے آقا! تو اس دیو کو نہیں جانتا
جبھی تو اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔
میں جو اُس سے واقف ہوں، سخت دہشت زدہ ہوں۔
اُس کے دانت اژدہے کی کھیسیں ہیں،
اُس کا چہرہ شیر کا سا ہے،
اُس کا دھاوا سیلاب کا بہاؤ ہے،
اُس کی ایک نگاہ، جنگل کے درخت، اور دلدل کے جھاڑ،
سبھی کو جھلس دیتی ہے۔
میرے آقا! تو چاہے تو اُس کے دیس کی طرف بڑھ سکتا ہے
لیکن میں شہر کو واپس جاؤں گا
میں تیری ماں سے تیرے سارے شاندار کارنامے بیان کروں گا
یہاں تک کہ وہ خوشی سے چیخنے لگے گی۔

اور تب میں تیری موت کا حال اُسے بتاؤں گا
یہاں تک کہ وہ درد سے رونے لگے گی "
لیکن گل گامش نے کہا :
" قربانی اور چڑھاوا ابھی میرا مقسوم نہیں ہے
مردے کی کشتی ابھی ظلمات کا سفر نہیں کرے گی
اور نہ ابھی تین تہ کا کپڑا میرے کفن کے لیے تراشا جائے گا
ابھی میری رعایا کے بے نوا ہونے کا وقت نہیں آیا ۔
ابھی میرے گھر میں چتا کی آگ نہیں جلے گی
اور نہ میری لاش کو نذرِ آتش کیا جائے گا ۔
آج اگر تُو میری اعانت کرے
اور میں تیری اعانت کروں
تو پھر ہمیں کون ضرر پہنچا سکے گا ؟
گوشت سے پیدا ہونے والی تمام زندہ مخلوق کو
ایک نہ ایک دن مغرب کی کشتی میں بیٹھنا ہی پڑتا ہے
اور جب یہ کشتی مگی کوم کی کشتی ، ڈوبتی ہے
تو انھیں سدھارنا ہی پڑتا ہے ۔
لیکن ہم آگے بڑھیں گے
اور اِس راکشش کو اپنا نشانہ بنائیں گے ۔
اگر تیرے دل میں خوف ہے تو خوف کو نکال پھینک ،
اگر دہشت ہے تو دہشت کو دُور کر دے ۔
اپنا تیشہ سنبھال اور یورش کر ۔
وہ جو جنگ کو ناتمام چھوڑ دیتا ہے کبھی سکون نہیں پاتا ! "
حمبابا دیودار کے مضبوط مکان سے باہر نکلا
اُس نے اپنے سر کو جنبش دی
اور گل گامش کو ڈرانا چاہا
اور اُس نے اپنی نگاہیں
موت کی نگاہیں ،